اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہِ پنجاب، لاہور

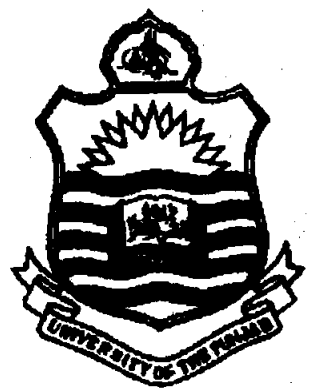

جلد نمبر ۱۷

(ک..... الان)

ادارۂ تحریر

مزسید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب)	.....	رئیس ادارہ
پروفیسر سید محمد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)	.....	سینئیر ایڈیٹر
پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب)	.....	سینئیر ایڈیٹر
پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ایم اے (پنجاب)	.....	ایڈیٹر
شیخ نذیر حسین، ایم اے (پنجاب)	.....	ایڈیٹر
ڈاکٹر عبدالغنی، ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب)	.....	ایڈیٹر

مجلس انتظامیہ

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا، ایم ایس سی (علیگ)، پی ایچ ڈی (براؤن، یو ایس اے)، وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)

۲۔ ڈاکٹر رفیق احمد، ایم اے (پنجاب)، بی اے (مانچسٹر)، ڈی فل (اوکسفرڈ)، پرو وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب لاہور

۳۔ جسٹس ڈاکٹر ایس، اے رحمٰن، حلال پاکستان، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ، پاکستان، لاہو

۴۔ جسٹس مولوی مشتاق حسین، لاہور ہائی کورٹ، لاہور

۵۔ سید بابر علی شاہ، ۷۰۔ الف سی گلبرگ، لاہور

۶۔ معتمد مالیات، حکومتِ پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۷۔ معتمد تعلیم، حکومتِ پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۸۔ پروفیسر شیخ شیخ امتیاز علی، ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)، ایل ایل ایم (پنجاب)، ایل ایل ایم (سنفرڈ)، پرنسپل یونیورسٹی لاء کالج و ڈین کلیۂ قانون، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۹۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ (پنجاب)، ڈین کلیۂ علوم اسلامیہ و شرقیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۰۔ ڈاکٹر محمد نذیر رومانی، ایم ایس سی (پنجاب)، پی ایچ ڈی (لنڈن)، ڈین کلیۂ سائنس، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۱۔ رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۲۔ خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۳۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایمریطس، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور (رکن و معتمد)

بار دوم: ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

زیر نگرانی: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

صدر شعبہ / ڈائرکٹر معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اوران کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ=اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت=اسلام انسائیکلوپیڈیا (=انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع=دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (=انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ۱ یا ۲=Encyclopaedia of Islam (=انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، باراوّل یا دوم، لائیڈن.

ابن الابّار= کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F.Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابّار= تکملہ=M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: *Apendice a la adicion Codera de Tecmila Misc* در *de estudios y textos arabes*، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابّار، جلد اوّل= ابن الابار= تکملۃ الصلہ، *Texte arabe d' apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera* طبع A. Bel، و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ۱ یا ۲ یا ۳ یا ۴= کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فاینان= *Annales du Maghreb et de l' Espagne*، ترجمہ فاینان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال= کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. (Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).

ابن بطوطہ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از *C.Defremery و B.R.sanguinetti*، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی= النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، طبع W. Popper، برکلے ولائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ= وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ببعد.

ابن حوقل، کریمرز۔ وائٹ= ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل= کتاب صورۃ الارض، طبع J.H.Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (*BGA*,II، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ= المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje) لائیڈن ۱۸۸۹ء (*BGA*, VI).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر ..... بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ= *Prolegomenes d'Ebn Khaldoun* طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (*et Notices Extraits,XVI-XVII*).

ابن خلدون: روزنتھال= *The Muqaddimah*، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان= *Les Prolegomensesd' Ibn Khaldun*، ترجمہ وحواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم) ۱۹۳۴ء

ابن خلکان= وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وسٹنفلڈ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں).

ابن خلکان= وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان= کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol

دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء.

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII).

ابن رستہ، ویت Wiet: Les Atours precieux، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء.

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) ولیوی پروونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء.

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ھ (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیئے گئے ہیں).

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA. v).

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء.

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء.

ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء.

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء.

الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء.

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸/۱۳۱۹ھ.

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء (انا ستاتیک).

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء.

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA.I) و باردوم (نقل باراول) ۱۹۲۷ء.

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصفہانی: الاغانی، باراول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا باردوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بارسوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ و بعد.

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء.

الانباری: نزہۃ = نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ.

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء.

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger، S D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء.

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش.

بیہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl.Indica.

ت ۱۱ = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس.

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء.

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء/۱۹۱۱ تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء.

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء.

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدھر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) ومحمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ.

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS, XI، سلسلہ جدید).

حمداللہ مستوفی: نزہۃ = حمداللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواندامیر: حبیب السیر تہران ۱۲۷۱ھ و بمبئی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء.

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ.

الدمیری = الدمیری: حیوۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن وحسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء.

زبیری، نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء.

الزرکلی، اعلام = خیرالدین الزرکلی: الاعلام تاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۵ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء.

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ.

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء.

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX).

السمعانی، طبع حیدرآباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبدالمعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدرآباد، ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۶۲ء-۱۹۸۲ء.

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء.

الضبی، الضبی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ریبیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ.

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء.

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ.

العقد الفرید = ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ.

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ وجغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء.

عیون الانباء = طبع مُلر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء.

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء.

غوثی ماندوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، ممبئی ۱۸۳۲ء.

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ ش.

فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء.

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء.

فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton و Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء.

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء.

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء.

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء.

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ.

م آ آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ.

مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl Indica.

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش.

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ.

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، ۱ جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ ش.

المسعودی: مروج: مروج الذہب، طبع باربیہ مینارد (C.Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء.

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۴ء (*BGA*، VIII).

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۷ء (*BGA*، VIII).

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء.

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء.

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.

میرخواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء.

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء بعد.

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروونسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء.

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء.

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H.Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء.

یاقوت طبع وسٹنفلٹ: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع انا ستاتیک، ۱۹۲۴).

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS*، VI): معجم الادباء، (طبع انا ستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (M. Th. W. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء: تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء.

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA*، VII).

یعقوبی، ویت = Wiet، *Yaqubi, Les pays*، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء.

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*. Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Noldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergst rrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=1.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^2=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

1835-43.

Hammer-Purgstall: *Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*, 2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding*= *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*. Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal: Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*, Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects. and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer: Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*, Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed. Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart:*Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djambatân Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope,Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner:*Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrsiage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen, Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen:*Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott=*Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.*

Abh. K.M.=*Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. AK. W.= Abhandiungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.=Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient, di Napoli.

AM=Archives Marocaines.

And=Al-Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO=Acta Orientalia.

Arab.=Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv fur Religionswissenschaft.

ASI=Archaelogical Survey of India.

ASI. NIS=the same, New Imperial Series.

ASI. AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEt. Or. = Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l' Instutut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l' Institut Francais J' Arachcologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ed.

BSE^2=the Same, 2nd ed.

BSL(P)=Bulletin de la Societe de Linguisttq (de Paris).

BSO(A)S=Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l' Orient Contemporain.

CT=Cahiers deTunisie.

EI^1=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.

EI^2=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Gottinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geogra phical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp.=Hesperis.

IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.

IC=Islamic Culture.

IFD=Ilahiyat Fakultesi.

IG=Indische Gids.

IHQ=Indian Historical Quarterly.

IQ=The Islamic Quarterly.

IRM=International Review of Missions.

Isl.=Der Islam.

JA=Journal Asiatique.

JAfr. S.=Journal of the African Society.

JAOS=Journal of the American Oriental Society.

JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.

JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.

JE.=Jewish Encyclopaedia.

JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.

JNES=Journal of Near Eastern Studies.

JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.

JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.

JQR=Jewish Quarterly Review.

JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.

J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.

J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.

JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.

JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.

JSS=Journal of Semetic studies.

KCA=Korosi Csoma Archivum.

KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).

KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).

Mash.=Al-Mashrik.

MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesells chaft.

MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.

MEA=Middle Eastern Affairs.

MEJ=Middle East Journal.

MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.

MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.

MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.

MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.

MI=Mir Islama.

MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.

MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.

MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.

MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.

MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.

MO=Le Monde oriental.

MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.

MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.

MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.

MSOS As.= fitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Westasiatische Studien.

MTM=Mili Taebbuler medjmuast.

MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch -agyptischen Gesellschaft.

MW=The Muslim World.

NC=Numismatic Chronicle.

NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.

OA=Orientalisches Archiv.

OC=Oriens Christianus.

OCM=Oriental College Magazine, Lahore.

OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore

OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.

OM=Oriente Moderno.

Or.=Oriens.

PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.

PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.

Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.

PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.

QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.

RAfr.=Revue Africaine.

RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.

REI=Revue des Etudes Islamiques.

REJ=Revue des Etudes Juives.

Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.

RHR=Revue de l' Histoire des Religions.

RI=Revue Indigene.

RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.

RMM=Revue du Monde Musulman.

RO=Rocznik Orientalistyczny.

ROC=Revue de l' Orient Chretien.

ROL=Revue de l' Orient Latin.

RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histoira, Madrid.

RSO=Rivista degli Studi Orientali.

RT=Revue Tunistenne.

SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.

SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.

SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.

SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.

SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.

SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).

SI=Studai Islamica.

SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= Studia Islamica.

S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).

SYB=The Statesman's Year Book.

TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.

TD=Tarih Dergisi.

TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).

TM=Turkiyat Mecmuasi

TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu ast.

TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.

Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI.NS=the same, New Series.

Wiss. Veroff. DOG = Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeltschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG = Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※ مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[] اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

f.,ff.,sq.,sqq.	=	بعد
s. v.	=	بذیل مادّہ (یا کلمہ)
see; s.	=	دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے
q.v.	=	رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک بآں (رجوع کنید بآں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے
passim.	=	بمواضع کثیرہ
op.cit.	=	کتاب مذکور
cf.	=	دیکھیے لغوی مفہوم (قارب یا قابل)
B.C.	=	ق۔م (قبل مسیح)
d.	=	م (متوفی)
loc. cit.	=	محل مذکور
ibid.	=	کتاب مذکور
idem.	=	وہی مصنف
A.H.	=	ھ (سنہ ہجری)
A.D.	=	ء (سنہ عیسوی)

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (ـَ) = a

کسرہ (ـِ) = i

ضمہ (ـُ) = u

(ب)

Long Vowels

ا، آ = ā (آج کل: ājkal)

ی = ī (سیم: Sim)

و = u (ہارون الرشید: Harūn al-Rashīd)

اے = ai (سیر: Sair)

(ج)

ـٕ = e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)

ـٗ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)

ـ٘ = u کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (توریہ: Turkiya)

ـٙ = o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کورل: kol)

ـٚ = ä کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اُرْجُب: ärädjäb؛ رَجَب: rädjäb)

ـْ = علامت سکون یا جزم (بِسْمِل: bismil)

متبادل اردو عربی حروف

ب = b	ح = ḥ	س = s	گ = g
بھ = bh	خ = Kh	ش = sh، ch	گھ = gh
پ = p	د = d	ص = ṣ	ل = l
پھ = ph	دھ = dh	ض = ḍ	لھ = lh
ت = t	ڈ = ḏ	ط = ṭ	م = m
تھ = th	ڈھ = ḏh	ظ = ẓ	مھ = mh
ٹ = ṭ	ڈھ = ḍh	ع = ʿ	ن = n
ٹھ = ṭh	ر = r	غ = gh	نھ = nh
ث = th	رھ = rh	ف = f	و = w
ج = dj	ڑ = ṛ	ق = ḳ	ہ = h
جھ = djh	ڑھ = ṛh	ک = k	ء = ʾ
چ = č	ز = z	کھ = kh	ی = y
چھ = ch	ژ = ž, zh		

ک

* **ک :** (کاف)؛ مروجہ عربی حروف تہجی کا بائیسواں، فارسی کا پچیسواں اور اردو کا اڑتیسواں حرف (ابجد کے لحاظ سے اس کے عدد ۲۰ ہوتے ہیں : دیکھیے مقالۂ ابجد) ۔ ک کا تلفظ ایک ایسے جنگی زوردار (explosive) حرف کی مانند ہے جس کی حلقی آواز نہیں ہوتی ۔ سیبَوَیْہ کے زمانے سے اب تک یہ علمی حلقوں کی بول چال میں اسی طرح پایا جاتا ہے ۔ آج کل کی مروجہ زبان میں ہمیں اس کی بعض مختلف شکلیں ملتی ہیں (علاوہ ک کے) بالخصوص رگڑدار (affricate) (چ č) (جس سے c′ اور پھر اس سے k′ بنا ہے) دیکھیے مقالۂ عرب، عربی بولیاں اور Schaade: *Sibawaih's Lautlehre* اشاریہ .

(A. SCHAADE)

* **کابُل :** (۱) افغانستان کے ایک دریا کا نام؛ (۲) افغانستان کا دارالسلطنت، دریاے کابل ۳۴°-۲۱′ عرض بلد شمالی اور ۶۸°-۲۰′ طول بلد مشرقی پردرہ آنئی کے قریب سے نکل کر شہر کابل میں سے گزرتا ہے ۔ تھوڑی ہی دور جنوب کی طرف سے اس میں دریاے لوگر اور شمال کی طرف سے دریاے پنج شیر آ ملتے ہیں ۔ یہ دریا سطح مرتفع کابل سے نکل کر پہاڑی درروں میں سے بہتا ہوا جلال آباد کی زیریں وادی میں داخل ہوتا ہے جہاں اس میں جنوب کی طرف سے دریاے سرخاب اور شمال کی طرف سے دریاے کُنر شامل ہو جاتے ہیں ۔ اس کے بعد یہ مُہمند کی پہاڑیوں میں ایک گھاٹی سے گزرتا ہوا مِچْنی کے قریب پاکستان کے ضلع پشاور میں داخل ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں ۔ شمالی شاخ میں دریاے سوات آ ملتا ہے اور آگے چل کر یہ دونوں شاخیں پھر آپس میں مل جاتی ہیں ۔ دریاے کابل ۳۱۶ میل لمبے علاقے میں سے بہتا ہوا اٹک کے قریب دریاے سندھ میں جا گرتا ہے .

دریاے کابل بہت قدیم زمانے سے بہتا آ رہا ہے ۔ کبھی اسے کُبھا ندی کہا جاتا تھا ۔ قدیمی مؤرخین Arrian اور Strabo نے اسے "کوپھین" Kōphen اور "کوپھیس" Kōphes اور بطلمیوس نے "کوآ" Kōa لکھا ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کُبھا ان سات دریاؤں میں سے ایک تھا جن کا رگ وید میں ذکر آیا ہے ۔ عرب جغرافیہ دانوں نے اس دریا کے مختلف نام بتائے ہیں ۔ البیرونی نے دریاے غوروند کا ذکر کیا ہے جو قندھار (یعنی گندھارا) کے دارالحکومت وَیْہِنْد سے نیچے بہتا ہوا دریاے سندھ میں جا گرتا ہے ۔ یہ نام اسے "درۂ غور بند" کی نسبت سے دیا گیا ہے جس کے قریب سے دریاے "پنج شیر" نکلتا ہے ۔ المسعودی لکھتا ہے کہ "پنجاب کا چوتھا دریا شہر کابل اور اس کے پہاڑوں سے آتا ہے، جو "السند کی سرحد کا کام دیتے ہیں ۔" پشتو میں اس دریا کا جدید نام "سِیند" ہے (جو "دریا" کے لیے عام اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے) ۔ بابر نے دریاے سند کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک پہاڑ سے نکلتا ہے جو کابل کے مغرب میں واقع ہے؛ بلاشبہہ یہاں اس کی مراد دریاے کابل سے ہے، اگرچہ کسی دوسری جگہ وہ دریاے سندھ کے لیے سندھی کا نام استعمال کرتا ہے ۔ الفنسٹن نے اس کا نام "کامہ" لکھا ہے (دریاؤں کے متعلق ضمیمہ)، لیکن

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس نے غلط نام استعمال کیا ہے کیونکہ کامہ محض اس کے ایک معاون کا نام ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کابل کے شہر اور ضلع کا نام دریا کے نام پر رکھا گیا ہے ۔

(۲) ایک اہم شہر، آج کل افغانستان کا دارالحکومت، ۳۴°-۳۰′ طول بلد شمالی اور ۶۹°-۱۳′ عرض بلد مشرقی پر سطح سمندر سے ۵۷۸۰ فٹ بلند، ایک زرخیز سطح مرتفع پر واقع ہے جہاں آبپاشی خوب ہوتی ہے، آبادی تقریباً ۱۵ لاکھ ہے ۔

اگرچہ قدیم ترین زمانے سے دریاے کابل کا ذکر مختلف ناموں سے ملتا ہے، لیکن ایسے کسی شہر کا حال معلوم نہیں ہوتا جسے کابل کی جگہ تصور کیا جائے ۔ بعض لوگوں نے بطلمیوس کے "کروره" Karaura کو "کَبُورہ" Kaboura فرض کیا ہے اور جن لوگوں کو اس نے بولتائی Bolitai کے نام سے یاد کیا ہے، ان کا نام اس کے خیال میں کابُلتای Kābolitai تھا، یعنی کابل کے باشندے، لیکن ان مفروضوں کی بنیاد کسی شہادت پر نہیں، غالباً "کوپھینی" پوری وادی کا نام ہے جو دریاے کوپھین سے ماخوذ ہے ۔

اس علاقے پر رومی بادشاہ دیمتریوس Demetrios نے دوبارہ قبضہ کیا اور یہاں ایک یونانی سلطنت قائم ہوئی جو سنۂ عیسوی کے زمانۂ آغاز کے لگ بھگ تک قائم رہی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ عرصے کے لیے پارتھیا (خراسان) کے بادشاہ گوندوفیرس Gondophares کا قبضہ رہا اور پھر پہلی صدی عیسوی میں کوشانی حملہ آور اس پر قابض رہے ۔ کابل کے قریب وَرْدَک کے مقام سے ایک چینی کا برتن برآمد ہوا ہے جس پر ہُوِشکا کا ایک کتبہ کندہ ہے ۔ اس زمانے میں بدھ مت سرکاری مذہب تھا ۔ کچھ عرصے کے لیے ہپتالیوں = "افتالیوں" Ephthalites نے کوشانیوں کا تختہ الٹ دیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوشانی نسل کے لوگ آگے چل کر ایک بار پھر بر سر اقتدار آ گئے ۔ جب ۶۵۷ء میں چینی سیاح ہیئون سانگ کا ادھر سے گزر ہوا، اس وقت انھیں کی حکومت تھی ۔ اس نے کابل کے لیے "کوفو" Kao-fu کا نام استعمال کیا ہے ۔ رفتہ رفتہ برھمنی دھرم نے بدھ مت کی جگہ لے لی، چنانچہ آخری کوشانی فرمانرواؤں کا جو "شاھی" کے لقب سے مشہور تھے، یہی مذہب تھا اور جنھیں بقول البیرونی غالباً ابتدائی اسلامی حملوں کے زمانے کے لگ بھگ ان کے برھمن وزیروں نے معزول کیا ۔ غالباً ابتدائی حملوں کے وقت گندھارا کی ہندو سلطنت پر اس کے صدر مقام اُدَبھنْڈہ (یا وَیہند) سے حکومت کی جاتی تھی جو دریاے سندھ کے کنارے واقع تھا اور یہ سلطنت ان پہاڑوں کے دامن تک پھیلی ہوئی تھی جو جلال آباد کے مغرب میں ہیں، لیکن خاص کابل اس میں شامل نہیں تھا ۔ یہاں ایک علٰحدہ ریاست قائم تھی جہاں کا حکمران الگ تھا ۔ سبکتگین کے زمانے تک یہ ریاست کبھی تو مسلمانوں کے زیر اثر رہی اور کبھی خود مختار ہوئی ۔ قدیم ترین عرب وقائع نگاروں کے مطابق یہ ملک بحیثیت مجموعی قندھار یعنی گندھارا کے نام سے مشہور تھا جسے بسا اوقات غلطی سے شہر قندھار سمجھ لیا جاتا ہے، چنانچہ الطبری بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عاصم بن عمرو اور عبداللہ بن عُمیر ۲۳ھ میں سیستان سے ہوتے ہوے ہندوستان کی سرحد اور قندھار تک بڑھتے چلے گئے ۔ کابل کے شہر کا ذکر واضح طور پر نہیں کیا گیا ۔ وادی کابل اور اس کے ساتھ ہندوکش کے دروں تک کے کوھستان کو کابل شاہ کا ملک بتایا ہے اور دارالحکومت کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ ایک ناقابل تسخیر پہاڑی قلعہ ہے جس کا نام یقینی طور پر معلوم نہیں (Le Strange نے اسے جُروس پڑھا ہے) الیعقوبی لکھتا ہے کہ اسے خلافت عثمانی کے دوران میں عبدالرحمٰن بن سمرة نے فتح کیا، لیکن جب اس نے یہ

لکھا تھا اس وقت اس کا حال صرف کابلی ھلیلہ کی برآمد کی بدولت معلوم ھوا ۔ ایک اور مہم (امیر) معاویہؓ کے زمانے میں بھیجی گئی۔ ۱۷۶ھ/۷۹۳ء میں ھارون الرشید کے ماتحت ایک فوج نے بلخ سے چل کر شمالی جانب سے درۂ بامیان کے راستے وادی پر حملہ کیا ۔ مامون الرشید کے زمانے میں ایک اور حملہ ھوا جس کے نتیجے میں کابل شاہ نے اطاعت اختیار کرکے دین اسلام قبول کر لیا ۔ اور یہاں کے لوگ بھی حلقہ بگوش اسلام ھو گئے ، لیکن ۲۵۷ھ/۸۷۱ء میں یعنی ایران کی صفّاری حکومت سے قبل یہاں صحیح معنوں میں قبضہ نہیں ھو سکا ۔ اس میں شک نہیں کہ چاندی کی کانوں کے باعث "پنج ھیر" میں بے حد کشش تھی اور یعقوب بن لیث صفاری نے سکے یہیں ضرب کرائے تھے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کا ل کا نام کسی خاص شہر کے لیے کہیں استعمال ھوا ھو۔ بہرحال یہ کوئی اھم مرکزی شہر نہیں تھا ۔ یہ امر بھی قابل توجہ ھے کہ یعقوب بن لیث نے زیادہ سیدھے راستے یعنی سجستان سے وادی ارغنداب اور غزنہ سے ھوکر حملہ کرنے کے بجائے شمال سے ھندوکش کے دروں کے راستے حملہ کیا تھا ۔ بتایا جاتا ھے کہ اس زمانے میں کابل کا فرمانروا نسلاً ترک اور مذھباً بدھ تھا اور یہ امر قرین قیاس ھے کہ وہ آخری کوشانی بادشاھوں کا وارث ھو [رک بہ افغانستان] .

مغل شہنشاھوں کے زمانے سے قبل یہ کبھی دارالضرب نہیں رھا ۔ سب سے پہلے یہاں بابر نے سکے ضرب کروائے [رک بہ مادّۂ بابر] ۔ غزنوی [رک بہ غزنویہ] اور غوری [رک بآں] باشاھوں کے تمام تر دور حکومت میں دارالسلطنت غزنہ ھی رھا ۔ الادریسی نے کابل کا ذکر کرتے ھوے لکھا ھے کہ یہ طخارستان کی سرحد پر ایک بڑا ھندی شہر ھے اور یہ بھی بتاتا ھے کہ کوئی فرمانروا کابل میں اپنی بادشاھت کا باضابطہ آغاز کرنے سے قبل "شاہ" کا لقب اختیار نہیں کر سکتا تھا ۔ غالباً اس نے اپنی معلومات ان مآخذ سے حاصل کیں جو اس سے بہت پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتی تھیں کیونکہ اس کے اپنے زمانے میں تو "شاھوں" کی بادشاھت کو ختم ھوے ایک عرصہ گزر چکا تھا .

یہ امر قرین قیاس معلوم ھوتا ھے کہ غزنہ پر بارہا تباھی آنے کے باعث کابل زیادہ آباد ھوتا گیا اور آخر اسے عروج حاصل ھوا ۔ تیمور کے زمانے کے بعد یہ ایک ریاست کا مرکز بن گیا جس پر اس کے خاندان کے بعض افراد حکمران ھوے ۔ ابوسعید [رک بآں] کے وفات پانے کے بعد کابل اس کے بیٹے الغ بیگ کے قبضے میں آ گیا اور وہ یہاں تا دم مرگ حکومت کرتا رھا ۔ اس کے بیٹے کو ذوالنون بیگ ارغون کے ایک بیٹے مقیم نے حکومت سے علیٰحدہ کر دیا اور پھر خود اسے ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں بابر نے نکال باھر کیا ۔ اس نے بابر کی سلطنت ھند کے لیے بنیاد کا کام دیا، حتّٰی کہ جب اس کے بیٹے ھمایوں کو ھندوستان سے نکلنا پڑا تو کابل اس خاندان کے ھاتھ سے نہیں نکلا اور اس پر پہلے کامران اور پھر خود ھمایوں قابض رھا تا آنکہ ھمایوں نے ھندوستان دوبارہ فتح کر لیا ۔ بابر کو کابل بہت پسند تھا؛ اس نے بڑے پُرجوش انداز سے اس کی آب و ھوا ، اس کی ندیوں اور اس کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ھے ۔ آگرے میں وفات پانے کے بعد اس کی میت کابل لے جائی گئی جہاں شہر کے نزدیک ایک باغ میں جس کا نقشہ خود اس نے تیار کیا تھا، اسے دفن کیا گیا ۔ اس کا مقبرہ آج تک موجود ھے ۔ اس زمانے سے کابل کی تاریخ ھندوستان کی مغل سلطنت سے وابستہ ھو گئی ۔ یہاں سونے چاندی اور تانبے کے سکوں کی ٹکسال قائم ھوئی ۔ عہد محمد شاھی تک کے اکثر و بیشتر بادشاھوں کے سکے یہاں سے دستیاب ھوے ھیں ۔ ۱۷۳۸ء میں یہاں نادر شاہ کا قبضہ ھو گیا ۔ نادر شاہ

کے انتقال کے بعد اگرچہ شہنشاہ عالمگیر ثانی کا ایک روپیہ یہاں ڈھالا گیا، لیکن اس کے بعد یہ شہر کبھی مغل سلطنت میں شامل نہ ہوا اور بہت جلد اس پر احمد شاہ درانی [رک بآں] کی حکومت قائم ہوگئی۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے درانی مقبوضات کے دارالحکومت کی حیثیت سے قندھار کی جگہ لے لی اور اس کی یہ حیثیت سدوزئیوں اور بارک زئیوں کے ماتحت آج تک بدستور قائم ہے [رک بہ مادّۂ افغانستان]۔ اگرچہ مختلف لڑائیوں خصوصاً جو ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک سدوزئی اور بارک زئی قبیلوں کے درمیان ہوئیں اور جن میں قبضہ مخالفانہ کرنے والی برطانوی فوج نے حصہ لیا تھا اور پھر شیر علی اور اس کے بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی کے باعث اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا تاہم ایک اہم سلطنت کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے شہر کی رونق اور خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہا۔ عبدالرحمٰن خان [رک بآں] اور حبیب اللہ کے عہد میں شہر کی حالت بہتر ہوگئی اور اچھی اچھی سڑکیں اور بازار تعمیر ہوئے۔ بالاحصار یا پہاڑی پر بنے ہوئے قدیم سکونتی قلعے کی مورچہ بندیاں توڑ دی گئیں اور اس کے بالائی حصے میں سلاح خانہ بنا دیا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ایک نیا مستحکم قصر جو "ارک" کے نام سے مشہور ہے، شہر سے باہر شیر پور اور عالم گنج کے درمیان تعمیر کرایا۔

بابر کے مقبرے کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، تیمور شاہ درانی کا مقبرہ بھی کابل کے نزدیک واقع ہے۔

کابل اس صوبے کا نام بھی ہے جس میں دارالحکومت کابل واقع ہے۔ اس کے شمال میں افغانی ترکستان، مغرب میں ہرات، جنوب میں قندھار اور مشرق میں جلال آباد واقع ہیں۔ اس کے شمال مغرب میں کوہستان پغمان اور جنوب مغرب میں ہزارہ جات شامل ہیں۔ کابل اور جلال آباد کی سرحد جگدلک پر واقع ہے۔ نسبۃً جدید زمانے کے کابل کے لیے رک بہ افغانستان۔

مآخذ: (۱) Elphiustone: *Caubul*، لنڈن ۱۸۳۹ تا ۱۸۴۲ء؛ (۲) Burnes: *Cabool*، لنڈن ۱۸۴۲ء؛ (۳) *The Babur-nama in English (Memoirs of Babur)* ترجمہ A.S.Beveridge، لنڈن ۱۹۲۲ء ۱: ۱۹۹ ببعد و دیکھیے اشاریہ؛ (۴) Yate: *Northern Afghanistan* لنڈن ۱۸۸۸ء؛ (۵) Gray: *At the court of the Amir*، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۶) Holdich: *Indian Borderland*، لنڈن ۱۹۰۱ء؛ (۷) Martin: *Under the absolute Amir*، لنڈن ۱۹۰۷ء نیز رک بہ *Imperial Gazetteer of India*، اوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ج ۱۴؛ (۸) Zotenberg: *Chronique de Tabari* پیرس ۱۸۷۱ء ۳: ۵۱۷ ۸۱۵؛ (۹) J. Mar-quart: *Eransahr (=Abhandl. der. Kön Gesellsch. der wiss zu Gottingen philol-hist. Cl. Neue Eolge* بند ۳، عدد ۲) برلن ۱۹۰۱ء، رک بہ اشاریہ؛ (۱۰) ایضاً *Osteuropäische und Ostasiatische Streifzüge*، ص ۴۷۶؛ (۱۱) G. Le Strange: *The Lands of Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، تاریخی تصنیفات کے لیے رک بہ تحت مادّۂ افغانستان۔

(M. Longworth Dames)

* **کاتب:** محرر یا لکھنے والا، یہ لفظ ک ت ب مادّے سے مشتق ہے اور آگے چل کر ان دونوں لفظوں سے فعل کَتَبَ (اس نے لکھا) بنا۔ عربوں کو یہ لفظ فن تحریر کے ساتھ ساتھ غالباً اپنے شمالی آرامی ہمسایوں سے ملا ہوگا۔ ہمارے پاس قدیم شاعری کے جو نمونے محفوظ ہیں، ان میں یہ لفظ صرف عربی رسم الخط لکھنے والوں کے لیے ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ شعرائے قدیم نے حمیری کاتبوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ زمانۂ قبل از اسلام میں فن تحریر کا وجود عرب کے ہر حصے میں ملتا تھا، لیکن اسے پوری طرح جاننے والے چند ایک ہی تھے، چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہر دور کے صحابہ کے ذکر میں یہ خاص طور پر

لکھا ہے کہ فلاں صحابی لکھنا جانتے تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بہت کم لوگ فن تحریر سے واقف تھے ۔ مدینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے صرف دس اصحاب کو کاتب بیان کیا گیا ہے [بعض مآخذ (مثلاً تاریخ دمشق اور الاستیعاب) کی رُو سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے کاتبوں کی تعداد تیئیس اور پچیس تک پہنچتی ہے (جوامع السیرۃ، ص ۲۶، حاشیہ ۳)]یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مکے کے کئی ممتاز افراد بھی کاتب تھے اور اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہانِ الحیرۃ کے کاتبوں (مثلاً عدی بن زَید) کی خدمات نیک چلنی کی تحریروں یعنی حلف ناموں (جن کا ذکر طفیل الغنوی نے کیا ہے) کے سلسلے میں حاصل کی گئی تھیں اور جن کے حوالے نقائض اور الحارث بن حِلِّزۃ کے مُعلّقہ میں ملتے ہیں اور جو عربی میں لکھے گئے تھے ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کاتب بہت زیادہ اہمیت کے مالک ہیں جو آنحضرتؐ کی وحی لکھنے پر مأمور تھے ۔ یہ کاتب الوحی کے نام سے مشہور ہیں ۔ ابیؓ بن کعب اور زیدؓ بن ثابت ایسے ہی حضرات تھے ۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلام قبول کرنے کے لیے جو متعدد دعوت نامے عمائدین عرب کو ارسال فرمائے تھے، ان کے لکھوانے کے لیے بھی انھیں اصحاب کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا تھا ۔ کاتب کا عہدہ بہت باعزت اور بلند پایہ سمجھا جاتا تھا اور آگے چل کر اس عہدے کے حامل وزیر کہلانے لگے ۔ سارے خلفاے راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں اس عہدے پر جس شخص کو مأمور کیا جاتا تھا، اسے محض کاتب ہی کہتے تھے ۔ خلیفہ ابو العباس کے عہد میں پہلی بار اس کے لیے وزیر کا لقب استعمال ہونے لگا ۔ اس زمانے میں ایرانی نظم و نسق کے طرز پر سرکاری دفاتر کا ایک پیچیدہ نظام نشو و نما پا چکا تھا ۔ کاتبِ اعلیٰ کا لقب کاتب السِّر یعنی "پرائیویٹ سیکرٹری" تھا ۔ دوسرے کاتبوں کو جو کسی دفتری دستاویز کا ابتدائی مسودہ لکھتے تھے، کاتب الانشاء کہا جاتا تھا ۔ فوج کا نظم و نسق اور لشکریوں کی تنخواہ دینے کے فرائض کاتب الجیش کے سپرد تھے، جسے ہم "وزیر جنگ" کے برابر کا عہدہ قرار دے سکتے ہیں ۔ دوسرے کاتب بادشاہ وقت کی جائداد اراضی کی دیکھ بھال پر مأمور ہوتے تھے ۔ کاتبوں کے اس پورے نظام کا نام دیوان [رکب بآں] تھا ۔ ساری قوت و اقتدار اسی طبقے کے ہاتھ میں تھی اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے دار انھیں میں سے منتخب کیے جاتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقہ دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا ؛ چنانچہ محدثین اور ائمۂ دین کی طویل فہرست میں ان کا نام بہت کم نظر آتا ہے، البتہ دیگر اصناف علم و ادب کے مصنفین اور شعرا میں ان کا ذکر مل جاتا ہے ۔ چونکہ ان لوگوں کے لیے تقریباً ہر مضمون کے مبسری علم سے واقف ہونا ضروری تھا، اس لیے ابتدائی زمانے ہی سے مصنفین اس طبقے کے استفادے کے لیے کتابیں لکھنے لگے اور چونکہ انھوں نے اپنے عہدے کی اہمیت برقرار رکھی تھی لہٰذا ان کے مفید مطلب کتابوں کی متعدد نقول ہم تک پہنچی ہیں ۔ کاتب کی تعلیم و تربیت کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے بڑی بڑی یہ ہیں : ابن قتیبۃ [رکب بآں] ادب الکاتب؛ ابن درستویہ : کتاب الکتّاب، الصولی : ادب الکاتب اور بالخصوص القلقشندی کی ضخیم تصنیف ۔ جہاں اوّل الذکر تین کتابوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ ایک اچھے کاتب کی ضروریات کیا ہیں وہاں القلقشندی کی صبح الاعشٰی میں علمی طور پر اس موضوع کے متعلق وہ سب باتیں موجود ہیں جنھیں جاننا ضروری ہے ۔ ہمیں عربی ادب کی انشا میں وہ سارے اثرات نظر آتے ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک کاتب نے اس پر ڈالے ۔ ابتدائی زمانے کے سادے اور واضح رسائل کے بعد عہد مابعد کی

مغلق عبارات تک پہنچتے ہیں جن کے ادق اور مشکل الفاظ کی وجہ سے اکثر اوقات ان دستاویزات کا مقصد و موضوع تلاش کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔ اس "بیماری" کا سبب یہ تھا کہ ہر کاتب عبارت آرائی اور خیال آرائی میں اپنے معاصرین اور پیش روؤں سے گوے سبقت لے جانے میں کوشاں رہتا تھا ۔ ہم کئی تصنیفات کے لیے ان کے مصنفین کی اس خواہش کے مرہون منت ہیں کہ کاتبوں کے لیے ان کی دستاویزات کا مواد بہم پہنچایا جائے ، لیکن چونکہ پرشکوہ الفاظ کی تلاش اور ان کا استعمال ہمیشہ ان کے مدنظر رہتا تھا اس لیے مغربی ذوق مشرقی ادب کو بہ آسانی اخذ نہیں کر سکتا ۔ ایرانی، ترکی اور ہندوستانی کاتبوں نے اسے مبالغے کی حد تک پہنچا دیا ۔ جب وہ الفاظ کی بھول بھلیوں کا مطلب حل کر لیتے تھے تو فخر محسوس کرتے تھے ۔ اس ذہنیت کی ایک جھلک ہمیں اس وقت نظر آتی ہے جب صاحب اسمٰعیل عبّاد جیسا شہرۂ آفاق کاتب ایک خط پر صرف اس وجہ سے اعتراض کرتا ہے کہ اس کے الفاظ بالکل واضح طور پر لکھے ہوے ہیں اور ان پر اعراب دیے ہوے ہیں، کیونکہ اس کے خیال میں ایسا کرنے سے اس کے علم و فضل کی توہین کی گئی ہے ۔ اگرچہ کاتب بڑے اونچے اونچے عہدوں تک پہنچے، مگر ان کا سارا طبقہ کچھ بزدل سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ سوا سازشوں کے اور کسی کام کے اہل نہیں تھے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی کاتب بھی تخت سلطنت پر نہیں بیٹھا، حالانکہ گزشتہ بارہ صدیوں میں کئی جواں مرد اور بلند حوصلہ لوگ تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہوے ہیں ۔

مآخذ : (۱) ابن قُتَیْبَہ : ادب الکاتب ، طبع Grünert اور کئی مشرق طباعتیں، خصوصًا شرح البَطَلْیُوسی بعنوان الاقتضاب ؛ (۲) ابن دُرُسْتَوَیْہ : کتاب الکُتّاب ، طبع شیخو ؛ (۳) الصُّولی : ادب الکاتب ، طبع بیروت ؛ (۴) القَلْقَشَنْدی : صبح الاعشٰی ، طبع قاہرہ ، ۱۴ جلدوں میں اور آخرالذکر کا ملخص بعنوان الضوء .

(F. KRENKOW)

کاتب چلبی : رک بہ حاجی خلیفہ . *

کاتب رُومی : رک بہ علی بن حسین . *

کاتبی : شمس‌الدین محمد بن عبداللہ، ایک فارسی * شاعر ، خراسان میں تُرشِیز کے ایک گاؤں طَرَق وراوش میں پیدا ہوا ۔ نیشاپور میں تعلیم پائی ۔ تیموری بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے ہرات گیا، لیکن امید کے برخلاف اسے وہاں باریابی نہ ہو سکی اور وہ ایک طویل عرصے تک شیروان میں مقیم رہا جہاں شہزادۂ مرزا شیخ ابراہیم (م ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) نے اس کی سرپرستی قبول کر لی تھی ۔ بعد ازاں اس نے آذر بَیْجان میں سکونت اختیار کر لی جہاں اسکندر بن قرہ یوسف نے اس کی ۔ قدر دانی نہیں کی پھر اصفہان میں، جہاں وہ تصوف کے مطالعے میں منہمک ہوگیا اور ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء اور ۸۳۹ھ/۱۴۳۶ء کے درمیان بعارضۂ طاعون استر آباد میں رحلت کر گیا ۔ اسی آخرالذکر شہر میں اس نے نظامی اور امیر خسرو کی تقلید میں خَمْسہ لکھنا شروع کیا، لیکن صرف گلشن ابرار اور لیلٰی مجنوں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکا جس کے صرف ایک قلمی نسخے کا ہمیں علم ہے اور وہ سینٹ پیٹرزبرگ میں ہے ۔ اخلاق اور موعظانہ شاعری کے میدان میں اس نے ایک کتاب دہ باب یا تجنیسات لکھی۔ اس نے ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جس کی دس غزلیں مع ترجمہ Bland نے *Century* ص ، ۱۸ تا ۲۱، میں طبع کرائی ہیں ۔ علٰی ہٰذا سی نامہ، جس میں عشق حقیقی کا بیان ہے اور مثنویوں میں مجمع البحرین جس میں ایک تمثیلی اور رزمیہ داستان ہے ۔ یہ ایک ذوقافیتین نظم ہے اور اسے دو مختلف بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے اور اس میں دو اشخاص ناظر اور منظور کے عشق حقیقی کا قصہ بیان کیا گیا ہے ، نیز دل ربای

جو یمن کے بادشاہ قباد اور اس کے چالباز وزیر کی تمثیلی داستان ہے ۔ اس کے تخلص کاتبی کی وجہ تسمیہ غالبًا یہ ہے کہ وہ ایک کاتب تھا ۔ اس نے یہ فن نیشاپور میں مولانا سیمی سے سیکھا تھا جن سے بعد میں جھگڑا ہو گیا ۔ اس نے اپنی ساری زندگی غربت اور افلاس میں بسر کی کیونکہ اس کا اسراف حماقت کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور اسے اپنے سرپرستوں کے ہاں سے جو شاہانہ انعام و اکرام ملتے انہیں وہ چند ہی روز میں خرچ کر ڈالتا تھا ۔

مآخذ : (۱) دولت شاہ : تَذْکِرَۃ الشُّعَراء ، طبع براؤن ، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء، ص ۳۸۱ تا ۳۹۱ ؛ (۲) لطف علی بیگ : آتش کدہ ، بمبئی ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) ، ص ۷۰ ؛ (۳) رضا قلی خان : مَجْمَع الْفُصَحَاء، تہران ۱۲۹۴ھ، ۲ : ۲۸ ؛ (۴) J. Von Hammer : *Schone Redekünste Persiens*، وی انا ۱۸۱۸ء، ص ۲۸۱ (۵) H. Ethé، در *Grundriss der iran. Philologi*، ۲: ۲۴۵ تا ۲۴۶، ۲۹۷ تا ۲۹۹ ، ۳۰۱ ؛ (۶) Cl. Huart : *Calligraphes et minlaturistes*، پیرس ۱۹۰۸ء ، ص ۲۱۴ ؛ (۷) E. G. Browne : *A Literary History of Persia Under Tartar Dominion*، کیمبرج ۱۹۲۰ء، ص ۴۸۴ تا ۴۹۵؛ (۸) *Cat. of the Persian and Arabic Manuscr . . . at Bankipore*، ۲ : ۱۶ ببعد .

(CL. HUART)

* **الکَاتبی** : (دبیران) نجم الدین علی بن عمر القزوینی ، (م ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء اور بعض روایات کے مطابق ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) ایک ایرانی فلسفی جس نے عربی زبان میں کتابیں تصنیف کیں ۔ اس کی سوانح حیات سے متعلق اس کے سوا کہ وہ نصیر الدین الطوسی [رک بآں] کا شاگرد تھا اور کچھ معلوم نہیں ۔ اس نے اپنے استاد طوسی سے جو خط و کتابت "واجب الوجود" کے مسئلے پر قدما کے دلائل سے متعلق کی وہ موزۂ بریطانیہ میں تاحال ایک مخطوطے کی شکل میں [رسالۃ فی اثبات واجب الوجود] محفوظ ہے (فہرست، عدد ۴۲۹، سطور ۱ تا ۳) اور اسکوریال میں (Derenbourg : *Les mss. ar. de l'Esc.*، عدد ۳۰۷ سطر ۸) .

اس کی سب سے بڑی تصنیف "جامع الدقائق فی کشف الحقائق" ہے جو منطق ، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے مسائل کی تشریح ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئی ۔ اس کے مخطوطات پیرس (de Slane، عدد ۲۳۷۰) میں اور قاہرہ (فہرست، بار اول، ۷ : ۶۴۷) میں موجود ہیں۔ انہیں مسائل کی تشریح میں اس کی دیگر دو کتب نے زیادہ شہرت حاصل کی ، جو اس نے یکے بعد دیگرے لکھیں : (۱) "عین القواعد فی المنطق و الحکمۃ" (مخطوطات در لائیڈن ، فہرست، عدد ۱۵۲۵ اور دراسکوریال Derenbourg ، عدد ۶۶۸) جس کے ساتھ مصنف ہی کی شرح "بحر الفوائد" بھی ہے (لائیڈن = کتاب مذکور، عدد ۱۵۲۶ ، Esc.، کتاب مذکور، عدد ۶۶۵) اور (۲) کتاب حکمۃ العین، طبیعیات اور مافوق الطبیعیات میں جو بہت سے مخطوطات کی صورت میں تاحال موجود ہے ۔ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں میرک شمس الدین محمد بن مبارک شاہ البخاری نے اس کتاب کی شرح لکھی ۔ یہ شرح مع تعلیقات از محمد الجُرجانی (م ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء)، و قطب الدین محمود بن مسعود الشیرازی (م ۷۱۰ / ۱۳۱۱ء)، و حبیب اللہ میرزا جان (م ۹۹۴ھ / ۱۵۸۶ء) ، و المحقق الباغندی دو جلدوں میں ۱۳۱۹ء و ۱۳۲۴ء میں قازان سے شائع ہوئی ۔ ۱۸۴۵ء میں کلکتے سے صرف جُرجانی کی تعلیقات شائع ہوئیں ۔

اس کی شہرت کی بڑی وجہ علم منطق میں اس کا رسالہ موسوم بہ "الرسالۃ الشمسیہ فی القواعد المنطقیہ" ہے ۔ یہ رسالہ اس نے شمس الدین محمد بن بہاء الدین محمد الجُوَینی کی فرمائش پر لکھا جو معول بادشاہوں ہلاگو ، اباقہ اور احمد (م ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء) قب

۱-۱ ج ۱ بذیل مادّہ کا صاحب دیوان تھا - یہ کتاب کلکتے میں ۱۸۱۶ء و ۱۸۲۷ء؛ استانبول میں ۱۲۶۳ھ؛ لکھنؤ میں ۱۸۹۱ء کشاف اصطلاحات الفنون طبع A. Sprenger کے ضمیمہ ۱ کے طور پر کلکتے میں ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی - شمسیہ کی کثیر التعداد شروح میں سے مشہور ترین وہ شرح ہے جو اس کے حصۂ اول (قسم التصورات) کی قطب الدین محمد بن محمد الرازی التحتانی (م ۷۶۶ھ / ۱۳۶۴ء) نے "تحریر القواعد المنطقیہ" کے نام سے لکھی اور وہ کلکتے میں ۱۸۱۵ء/۱۲۵۹ھ" کانپور میں ۱۲۸۸ھ؛ لکھنؤ میں ۱۲۶۳ھ، ۱۲۷۹ھ، ۱۸۷۶ء، ۱۸۸۶ء اور قاہرہ میں ۱۲۹۳ھ، ۱۳۰۷ھ میں طبع ہوئی - اس کے برابر کی شہرت السید الجُرجانی کے اس کتاب پر حواشی کو حاصل ہے جو کلکتے میں الکوچک کے نام سے ۱۲۴۰ھ، ۱۲۶۱ھ؛ دہلی میں ۱۳۰۹ھ، ۱۳۲۶ھ، لکھنؤ میں ۱۸۹۵ء؛ قازان میں ۱۸۸۸ء؛ استانبول میں ۱۲۶۶ھ؛ قاہرہ میں ۱۳۲۳ - ۱۳۲۷ھ، اور بعنوان حاشیۃ الجرجانی علی التصورات استانبول میں ۱۲۹۳ھ طبع ہوئی- سید الجرجانی کی تعلیقات پر عبدالحکیم السیالکوٹی (سیالکوٹی، م ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء) نے حواشی لکھے؛ طبع دہلی ۱۸۷۰ء؛ لکھنؤ ۱۸۷۸ء، ۱۳۰۸ھ؛ استانبول ۱۲۵۹ھ، ۱۳۱۰ھ، عصام الدین الاسفرائینی (م ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) کے حواشی سنگی طباعت میں، بمقام نامعلوم، ۱۲۷۵ھ میں چھپے - سعد الدین التفتازانی (م ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء) کی شرح التحتانی کے حاشیے پر مع حواشی از رونق علی لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء طبع ہو کر شائع ہوئی - یہ کتاب بالخصوص ہندوستان میں دور حاضر تک نہایت اشتیاق کے ساتھ پڑھی پڑھائی جاتی رہی- میر محمد زاہد الہروی (م ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء) نے اس پر تعلیقات لکھیں اور یہ تعلیقات کانپور میں ۱۲۸۷ھ؛ لکھنؤ میں ۱۳۰۲ھ میں مع حواشی غلام یحیی البہوائی اور ان حواشی بر حواشی از عبدالحی لکھنوی طبع ہوئیں، نیز ایک مجہول الاسم محشی کے حاشیے کے ساتھ ہندوستان میں ۱۲۸۷ھ طبع ہوئی - "تعلیقات" مصنفۂ علی لکھنوی ۱۲۹۲ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوئی - عبدالحلیم لکھنوی نے دوسری اور تیسری فصل پر شرح المختلطات، طبع لکھنؤ ۱۸۶۲ء لکھی - محمد السنجانی مفتی زادہ نے ایک حصے یعنی فصل التصدیق پر حواشی لکھے، طبع استانبول ۱۲۵۴ھ اور فصل التصورات کتاب مذکور پر بھی حواشی لکھے، طبع ۱۲۵۴ھ، ۱۲۵۹ھ- "شمسیہ" کی ایک تلخیص "میزان المنطق" جس کا مصنف معلوم نہیں، مجموعۂ منطق "کانپور ۱۸۸۱ء، ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی اور عبداللہ بن الحداد العثمانی التلنبی نے بعنوان "بدیع المیزان" اس کی شرح لکھی، طبع کانپور ۱۸۷۷ء؛ لکھنؤ ۱۳۱۱ھ- میزان خاص کی ایک شرح محمد فضل الامام الخیر آبادی نے لکھی طبع Tamasgand ۱۲۸۶ھ، اس کی ایک شرح فارسی میں بنعوان "الکلام الفائق" احمد حسین اَرّاکانی نے لکھی طبع کانپور ۱۳۱۷ھ.

بالآخر الکاتبی نے فخر الدین الرازی (م ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) کے فلسفے کے دو رسالوں المحصل اور الملخص کی شرحیں بھی لکھیں جن میں سے پہلی کا نام "المفصل" اور دوسری کا نام المنصّص ہے.

مآخذ : (۱) القزوینی : تاریخ گزیدہ، ص ۸۴۵؛ (۲) خواند امیر : حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء جلد ۳، ص ۶۱؛ (۳) C. Brockelmann : *GAL*، ۱ : ۴۶۷، ۵۰۷؛ [تکملہ، ۱ : ۸۴۵ ببعد].

(C. BROCKELMANN)

کَاثْ : خوارزم موجودہ خیوا کا قدیم دارالحکومت۔ * یاقوت (معجم، طبع وسٹنفلڈ، ۴: ۲۲۲) کی رو سے اہل خوارزم کی زبان میں اس نام کے معنی تھے صحرا میں ایک دیوار (حائط)، چاہے اس کے اندر کوئی عمارت نہ بھی ہو - فیل یا فیر کے قدیم شہر یا قلعے کے بارے

میں مفصل ترین بیانات، جسے آمودریا (جیحون) بتدریج بہا لے گیا تھا (اس کے آخری نشانات، بعض بیانات کے مطابق ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں صفحۂ ہستی سے معدوم ہوے تھے) البیرونی [رک بآں] کی کتاب الآثارالباقیة، ص ۳۵ ، میں ملتے ہیں اور انھیں پر E. Sachau کی کتاب *Zur Geschichte una Chronologie von Khwarizm* (*Sitzungsber. der phil.-hist. cl. d. k. k. Akad.*) *der Wiss.*، ج ۷۳، وی انا، ۱۸۷۳ء، خصوصاً ص ۸۹۴ ببعد پر مبنی ہے ۔ چوتھی (دسویں) صدی کے جغرافیہ نگاروں نے اس شہر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے قب G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate* کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۶۴ ببعد، W. Barthold : *Turkestan w epokhu mongolskago nashestwiya* ج ۲، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء، ص ۱۴۳ ببعد ۔ اس کے بارے میں مکمل ترین حالات المقدسی، طبع ڈخویہ، بار دوم، ۱۹۰۶ء، ص ۲۸۷ ببعد، میں ملتے ہیں ۔ جب ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں گرگانج کے فرمانروا ابوالعباس مامون بن محمد کے ہاتھوں پہلے خوارزم شاهی خاندان کا تختہ الٹا تو اس شہر کی سیاسی اهمیت جاتی رهی، دیکھیے W. Barthold : *Turkestan etc.*، ۲ : ۲۷۵ ببعد، کاٹ کا ذکر کرتے ہوے ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ (وہ اسے الکات لکھتا ہے، دیکھیے طبع Defrémery and Sanguinetti، ۳ : ۲۰) کہ یہ خوارزم اور اُرگنج (قدیم گرگانج) کے درمیان واحد آباد مقام ہے ۔ خوارزم میں مقامی حکمران خاندان کے برسر اقتدار آنے سے قبل آٹھویں ہجری (چودھویں مسیح) صدی میں خیوا کے ساتھ کاٹ بھی سلطنت چغتائی میں شامل تھا (ظفر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۷ء، ۱ : ۲۳۲) ۔ مثال کے طور پر یہ امر ۱۳۳۱ء کے چین کے نقشے Bretschneider : *Mediaeval Researches from Eastern Asiatic Sources*، ۱۸۸۸ء، ۲ : ۶۳) سے بھی ظاہر ہوتا ہے ۱۳۷۲ء میں کاٹ پر تیمور کی یلغار کے بارے میں دیکھیے ظفر نامہ، ۱ : ۲۳۷ ببعد، P. Lerch : *Khiwa oder kh warizm*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۳ء، ص ۲۱) کے اس دعوے کے متعلق متن میں کوئی سند نہیں ملتی کہ فوج نے سہ پایہ اور کاٹ کے درمیان آمودریا کو عبور کیا تھا ، جس کا مطلب اس نے یہ نکالا تھا کہ کاٹ اس زمانے میں دریا کے بائیں کنارے پر واقع تھا ۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی) میں کاٹ ایک خشک نہر کے کنارے آباد، تھا لہٰذا خیوا کے خان انوشہ (۱۶۶۳ تا ۱۶۸۷ء) نے اصل ندی کے مغرب میں نہر یارمشی کے کنارے جسے اس نے خود کھدوایا تھا، ایک نیا کاٹ آباد کیا W. Barthold : *Kistoric orosheniya Turkestana* ، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۴ء، ص ۹۵ ، از مخطوطۂ ایشیاٹک میوزیم ob ۵۹۰، تاریخ خیوا، ورق ۳۳ الف) قدیم کاٹ کے کھنڈر جو آمودریا کے مشرق میں واقع ہیں، آجکل دور اسلامی کے ابتدائی ایام کے ایک بزرگ شیخ عباس ولی کے روضے کے نام سے موسوم ہیں ۔ ۱۸۷۳ء میں A. Kuhn یہاں پہنچا تھا، اس نے یہاں کے حالات قلمبند کیے ہیں (Materiali dlya statistiki Turk. Kraya، ۴ : ۲۵۲) ۔ ولی موصوف کے مقبرے کے علاوہ جو روغنی اینٹوں سے آراستہ یہاں کی واحد عمارت ہے، A. Kuhn نے ایک نیم منہدم مینار اور فصیل شہر کے بچے کچھے آثار کا ذکر کیا ہے ۔ ان سب کی تعمیر میں پکی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں ۔ موجودہ گاؤں (۲۰۰ مکانات، ۱۵ دکانیں، ۲ مسجدیں مع مکاتب) قدیم محل وقوع کے صرف ٹھوڑے سے حصے پر آباد ہے اور موجودہ قلعہ قدیم قلعے کے صرف چوتھائی رقبے پر مشتمل ہے ۔ بقول V. Masalskiy : *Turkestankiy Kray*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۳ء، ص ۴۹۷) یہ کھنڈر پیٹروالگزنڈروسک Petroalexdrovsk (جو انقلاب کے بعد سے ترتکل Turtkul کے نام سے مشہور ہے) سے ۳۱ ورسٹ Verst (روسی میل = ۳/۲ میل

انگریزی) اور آمودریا کے موجودہ دائیں کنارے سے ۷ ورسٹ کے فاصلے پر واقع ہیں .

(W. BARTHOLD)

* **کارتہ** : سینیگال Senegal فرانسیسی سوڈان کا ایک علاقہ ہے جو ۲۱ ہزار مربع میل تک پھیلا ہوا ہے اور سینیگال کے بالائی سمندر اور صحراے اعظم کے درمیان واقع ہے ۔ اس کے شمال کی جانب دریش موروں کا ملک اور ہوذ کا علاقہ ہے ۔ مغرب میں سینیگال، مشرق میں بُخنو اور جنوب میں بلدگو اور قُلدگو ۔ (سطح کے اعتبار سے یہ ایک وسیع سطح مرتفع ہے جس میں قدیم زمانے کا Schistose زیادہ ہے اور Mesozoic اور Teritiary طبقات ارضی بھی زیادہ ہیں، اس میدان مرتفع کا نشیب جنوب مشرق کی طرف ہے، چنانچہ اس علاقے کے تقریباً سب دریا سینیگال ہی کی جانب بہتے ہیں .

آب و ہوا ہلکی خشک ہے، اوسط درجۂ حرارت عام طور پر ۸۰ درجے (ف) رہتا ہے سالانہ اوسط حرارت کی تدریجی حد ۲۲ء۵ درجے (ف) ہے، ماہانہ حرارت ۸۵ درجے (ف) ہے، سالانہ حرارت کا درجۂ اوسط حرارت مئی اور ستمبر میں دگنے تک پہنچ جاتا ہے ۔ یہاں بارش عموماً موسم گرما میں جنوب مغربی ہواؤں سے ہوتی ہے جو خلیج گنی کے گرم سمندر کے اوپر سے گذر کر آتی ہیں ۔ سالانہ بارش تقریباً ۲۵ انچ ہوتی ہے، جس کے ساتھ بادلوں کی گرج بھی ضرور سنائی دیتی ہے ۔ صحرا کی طرف سے جو گرم اور غبار آلود آندھیاں آتی ہیں، ان کی وجہ سے موسم اکثر خراب ہو جاتا ہے ۔ مختصراً کارتہ کی آب و ہوا کی خصوصیات یہ ہیں : درجۂ حرارت بہت زیادہ، موسم گرما میں چند روزہ خفیف بارش اور اس کے بعد طویل خشک سالی اور ہوا میں نمی کی کمی .

اس علاقے میں دریا بہت کم ہیں اس لیے بستیاں زیادہ تر کنوؤں کے ارد گرد بس گئی ہیں، پانی کی سطح بہت نیچی ہے لیکن پانی کا دباؤ بہت زیادہ ہے، جہاں کہیں زمین دوز کنویں بنائے جاتے ہیں، پانی بہت جلد اوپر ابھر آتا ہے .

اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یہ علاقہ سرسبز میدانی ہے ۔ دور دور تک وسیع گھاس کے خشک میدان ہیں جن میں جا بجا ایسے درخت ہیں جن پر خشک سالی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سال کے بڑے حصے میں خشک نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر کیکر ۔ کارتہ جہاں کہیں آبپاشی کے وسائل مہیا ہوں، زراعت کے لیے موزوں ہے ۔ دریاؤں کے کناروں کے علاقے زرخیز ہیں اور ان میں یہاں کی مخصوص خوراک چاول کی کاشت ہوتی ہے ۔ دوسرے ریتلے اور مرطوب علاقوں میں کپاس، پھلیوں اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے، اقتصادی زندگی کی بنیاد زیادہ تر تیل کے بیجوں اور پھلوں پر ہے، جن کا یہاں کی تجارت میں آدھا حصہ ہے ۔ دوسری پیداوار جس کی اہمیت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے ، کپاس ہے ۔ اس علاقے میں کپاس کی ان مختلف اقسام کی کاشت کو رائج کیا گیا ہے جو مختلف طرح کی آب و ہوا کی شدت کو برداشت کر سکیں ۔ کپاس کا بیج کاشتکاروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور مقامی کپاس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔ اس بات کے وسیع امکانات موجود ہیں کہ یہاں بھیڑیں پال کر آمدنی کے ذرائع کو بڑھایا جا سکے ۔ حال ہی میں یہاں مہرینو قسم کی بھیڑیں پالنے کا تجربہ کیا گیا تھا جو زیادہ ناکام نہیں رہا .

یہاں کی آبادی بہت کم ہے، یعنی کوئی پانچ چھے کس فی مربع میل ۔ جو لوگ یہاں آباد ہیں زیادہ تر سوننکی اور بمبرہ قوم کے لوگ ہیں ۔ مخلوط آبادی میں خسونکے Khassonke پیوھل Peuhl اور مور شامل ہیں، بمبرہ قوم کے سوا باقی سب مسلمان ہیں کارتہ کے مختلف حصوں کی تفصیل یہ ہے : (۱) Diafunu (تمبرکہ) اور Diomboko (کونیاکری) جو سینیگال کے دائیں کنارے پر واقع ہیں؛ (۲) Giudiumé (نیو گومبرہ) Diafun کے شمال میں واقع ہے؛ (۳)

Tomoo (دیالہ) وسط میں واقع ہے؛ (۴) بگھے Baghe اور کارتہ بنے Kaarta-Bine، فلدگو Fuladugu کے شمال میں واقع ہے؛ (۵) دیان غرتہ مشرق میں؛ (۶) کنگوی (نیورا) مُوروں کی سرحد پر Luniakori اس علاقے کا پایے تخت ہے جہاں کی آبادی پانچ ہزار ہے۔ نیورا جو شمال میں واقع ہے جہاں کی آبادی بھی پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے، ایک اچھا تجارتی مرکز ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اس علاقے کی تحقیقات ہاٹن Houghton اور منگو پارک Mungo Park (۱۷۹۵ء نے اور پھر ڈوراٹن Duranton (۱۸۲۸)، ریفنل Raffenel (۱۸۴۶)، Mage & Quintin (۱۸۶۳) اور Lenz (۱۸۸۰) نے کی۔

تاریخ: سترھویں صدی کے اختتام پر سلطنت مَلّی کو زوال آیا، قوم بمبرہ مساسی Bambara Massassi کے لوگوں نے جو سیگو سے آئے تھے، سونسہ Sunsa نامی سردار کی سرکردگی میں کارتہ کو فتح کر لیا اس کے جانشینوں کو سیگو کے بمبرہ کے خلاف جنگ کرنی پڑی، اٹھارھویں صدی کے آخر میں سیگو کے بمبرہ نے مساسیوں کو مغلوب کر لیا لیکن مساسیوں کے ایک شہزادے موسی گرابو نے اپنی قوت بڑھا کر نہ صرف تمام مفتوحہ علاقے واپس لے لیے بلکہ کونیا کاری کا علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ کودیہ Kaudia نے جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا، نیورو اور دیاورہ کے علاقے بھی فتح کر لیے اور اس طرح کارتہ ایک زبردست اور طاقتور سلطنت بن گئی جو مشرق سے مغرب تک ۱۹۰ میل اور شمال تا جنوب ۱۱۰ میل لمبی تھی۔ اقتدار و اختیار ایک سردار کُلوبر Kulubar کا تھا جس کا لقب فامہ Fama تھا۔

کارتہ کی سلطنت کو تکولر Tuculor نے مطیع و مغلوب کر لیا۔ کارتہ قتل کر دیا گیا اور فامہ کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔ اب کارتہ کا علاقہ تکولر کی سلطنت سے ملحق ہو گیا اور اس پر ۱۸۹۴ء تک ایک وائسرائے حکومت کرتا رہا۔ ۱۸۹۰ء میں کرنل Gallieni کی فوجیں کارتہ میں داخل ہو گئیں، انھوں نے کونیا کاری پر بھی قبضہ کر لیا، یکم جنوری ۱۸۹۱ء کو انھوں نے نیوود پر بھی قبضہ کرکے سارے ملک کو مطیع کر لیا اور کارتہ کو مملکت فرانس میں شامل کر لیا گیا اور اس کو انتظامیہ طور پر تین مختلف اضلاع نیورو، کتہ Kita اور کیز Kayes میں تقسیم کر دیا۔

مآخذ: (۱) Raffenel: *Nouvean voyage au pays*، پیرس ۱۸۵۶ء ج ۲؛ (۲) Mage: *Du Sénégal au Niger*، پیرس ۱۸۶۷ء؛ (۳) Gallién: *Veyage au Soudon Francais*، پیرس ۱۸۵۸ء، ص ۵۸۹-۶۰۵؛ (۴) Pietri: *Les Français au Niger*، پیرس ۱۸۸۵ء، ص۶۳؛ (۵) Lenz: *Voyage au Sénégal et au Maroc*، ج ۲، پیرس ۱۸۸۶ء؛ (۶) Gatelet: *Histoire de la conquste du Soudon Français*، پیرس ۱۹۰۱ء ص۱۷۹، ۱۹۳؛ (۷) M. Delafosse: *"Hant Senegal, Niger"*، پیرس ۱۹۱۲ء، ج ۱۱؛ (۸) Suggatels: *Africa*؛ (۹) Walter Fitzgerald: *Africa*؛ (۱۰) Hydvology: *Arid zone*؛ (۱۱) *Q. U. N. E. S. C. O. Fullicatriv*: The Columbia Lippivcott Gazetteer of the World.

(G. YVER)

کارتھیج: رک بہ قرطاجنہ۔ *

کاروان: (قدیم شکل "کار۔ بان"، وہ شخص جو * تجارت کی حفاظت کرتا ہے)، انگریزی میں اس لفظ کی صورت Caravan ہو گئی ہے۔ فارسی میں اس کے معنی ہیں سوداگروں کی ایک جماعت جو ڈاکوؤں اور رہزنوں کے مقابلے میں اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو منظم کرتی ہے، (عربی قافلہ)۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان لانے لے جانے کے لیے اونٹ، گھوڑے اور خچر استعمال ہوتے ہیں، اونٹوں کو سات سات کی قطار میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ شتربان گدھے پر سوار ہو کر

قافلے کے آگے آگے چلتا ہے ۔ کاروان چلانے والے سست رو ہوتے ہیں اور عجلت سے کام نہیں لیتے، لیکن ان کا کام بڑا سخت اور تھکا دینے والا ہوتا ہے؛ ایک آدمی کو اکثر دس بارہ اونٹوں کی دیکھ بھال اور رہبری کرنا پڑتی ہے ۔ بعض اوقات تیس چالیس اونٹ صرف تین آدمیوں کے سپرد ہوتے ہیں ۔ ان شتربانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ہر منزل پر پہنچ کر اپنے جانوروں کا مال اتاریں، انہیں چارہ دیں اور ان کی دیکھ بھال کریں ۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کہیں وہ اپنے کھانے پینے کے متعلق سوچتے ہیں ۔ ازمنۂ وسطیٰ میں کوچ کا اشارہ ڈھول (کوس) بجا کر دیا جاتا تھا .

صحرائی علاقوں میں قافلہ ان خیموں میں ٹھیرتا ہے جو وہ ساتھ لاتے ہیں، لیکن بادشاہوں اور مخیر لوگوں نے منزل بمنزل اور ایسے مقامات پر جہاں کاروان سستانے کے لیے رکتے ہیں، عمارتیں بنوا دی ہیں جنھیں کاروان سرائیں کہتے ہیں ۔ ان عمارتوں کا نقشہ عموماً ایک سا ہوتا ہے ۔ یعنی ایک مربع صحن، اس کے چاروں طرف دیواریں جن میں ایسی کوئی کھڑکی نہیں ہوتی جو باہر کی طرف کھلتی ہو ۔ ان کے ساتھ ساتھ کمروں کا ایک سلسلہ چلا جاتا ہے؛ ہر کمرے میں ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہوتی ہے ۔ بعض اوقات ان کاروانسراؤں میں کمروں کے بجائے بغیر چھت کی جھونپڑیاں بھی ہوتی ہیں ۔ ان کی تعمیر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سوداگر وہاں رات بھر ٹھیر سکیں اور اپنا سامان رکھ سکیں ۔ بار برداری کے جانوروں کو بندھن باندھ کر صحن میں چھوڑ دیتے ہیں، ان کاروان سراؤں میں جہاں تک ممکن ہو پانی کی بہم رسانی کے لیے کہیں سے آب رواں لایا جاتا ہے یا کم از کم وہاں ایک کنواں بنوا دیا جاتا ہے ۔ ایران میں اکثر ایسی عمارتیں جو اب تک موجود ہیں، صفویوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں اوران کی تعمیر شاہ عباس اعظم سے منسوب کی جاتی ہے ۔ ان کاروانسراؤں میں اب صرف خالی چار دیواری کے سوا اور کچھ نہیں ۔ ضروری استعمال کی چیزیں مثلاً بستر، قالین اور کھانا پکانے کے برتن وغیرہ مسافر اپنے ساتھ لاتے ہیں، تاہم شہروں میں خصوصاً کاروانسرائے کے قریب ایک نانبائی ہوتا ہے جس کے ہاں اہل مشرق کے پسندیدہ کھانے ہر وقت تیار ملتے ہیں .

شیعیوں کے نزدیک نجف میں ضریح حضرت علیؓ (مشہد علی) اور کربلا میں ضریح امام حسینؓ (مشہد حسین) کے قریب دفن ہونا ایک با برکت عمل سمجھا جاتا ہے ۔ یہ دونوں مقامات پہلے سلطنت عثمانیہ کی حدود میں تھے، اب مملکت عراق میں ہیں ۔ اس مقصد کے لیے لوگ ہزاروں کی تعداد میں نعشوں کو لے کر ایران کے بعید ترین گوشوں سے میت کے قافلے بنا کر یہاں آتے ہیں ۔ نعشوں کو لکڑی کے تابوتوں میں یا قالینوں اور چٹائیوں میں لپیٹ کر دو دو، تین تین یا چار چار کی تعداد میں گھوڑوں کی پشت پر باندھ دیا جاتا ہے ۔ ہر منزل پر ان میتوں کو بالکل اسی طرح اتارا اور لادا جاتا ہے جس طرح سامان کے گٹھوں کو ۔ چونکہ اس سفر میں کئی ہفتے لگ جاتے ہیں ۔ اس لیے ان قافلوں میں ناقابل برداشت تعفن پیدا ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی گاؤں کے قریب قیام کرتے وقت وہ وہاں سے تین یا چار میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالتے ہیں .

مآخذ : G. A. Olivier : *Voyage dans l' empire othoman*، ۳ : ۴۵۵ تا ۴۵۸؛ (۲) H. Binder : *Au Kurdistan*، ص ۳۱۹، ۳۳۰؛ (۳) E. G. Browne : *A year amongst the Persians*، ص ۷۲؛ (۴) J. E. Polak : *Persien*، ii : ۵۵ .

(CL. HUART)

کاروان سرائے : رک بہ فندق .

کارو مَنْڈل : رک بہ معبر .

کارُون : جنوبی ایران کا سب سے بڑا دریا ،

یه ضلع عربستان (جسے پہلے خوزستان کہتے تھے) کے شمال مشرق حصے میں ۳۲° عرض بلد شمالی سے ذرا اوپر زردہ کوہ سے نکلتا ہے (کوہ زرد، جس کا پندرھویں صدی عیسوی ہی میں حمد اللہ مستوفی کے یہاں ذکر ملتا ہے (دیکھیے مآخذ) اس کا تعلق سلسلۂ کوہ بختیاری سے ہے اور اگر زیادہ صحت سے کام لیں تو کہنا چاہیے کہ یہ اس پہاڑ سے نکلتا ہے جس کا نام کوہ رنگ ہے اور جو جنوب مغربی ایران کے بلند ترین پہاڑوں میں شمار ہوتا ہے (تخمیناً ۱۳۰۰۰ فٹ) Sawyer (رک بہ مآخذ؛ در آخر ترجمۂ کتاب جس کا نام وہاں درج ہے ص ۴۸۶، مع ایک تصویر) کے قول کے مطابق اس دریا کا اصل منبع چشمۂ کرنگ (کرنگ (کرن) کا بڑا منبع) نامی مقام سے ۱۰ میل اوپر کی طرف واقع ہے، "زائندہ" یا "زینده رود" بھی جسے اصفہان رُود بھی کہتے ہیں اسی طرح زردہ کوہ سے نکلتا اور مشرق میں اصفہان کی جانب بہتا ہے .... [تفصیل کے لیے دیکھیے ۱۱ لائیڈن بار دوم و بار اول بذیل مادّہ] .

مآخذ : (۱) *B G A*، بمواضع کثیرہ، خصوصاً اشاریہ بذیل مادّہ (نہر) دُجیل و (نہر) مسرُقان؛ (۲) ابن سرپین، طبع DeGoeje در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۳۰، سطر ۵ تا ۹ ؛ ۳۲ ۱ ببعد (متن) اور ص ۳۰۷ تا ۳۱۳ (ترجمہ و حواشی؛ (۳) یا قوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۲: ۵۵۵، ۲۰ ببعد ؛ ۴ : ۵۲۷ : ۱۱ ببعد ؛ (۴) حمد اللہ مستوفی : نزھة القلوب، طبع Le Strange، ص ۱۹۵، سطر ۱۹، ۲۱۵، سطر ۳؛ (۵) ابن بطوطه، طبع Sanguinetti و Defrémery، ۲ : ۲۳ تا ۲۴؛ (۶) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ۲۰۷، ۲۳۲ تا ۲۳۷؛ (۷) P. Schwarz : *Iran in Mittelalter nach den arab. Geograph*، ج ۴، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۲۹۵ تا ۳۰۸، ۳۱۰ تا ۳۱۱؛ (۸) J. M. Kinneir : *A Geogr. Memoire of the Persian Empire*، لنڈن ۱۸۱۳ء، ص ۸۷ تا ۹۰، ۹۶ تا ۹۹، ۱۰۲ تا ۱۰۵ ؛ (۹) H. C. Rawlinson، در *JRGS*، لنڈن ۱۸۳۹ء، ۹ : ۶۴ ببعد ۷۳ تا ۷۸، ۸۱، ۸۸ ببعد ؛ (۱۰) Selby، وہی کتاب ۱۸۴۴ء، ۱۴ : ۲۱۹، ۲۴۱؛ (۱۱) Layard، وہی کتاب ۱۸۴۶ء، ۱۶ : ۲۷ تا ۲۸، ۴۴، ۵۰ تا ۶۵؛ (۱۲) Ritter : *Erdkunde*، ۹ : ۴۶، ۱۶۲ تا ۲۰۴، ۲۱۹ تا ۲۲۰، ۲۲۵ تا ۲۲۷؛ ۱۰ : ۲۶، ۲۸، ۳۱؛ ۱۱ : ۱۰۲۴ تا ۱۰۲۵، ۱۰۲۸ تا ۱۰۳۰؛ (۱۳) C. A. von Bode : *Travels in Luristan and Arabistan*، لنڈن ۱۸۴۵ء، ۲ بمواضع کثیرہ (خصوصاً ص ۱۶۲، ببعد ۱۹۳، ۲۷۳ ببعد)؛ (۱۴) W. K. Loftus : *Travels and Research. in Chaldaea and Susiana*، لنڈن ۱۸۵۷ء، ص ۲۸۹ تا ۲۹۳، ۲۹۸ تا ۳۰۰، ۳۲۹، ۳۴۳، ۳۴۶، ۴۲۳ تا ۴۳۱؛ (۱۵) Fr. Spiegel : *Eranische Altertumskunde*، ۱، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ص ۱۰۸ تا ۱۱۱؛ (۱۶) A. Arnold : *Through Persia by Caravan*، لنڈن ۱۸۷۷ء، ۲ : ۳۹ ببعد ؛ (۱۷) H. Schindler در *Z.G. Erdk. Berl.*، ۱۸۷۹ء، ۱۴ : ۳۸ ببعد ۱۸۸۱ء، ۱۶، ۳۰۷ ببعد؛ (۱۸) H. L. Wells در *PRGS*، ج ۵، لنڈن ۱۸۸۳ء، ص ۱۳۸ ببعد، ۱۴۴ ببعد، ۱۵۳ ببعد ؛ (۱۹) Bateman Champain، وہی کتاب، ۱۸۸۳ء، ۵ : ۱۲۱ تا ۱۳۸، ۱۴۶ تا ۱۴۹، ۱۵۲ (مع حواشی Fr. Goldsmid و Mackenzie)؛ (۲۰) Stolze و Andreas در *Petermanns Geogr Mitteil*، تکملہ حصہ عدد ۷۷، ص ۴۸، ۵۶، ۱۸۸۵ Gotha ؛ (۲۱) J. Dieulafoy : *Le Perse, la Chaldée et la Susiane*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۲۲) W. Fr. Anisworth : *A Personal Narrative of the Euphrates Expedition*، لنڈن ۱۸۸۸ء، ۲ : ۱۶۸ تا ۱۸۹، ۲۰۵ ببعد ۲۱۹ تا ۲۳۲ ؛ (۲۳) W. F. Ainsworth : *The River Karun*، لنڈن ۱۸۹۰ء ؛ (۲۴) H. B. Lynch : *Karun Valley*، در *PRGS*، ۱۸۹۰ء، ۱۲ ؛ (۲۵) Tomaschek : *Kustenfhart Nearchs*، در *S. B. Ak. Wien*، جلد ۱۲۱ : Abh. ۸ : ص ۷۳ تا ۸۴ (۱۸۹۰ء)؛

(۲۶) G. N. Curzon : *The Karun River*، در *P.R.G.S*، ۱۲ : ۵۰۹ تا ۵۳۲ ؛ (۲۷) Curzon : *Persia and the Persian Question*، لنڈن ۱۸۹۲ء، بمواضع کثیرہ (دیکھیے اشاریہ؛ خصوصاً ۲ : ۳۱۴ ببعد، ۳۳۰ ببعد، ۳۳۶)؛ (۲۸) Mrs. Bishop : *Journeys iu Persia and Kurdistan*، لنڈن ۱۸۹۲ء ؛ (۲۹) H. A. Sawyer در *The Geographical Journal*، ج ۴، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۴۸۱ تا ۵۰۱ (مع حواشی از Lynch, Mackenzie، ص ۵۰۲ ببعد)؛ (۳۰) Th. E. Gordon : *Persia Revisited*، لنڈن ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۰ ببعد؛ (۳۱) *The Persian Gulf Pilot* (ابتداءً مرتبۂ Constable و Stiffe) لنڈن ۱۸۹۸ء، ص ۲۸۴ تا ۲۹۳، ۲۹۶ تا ۲۹۹ ؛ (۳۲) Billerbeck، در *Mitt. VAG*، ۳ حصہ ۲ : ص ۲۹ تا ۳۴، ۴۶ تا ۵۰ (۱۸۹۸ء)؛ (۳۳) Graadt von Roggen، در *Mém de la Délégation en Perse*، ۷، پیرس ۱۹۰۵ء، ص ۱۶۷ تا ۲۰۷؛ (۳۴) E. Herzfeld در *Petermann's Geogr. Mitteil*، ج ۵۳ Gotha ۱۹۰۷ء، ص ۷۳ تا ۷۹، مع الواح ۶ و ۷، هر راستے کا نقشہ (کارون کی گزرگاہ شستر سے اَهْواز - ناصریہ تک)؛ (۳۵) W. Schweer : *Das türkischpersische Erdölvorkommen*، ہمبرک ۱۹۱۹ء = *Abh. des Hamburg. Kolonialinstituts*، جلد ۳۰ : ۲۲، ۵۷ تا ۷۲، ۱۱۰ تا ۱۱۷، ۱۳۰ تا ۱۴۲، ۱۷۷ تا ۲۱۹، مع نقشہ ۳ (وادی کارون) اس سلسلے میں مطالعے کے لیے مزید تصنیفات اور نقشوں کا حوالہ Schweer نے ص ۱۵۳ ببعد اور ۱۶۵ ببعد پر دیا ہے .

(M. Streck [تلخیص از ادارہ])

* **کَازِرُوْن** : ایران کا ایک شہر جو صوبۂ فارس میں، سمندر اور شیراز کے درمیان ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور شیراز سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے .

مآخذ : (۱) یاقوت، طبع وُسٹنفلڈ، ۴ : ۲۲۵؛ (۲) Barbier de Meynard : *Dictionnaire de la Perse*، ص ۴۷۲ و حاشیہ ؛ (۳) G. le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ۲۶۶ ؛ (۴) J. P. Morier : *Second Journey*، لنڈن ۱۸۱۸ء ؛ (۵) E. S. Waring : *A tour to Sheeraz*، لنڈن ۱۸۰۷ء ص ۲۲ .

(Cl. Huart [تلخیص از ادارہ])

* **کازرُونی** : شیخ مرشد ابو اسحٰق ابراهیم بن شہر یار - ناحیۂ کازرون کے بزرگ علما و عرفا میں سے تھے اور درویشوں کے ایک سلسلے کے بانی جو ان کے نام کی نسبت سے اسحٰقیہ یا "کازرونیّہ" کہلاتا ہے - کازرون (ولایت قشطائی) میں ۳۵۳ھ سے ۴۲۶ھ (۹۶۳ء تا ۱۰۳۴ء) تک بقید حیات تھے اور اسی شہر میں اپنی خانقاہ میں مدفون ہیں - مستوفی کے زمانے میں ان کا مزار "حریم" تصور ہوتا تھا (نزهة القلوب ص ۱۲۵) وہ آتش پرستوں کے خاندان سے تھے اور اس خاندان میں ان کا باپ ہی پہلا شخص تھا جو مشرف باسلام ہوا، شیخ کی ولادت ان کے باپ کے اسلام لانے کے بعد ہوئی - (جامی - نفحات الانس طبع کلکتہ ص ۲۸۶، لامعی کا ترکی ترجمہ استانبول، تاریخ طباعت ندارد، ص ۲۹۷) لیکن باوجود اس کے وہ اسلام کے ایک سرگرم مبلغ تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے چوبیس ہزار آتش پرستوں اور یہودیوں کو مشرف باسلام کیا اور لاکھ مسلمانوں نے توبہ کرکے ان سے بیعت کی - (فرید الدین عطار : تذکرة الاولیاء مرتبۂ نکلسن ۲ : ۲۹۶ ، خزینة الاصفیا، طبع لاهور ۱۲۸۳ء، ص ۸۷۸) - ان کے سلسلے کے ارکان ہمیشہ سرگرم مبلغ رہے جو کفار کے خلاف جہاد اور غزاء کی تلقین کیا کرتے تھے - اسحٰقیّہ سلسلہ ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان اور چین تک پھیل گیا، جہاں انھوں نے اپنی شاخیں قائم کیں ؛ بالخصوص بندرگاہوں پر (مثلاً کالی کٹ اور زیتون میں) دیکھیے ابن بطوطہ طبع ڈیفریری و سنگینٹی Sanguinetti, Defrémery ۲ : ۶۴، ۸۸ تا ۹۲، ۳ : ۲۴۴ تا ۲۴۸، ۴ : ۱۰۳) یہ سلسلہ آناطولی تک بھی پہنچا، جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ

بانی سلسلہ نے اپنی زندگی ھی میں اپنے پیروؤں کو جہاد کے لیے روانہ کیا تھا ۔ لیکن اس علاقے میں اس سلسلے کی موجودگی کا پورا ثبوت چودھویں صدی ھی سے ملتا ھے (W. Caskel : در *ISL*، ۱۹ : ۲۸۴ ببعد) اپنے مجاھدانہ تبلیغی جوش و خروش کی وجہ سے "اسحٰقیّہ" سلسلے نے پندرھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں لازمی طور پر نمایاں حصہ لیا ھوگا۔ Spandugino (سولھویں صدی کی ابتدا) نے اپنے ایک رسالے میں (در سانسووی‌نو Sansovino وینس ۱۶۵۴ ص ۱۲۹) اس سلسلے کو چار بڑے سلسلوں میں شمار کیا ھے ۔ قدرتی طور پر اس کا نفوذ روم ایلی میں بھی ھوا (ادرنہ کے تکیۂ حضرت ابو اسحٰق کازرونی کا ذکر اولیا چلبی ج ۳، ص ۵۴۴ میں موجود ھے) آناطولی سے یہ سلسلہ حلب پہنچا ۔ بروسہ، قونیہ اور ارزروم میں ان کے ادارے (ابو اسحٰق خانے موجود) تھے ، Caskel : کتاب مذکور) ۔ چودھویں صدی میں اس سلسلے کی تنظیم یقینا اعلیٰ درجے کی ھوگی کیونکہ زاویۂ شیخ کے خادم شیخ کی مہر لگا کر ضرورت مندوں کو ان لوگوں کے نام =چیک Cheque دیا کرتے تھے جنھوں نے کازرونی سلسلے کا حلف اٹھایا ھوتا تھا، وصولی کے بعد وصول کنندہ امر کے پیچھے رسید درج کرتا تھا ۔ شیخ کی تربت کو "تریاک اکبر" کہتے تھے، اس لیے کہ آپ کی خاک مزار کے متعلق معتقدین (بالخصوص ملاحوں اور عطار) کا عقیدہ تھا کہ وہ حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ھے، سلطان شاھرخ بن تیمور نے ۸۱۸ھ (۱۴۱۵-۱۴۱۶ء) میں مزار شیخ کی زیارت نہایت عقیدت کے ساتھ کی (مطلع سعد بن، جلد ۲، ص ۳۴۴) ۔ ترکی میں سترھویں صدی کے دوران میں "اسحٰقیّہ" نے اپنے آپ کو ایک نسبۃً متأخّر سلسلے میں مدغم کر دیا ۔ لیکن عوام میں کازرونی سے عقیدت کے مظاھرے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتے ھیں .

مآخذ : (۱) ماسینیون Massignon : *La passion d'al-Halladj*، ۱ : ۱۰۴ ببعد ؛ (۲) کوپریلو زادہ محمد فواد Köprülüzade Mehmed Fu'ad (اور میرے اضافے) : در *ISL*، ۱۹ : ۱۸ ببعد) اس مقالے میں ناموں کے حوالے بھی ھیں جن کو ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا تھا مناقب ؛ (۳) Meier : *Die Vita des Scheik Abu Ishaq al-Kazaruni*، لائپزگ ۱۹۴۸ء؛ (۴) بستان السیاحۃ، ۲ : ص ۴۶۰ ؛ (۵) فارس نامۂ ناصری ، ۲ : ۲۴۹) (به زیادات) .

(P. WITTEK)

کازموف : رک بہ قاسموف . *

کاسا بلانکا : (Casa Blanca) : رک بہ * دارالبَیْضاء .

اَلْکَاسَانی : ابوبکربن مَسْعُود بن احمد علاءالدین ملک العُلَماء، حنفی فقیہ، جنھیں غلطی سے "الکاشانی" بھی کہا جاتا ھے ؛ ان کی نسبت "کاسان" سے ھے جو "الشّاش سے پرے ھے" (قُرَشی، ابن دُقْماق)، یعنی فرغانہ میں [دریای] سَیْحُون کے جانب شمال، دیکھیے المُسْتَوفی : نزھۃ القلوب، ص ۲۴۶ ؛ السَّمعانی، ص ۴۱۷ ؛ یاقوت، ۴ : ص ۲۲۷؛ وہ علاءالدین محمد بن احمد بن ابی احمد السمرقندی (۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء) کے شاگرد تھے ۔ انھوں نے اپنے استاد کی دختر فاطمہ سے جو فقیہہ کہلاتی تھیں شادی کی اور تحفۂ عروسی کے طور پر اپنے استاد کی تصنیف "تحفۃ" پر اپنی شرح پیش کی ۔ ابتدا میں وہ سلجوقی دربار سے وابستہ تھے، لیکن ایک بحث کے دوران میں وہ دست درازی پر اتر آئے اور انھیں دربار سے اپنا تعلق منقطع کرنا پڑا ۔ اس واقعے کے بعد سلجوقی حکمران نے اپنے وزیر کے مشورے سے انھیں حلب میں نورالدین بن زنگی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیا، جہاں ان کا بڑی تعظیم و تکریم سے خیر مقدم کیا گیا (۵۴۱ھ اور ۵۴۴ھ کے درمیان) ۔ بعد ازآں نور الدین نے انھیں علمائے حلب کی درخواست پر رضی الدین السَّرَخْسی (۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء-۱۱۵۰ء) کے

بجاے "مدرسة الحلاویه" (قائم شدۂ ۵۴۳ھ) میں معلم کی حیثیت سے مامور کر دیا، کیونکہ طلبہ السَّرَخسی سے قوت بیان میں ایک نقص کی وجہ سے بہت غیر مطمئن تھے ("ابن قُطْلُوبُغا" اور طاش کوپروزادہ کا یہ بیان کہ انھیں یہ منصب السَّرَخسی کی وفات کے بعد ملا غلطی پر مبنی ہے - دیکھیے علاوہ ازیں ابن العدیم : تاریخ حلب، ترجمہ Blochet در ROL، ج ۳ (۱۸۹۵ء) ص ۵۱۹ - وہ ایک نہایت ثقہ اور صحیح العقیدہ عالم تھے اور معتزلہ اور اہل البدعة کا اکثر ردّ کرتے رہتے تھے - دمشق میں ایک دفعہ ان کا شافعی علما سے مناظرہ ہوا، جس میں انھوں نے شافعیوں کے ہر ایک سوال کے جواب میں کسی حنفی مستند عالم کی سند پیش کی - ان کا انتقال حلب میں بتاریخ ۱۰ رجب ۵۸۷ھ/۳ اگست ۱۱۹۱ء اتوار کے روز ہوا اور انھیں حلب سے باہر مقام ابراہیم الخلیل میں ان کی اہلیہ کی قبر کے نزدیک دفن کیا گیا - ایوبی سلطان الظاہر غازی نے ان کے بیٹے کی تعلیم کا اہتمام اپنے ذمے لے لیا .

ان کی اہم ترین تصنیف کتاب "بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع" (۷ جلد، قاہرہ ۱۳۱۷-۱۳۱۸ھ) فقہ سے متعلق ہے - یہ کتاب ان کے سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق ان کے استاد علاءالدین السمرقندی کی تصنیف "التحفہ" مبنی بر "قُدُوری" کی شرح ہے (حاجی خلیفہ، ۲ : ۲۳۵، نے بھی یہی لکھا ہے) مگر یہ تصنیف "شرح" کی معمولی خصوصیات کی حامل نہیں اور خود کتاب میں اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ السمرقندی کی کتاب کی تقلید میں لکھی گئی ہے - غالباً یہ سب سے پہلی اور اپنی نوع کی واحد حنفی فقہ کی کتاب ہے جو الغزالی کی "الوجیز" اور ابن رشد کی "البدایة" کی مانند چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک پوری باقاعدگی کے ساتھ مرتب کی گئی ہے - مصنف خود کتاب کی تمہید میں اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ وہ سختی سے ایک منتظم طریقے (الترتیب الصنائعی) کی پابندی کرے گا - اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی تھی جو اب موجود نہیں، یعنی السلطان المبین فی اصول الدین (القرشی؛ ابن قُطْلُوبُغا، حاجی خلیفہ، عدد ۷۲۱۵) - براکلمان اس کی ایک تفسیر قرآن کتاب التاویلات کا ذکر کرتا ہے جو بشکل مخطوطہ محفوظ ہے .

مآخذ : بڑا ماخذ (۱) ابن العدیم : تاریخ حلب، اکثر حصہ غیر مطبوعہ - مندرجۂ ذیل نے اس سے استفادہ کیا ہے : (۲) القرشی : الجواہر المضیئة، ۲ : ۲۴۴، ۲۴۶ ؛ (دیکھیے ۲ : ۱۲۹ و ۲۷۸) ؛ (۳) ابن دقماق : نظم الجمان فی طبقات اصحاب النّعمان، مخطوطۂ برلن، پیٹرزبرگ، جلد ۲، ص ۲۴، ورق ۱۴ تا ۱۵ ب؛ (۴) ابن قُطْلُوبُغا : تاج التراجم، طبع Flügel، شمارہ ۲۶۲ ؛ (۵) طاش کوپرو زادہ : مفتاح السّعادة، حیدر آباد ۱۳۲۹ھ، ۲ : ۱۳۵ ؛ (۶) الکَفَوی : طبقات الحنفیّہ، مخطوطۂ برلن، Sprenger، شمارہ ۳۰۱، ورق ۱۰۴ (اقتباس از لکھنوی : الفوائد البہیّہ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ ص ۵۳)؛ (۷) G. Flügel : *Die Classen der Hanafit Rechtsgelehrten*، لائپزگ ۱۸۶۰ء، ص ۳۰۶ ؛ (۸) Brockelmann : *GAL*، ۱، ص ۳۷۵) ؛ (۹) Sarkis : *Dictionnaire de Bibliogra-phie Arabe*، قاہرہ ۱۹۲۸ء، عمود ۱۵۴ .

(HEFFENING)

کاسٹیوم : Costume رک بہ لباس .

کاشان : (عرب مصنفین کے یہاں اکثر قاشان) عراق عجمی (الجبال، میڈیا) کا ایک شہر جو اصفہان سے تین روز کی مسافت اور قم سے ۱۲ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے - یہ ایک قدیم شہر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے اسے از سرنو آباد کیا تھا .

مآخذ : (۱) اصطخری، ص ۱۹۷، ۲۰۱؛ (۲) ابن حوقل، ص ۲۵۹، سطر ۱۶ تا ۱۷ ص ۲۶۴ ؛ (۳)

المقدسی، ص ۳۹۰، ۳۹۲، بلا تاریخ؛ (۴) یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۱۱: ۱۵؛ (۵) حمد اللہ مستوفی: نزھة القلوب، سلسلۂ یادگار گب، ۲۳: ۶۷، ۶۸ (ترجمہ Barbier de Meynard (۶) :Dick. de ص ۷۱، ۷۲؛ la Perse، ص ۳۳۴، ۳۳۵؛ (۷) Schefer: Chrest Persane، ۲: ۱۲۹؛ (۸) Le Strange: The Lands of the Eastern Caliphate، ص ۲۰۹؛ (۹) Olivier: Voyage etc، پیرس ۱۸۰۷ء، ۳: ۹۶ تا ۹۷؛ (۱۰) Morier: A second Journey through Persia، ۱۸۱۸ء، ص ۱۶۱، ۱۹۲؛ (۱۱) W. Ousley: Travels لنڈن ۱۸۱۹ء، ۳: ۸۶ تا ۹۴؛ (۱۲) Mme Dieulafoy: La Perse etc، پیرس ۱۸۸۷ء، ص ۱۹۴ تا ۲۱۲؛ (۱۳) R. Binning: Journey of two years travel، لنڈن ۱۸۵۷ء، ۲: ۱۸۶ ببعد؛ (۱۴) E. Aubin: musulman Rev. du Monde، ۱۹۰۷ء، ۲: ۴۶۱ تا ۴۶۴؛ (۱۵) Chardin: Voyages، طبع Langles، پیرس ۱۸۱۱ء، ۲: ۴۶۱ تا ۴۶۳، ۳: ۱ تا ۱۱۰.

(CL. HUART) [تلخیص از ادارہ]

* **کاشانی**: رک بہ عبدالرزّاق.

* **کاشانی**: حاجی میرزا جانی، بابی مؤرخ، کاشان کا ایک تاجر جو اپنے تین بھائیوں میں سے دو یعنی حاجی میرزا اسمٰعیل ذبیح اور حاجی میرزا احمد کے ساتھ میرزا علی محمد باب کے اوّلین پیروؤں میں سے تھا۔ جب ۱۸۴۷ء میں باب کو اصفہان سے ماکو کے زندان میں بھیجا جا رہا تھا تو ان بھائیوں نے اس کے نگران دستے کو رشوت دے کر اسے دو دن اور دو رات کے لیے اپنے ہاں بطور مہمان رہنے پر آمادہ کر لیا۔ ایک سال بعد کاشانی نے بہاء اللہ، صُبح ازل اور باب کے دوسرے ممتاز مریدوں کے ساتھ مل کر مازندران میں بار فُروش کے مقام پر شیخ طَبَرسی کے باغیوں میں شامل ہونے کی کوشش کی، لیکن شاہی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کچھ عرصے کے لیے آمل میں قید رہا، تاآنکہ کاشان کے دو تاجروں نے فدیہ دے کر اسے رہائی دلائی۔ "وہ ہمیں ہمیشہ ایک خاص مذہبی جوش و جذبے سے سرشار نظر آتا ہے، کبھی بار فُروش میں، کبھی مشہد میں اور کبھی تہران میں" باب کو ۹ جولائی ۱۸۵۰ء کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کے بعد کے دو سال کاشانی بابی تحریک کی تاریخ لکھنے میں منہمک رہا۔ اور وہ اس کام کے لیے موزوں بھی تھا، کیونکہ وہ نہ صرف باب سے بلکہ صُبح ازل، بہاء اللہ اور بابی مذہب کے تقریباً تمام اوّلین قائدوں سے ذاتی طور پر شناسا تھا اور اس تحریک کے ابتدائی آٹھ سال میں جتنے بھی واقعات پیش آئے، ان کے بارے میں اسے مفصل اور صحیح معلومات حاصل تھیں۔ اس کی تاریخ میں (جس کا نام اس نے کسی متصوفانہ بنیاد پر جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی، نقطة الکاف رکھا تھا) سب حالات صحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں لیکن اس میں اس نے اپنے ممدوح کے لیے حد سے زائد اور تقریباً بت پرستانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے اور اس پر جبر و تشدد کرنے والوں کے خلاف جو دشنام طرازی کی ہے، اس سے یہ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ جب ناصر الدین شاہ قاجار نے اس لئے مذہب کے پیرووں پر ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا تو کاشانی کو شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ سے جو تہران سے چھے میل جنوب میں واقع ہے اور جہاں اس نے پناہ لے لی تھی جبراً نکال کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ یہاں اسے بہاء اللہ کے ساتھ ایک ہی کوٹھڑی میں جگہ ملی۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۲ء کو اسے تہران میں اس کے ۱۷ ہم مذہبوں کے ساتھ سزائے موت دی گئی۔ حکمت عملی کے تقاضے سے شاہ نے انہیں سزائے موت دینے کے لیے مختلف جماعتوں کے سپرد کر دیا تھا تاکہ وہ خود اور اس کا وزیر ہدف انتقام نہ بن سکیں، چنانچہ کاشانی کو آقا مہدی ملک التجّار کے حوالے کیا گیا۔ ایک بیان کی رو سے اسے کمان کی تانت سے گلا گھونٹ کر

مارا گیا اور ایک دوسرے بیان کے مطابق شہر کے تاجروں اور دکانداروں نے اسے اتنے زخم لگائے کہ بالآخر اس نے دم توڑ دیا۔

اس کے بھائیوں میں سے اسمٰعیل نے تہران میں وفات پائی اور احمد، جس نے باب کی موت کے بعد صبح ازل کو اس کا جانشین تسلیم کر لیا تھا، بغداد میں چند بھائیوں کے ہاتھوں جو بہاء اللہ کے پیرو تھے، مارا گیا۔

مآخذ: (۱) حاجی میرزا جانی: *نُقطَةُ الکاف* طبع E.G. Browne در سلسلۂ یادگار گب (*Gibb Memorial Series*)؛ (۲) Browne: *A Traveller's Narrative Written to illustrate the Episode of the Bab*، کیمبرج ۱۸۹۱ء؛ (۳) وہی مصنف: *The Ta'rikh-i-Jadid, or 'New History of Mírzá 'Alí Muhammad the Báb* کیمبرج ۱۸۹۳ء۔

(T. W. HAIG)

* **کَاشغَر**: [عوامی جمہوریۂ چین کے صوبۂ سنکیانگ کا] ایک شہر، جس کا ذکر قدیم ترین چینی مآخذ میں سُولے Su-le (یا سُولو، شولو) کے نام سے ملتا ہے۔ تانگ شو *T'ang-Shu* میں یہ نام اپنے چینی املا کئوچہ Kiu-cha کے ساتھ مذکور ہے (E. Chavannes: *Documents sur les Tou-Kine (Gurcs) Occidetaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۱ ببعد)، [کاشغر دو الفاظ "کا ش" (بمعنی رنگا رنگ) اور "غر" (بمعنی خشتی مکان) سے مرکب ہے اور دراصل دو شہروں کا مجموعہ ہے، یعنی چینی شہر لائی ننگ Lai-ning (یعنی شولو) اور اس کے مغرب میں اس سے کہیں بڑا اویغوری شہر شُوفُو (یا سُوفُو)۔ ہن اور تانگ حکمرانوں کے ادوار میں یہاں شولو سلطنت قائم تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح ایک انڈوسیتھین قوم یوہ چی Yueh Chi کنسوہ کے علاقے سے آ کر اس پر قابض ہو گئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں چینیوں نے کاشغر سمیت پورا چینی ترکستان فتح کر لیا اور کہا جاتا ہے کہ مشہور چینی سپہ سالار پان چاؤ Pan Chao کاشغر ہی میں مدفون ہے۔ اس کے بعد یہ چی نے ایک بار پھر کاشغر فتح کر لیا اور انہیں کی بدولت یہاں بدھ مت کی اشاعت ہوئی]۔ زمانۂ قبل از اسلام کے کاشغر اور اس کے مضافات میں بدھ عمارات کے لیے دیکھیے A.Stein: *Ancient Khotan* آکسفرڈ ۱۹۲۱ء، ص ۸۰ ببعد؛ وہی مصنف: *Serindia*، آکسفرڈ ۱۹۲۱ء، ص ۸۰ ببعد۔

[ابن الأثیر، ابن خلدون اور دوسرے مسلمان مؤرخین کے مطابق خلیفہ ولید بن عبدالملک کے نامور سپہ سالار مسلم بن قتیبہ نے کاشغر فتح کیا (۹۶ھ/ ۷۱۵ء)، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ مستقل طور پر اسلامی سلطنت میں شامل نہیں کیا گیا (دیکھیے H. A. R. Gibb، در *Bull. of the School of Or. Stud.*، ۲ : ۶۷۴ ببعد)۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں چینیوں کی فوج متعین تھی، لیکن وہ مغرب سے آنے والے ترکوں کا مقابلہ نہ کر سکی]۔ کاشغر کے پہلے مسلمان خان کی حیثیت سے ہمیں سُتُق بُغرا خان (م ۳۴۴ھ/۹۵۵ء) کا نام ملتا ہے (جمال قرشی، در Barthold: *Turkestan etc.*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱ : ۱۳۰ ببعد)، جس کا مقبرہ کاشغر کے شمال میں ارتوج (موجودہ ارتش) کے مقام پر آج بھی موجود ہے۔

دور ایلک خانیہ [رک بآں] میں کاشغر سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے چینی ترکستان کا اہم ترین شہر تھا۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں اس شہر کی ایک تاریخ عربی زبان میں لکھی جا چکی تھی (السمعانی: *کتاب الانساب*، طبع Margoliouth، لائیڈن و لنڈن ۱۹۱۲ء، ورق ۴۷۰ الف تا ۴۷۲ الف؛ جمال قرشی، در Barthlod، ۱ : ۱۲۳)۔ فرمانرواؤں کو تومن Tumen کے کنارے ایک مخصوص مقبرے (الجنبذۃ الخاقانیہ) میں دفن کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے فرمانروا نے، جسے وہاں دفن کیا گیا تھا، محرم

۴۲۴ھ/دسمبر ۱۰۳۲ء میں اور آخری نے رجب ۶۰۱ھ/ مارچ ۱۲۰۵ء میں وفات پائی تھی - عہد مغول میں مسعود بیگ [رک بہ بخارا] نے کاشغر میں ایک مدرسہ بنوایا تھا - اس کے کتاب خانے میں الجوہری کی صحاح کا وہ نسخہ موجود تھا جسے جمال قرشی نے ترجمہ لکھتے وقت استعمال کیا تھا - E. Sachau و Ethe : *Cat. of the Persian . . . Mss of the Bodleian Library*، اوکسفرڈ ۱۸۸۹ء، عمود ۹۸۳)۔

[۱۲۱۹ء میں چنگیز خان نے کاشغر کا ضلع اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لیا - قبلای خان کے عہد میں مارکوپولو یہاں آیا تھا (۱۲۷۵ء) - چودھویں صدی عیسوی میں امیر تیمور کے لشکر نے اسے تاخت و تاراج کیا] - آگے چل کر کاشغر پر امرائے دُوغلات [رک بآں] کی حکومت قائم ہو گئی - ان میں سے آخری امیر ابوبکر (م ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء) جدید شہر کا بانی تھا - اس نے پرانا قلعہ منہدم کرکے دریائے تومن کے دوسرے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا (تاریخ رشیدی، انگریزی ترجمہ، ص ۲۵۳، ۲۸۶ ببعد، ۲۹۵، ۳۲۶)۔

[۱۷۵۵ء میں چینیوں نے ایک بار پھر کاشغر فتح کر لیا، جو تنگن بغاوت (۱۸۶۲ء) تک انھیں کے ماتحت رہا - ۱۸۶۴ء میں ایک مسلمان سپہ سالار یعقوب بیگ نے کاشغر کے امیر کو معزول کرکے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی] - مغول خوانین کے زمانے سے کاشغر اس علاقے کا صدر مقام نہ رہا تھا، اس کی جگہ یارقند نے لے لی تھی - ۱۸۷۷ء میں چینیوں کا دوبارہ قبضہ ہو جانے کے بعد کاشغر کو پھر اہمیت حاصل ہو گئی کیونکہ اسے تاؤتای Tao-tai کا صدر مقام بنا دیا گیا، جس کے ماتحت چینی ترکستان کے مغربی اور جنوبی حصے چرچن کے نخلستان تک شامل ہیں - یہاں روسی اور انگریز قونصل رہنے لگے - ۱۸۷۳ء میں کاشغر کے حالات کے لیے دیکھیے H. W. Bollow، در *Mission to Jarkand in 1873.* : Sir J.D. Fonsyth، لنڈن ۱۸۷۵ء، جدید شہر کے لیے دیکھیے Kornilow : *Kashghariya*، تاشکنت ۱۹۰۳ء، مع نقشہ (ص ۲۶۸)؛ M. Hartmann : *Chinsisch-Turkestan*، Halle ۱۹۰۸ء، ص ۴۵ ببعد ۸۹۷ ببعد - کاشغر اور مضافات کی سب سے اہم عمارت گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے مشہور ولی حضرت اپاق کا مقبرہ ہے - [۱۹۵۸ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ تھی - کاشغر سنکیانگ کے کپاس پیدا کرنے والے علاقے کا مرکز ہے - ۱۹۴۰ء میں شہر کے شمال مغرب میں واقع پہاڑوں میں تانبے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں] .

مآخذ : متن مقالہ میں دے دیے گئے ہیں؛ [نیز دیکھیے *Encyclopaedia Britannica*، طبع ۱۹۶۹ء، ۱۳ : ۲۴۳، ۲۴۴].

(W. Barthold [و ادارہ])

* **کاشف** : محمد شریف بن شمس الدین المتخلص به کاشف کَمیت، گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کا ایک ایرانی مصنف - ہمیں اس کی زندگی کے جو تھوڑے بہت حالات معلوم ہیں، وہ زیادہ تر اس کی کتاب خزان و بہار کے خاتمے سے ماخوذ ہیں - مصنف کی پیدائش کے وقت اس کا باپ شمس الدین محمد المعروف به شمسائے شیرازی کربلا میں رہتا تھا - وہ ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۷ - ۱۵۹۸ء میں وہاں سے اصفہان چلا گیا - اس وقت اس کے بیٹے محمد کا سن تین برس کا تھا، جو ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۴ - ۱۵۹۵ء میں پیدا ہوا تھا - ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ - ۱۶۰۰ء میں شمس الدین مشہد گیا اور سات ماہ بعد اصفہان لوٹ آیا - Rieu کی *Catalogue* کی رو سے یہ تاریخیں برٹش میوزیم کے قلمی نسخے میں دی گئی ہیں - سینٹ پیٹرز برگ کے قلمی نسخے کا جو حال Rosen نے قلمبند کیا ہے، اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف ۱۰۰۶ھ میں پانچ برس کا تھا اور مشہد کا سفر ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱-

۱۶۰۲ء میں پیش آیا تھا - ۲۳ برس اصفہان میں بسر کرنے کے بعد یہ خاندان رے چلا گیا جہاں کاشف کے باپ نے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵-۱۶۲۶ء میں وفات پائی - خود محمد شریف پندرہ سال تک رے کا قاضی رہا .

تذکرۂ نصیرآبادی (ملخص در Sprenger : *Catal. of the . . . . . manuscripts of the Libraries of the King of Oudh*، ۱ : ۸۸ ببعد) میں کاشف اور اس کے دو بھائیوں اسمٰعیل مُنصف اور مُقیما کا ذکر ملتا ہے - مصنف موصوف کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اس نے لازماً ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲-۱۶۵۳ء کے بعد انتقال کیا ہو گا - خزان و بہار کا جو قلمی نسخہ لنڈن میں موجود ہے اس کے خاتمے پر جو مادّۂ تاریخ درج ہے، اس سے اس تصنیف کی تکمیل کی یہی تاریخ نکلتی ہے - خاتمے میں مصنف نے اپنی دوسری تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اس وقت تک لکھی جا چکی تھیں، لہٰذا خزان و بہار اس کی آخری کتاب ہے .

تصنیفات : جیسا کہ خود کاشف بتاتا ہے اس کی باقاعدہ علمی و ادبی تربیت ہوئی تھی اور اس نے تحصیل علم میں کافی مدت صرف کی تھی - اس نے نظم و نثر دونوں صنفوں میں لکھا ہے - کاشف نے تین مثنویاں لکھیں جن میں سے دو (لیلٰی مجنوں اور ہفت پیکر) زمانۂ متأخر کی بیشتر مثنویوں ہی کی مانند ہیں اور ان کا موضوع وہی ہے جو نظامی کے زمانے سے بہت مقبول ہو چکا تھا - تیسری کا نام عباس نامہ ہے - یہ غالباً شاہ عباس دوم (؟) صفوی کی مدح میں لکھی گئی تھی - علاوہ ازیں اس کی کئی ایک مختصر نظمیں، قصائد اور رباعیات بھی ہیں - نثر میں اس کی کتابیں حسب ذیل ہیں : سراج المُنیر، یہ کتاب گلستان سعدی سے متأثر ہو کر لکھی گئی تھی - اس کا اسلوب مرصّع ہے اور اس میں جا بجا اشعار بھی آ گئے ہیں - متن ۲۰ حصوں (لمعات) میں منقسم ہے - ان میں مختلف محاسن اور مکارم اخلاق کا بیان ہے اور ان کی تشریح حکایات کے ذریعے کی گئی ہے - مخطوطۂ لنڈن میں اس کی تاریخ تکمیل ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰-۱۶۲۱ء دی گئی ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ وہ سن ہو جس میں اس قلمی نسخے کو نقل کیا گیا تھا اور اصل کتاب اس سے چند سال قبل لکھی جا چکی ہو - اس کی آخری کتاب خزان و بہار بھی مرصع نثر میں ہے - یہ ایک مجموعۂ حکایات ہے جسے لکھنے کی اس کے چھوٹے بھائی منصف نے فرمائش کی تھی - اکثر حکایات ایک پرانی کتاب الفَرج بعد الشدّۃ مصنفۂ حسین الدہستانی سے لی گئی ہیں، لیکن تفصیلات کا اضافہ اس نے خود کیا ہے، چنانچہ مثال کے طور پر اس نے ایک واقعہ ایسا بھی درج کیا ہے جو اس کے باپ شمس الدولہ کو پیش آیا تھا - یہ کتاب ایک مقدمے، ۱۴ حصوں (اساس) اور خاتمے پر مشتمل ہے (طبع سنگی، تبریز ۱۹۲۴ء)، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نثر میں اس نے دو کتابیں اور بھی لکھی تھیں یعنی دُرِّ مکنون اور حواس باطن .

مآخذ : Rieu : *Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum*، ص ۸۶۱، تکملہ، ص ۲۵۰ ببعد؛ (۲) Rosen : *Les manuscrits persane de l'Institut des langues orientales*، ص ۲۸۵ ببعد؛ (۳) Ethé: در *Grundr. der Ir. Phil.*، ۲ : ۲۳۶، ۲۳۸، ۳۳۰ .

(V. F. Buchner)

* **کاشفی** : حسین واعظ، ایک بسیار نویس مصنف جسے ہرات میں (سلطان حسین میرزا کے عہد میں [رک بآں]) بڑا عروج نصیب ہوا - اس نے ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء میں وفات پائی - اس کی مشہور ترین تصنیفات حسب ذیل ہیں : (۱) اخلاقیات پر ایک کتاب بعنوان اخلاق مُحسنی جو سلطان حسین میرزا کے ایک بیٹے ابوالمحسن کے نام سے منتسب کی گئی اور ۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء میں مکمل ہوئی - یہ پہلی بار ۱۸۰۹ء میں کلکتے سے اور اس کے بعد کئی بار شائع ہوئی؛ (۲) نصراللہ بن محمد

بن الحمید[رک بآں] نے قبل ازیں کلیلہ و دمنہ کا جو فارسی ترجمہ کیا تھا، اس کا کاشفی نے جدید فارسی میں ترجمہ کیا ۔ اس نے نظام الدین شیخ احمد السہیلی (م ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۱ تا ۱۵۰۳ء) کے کہنے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اپنی کتاب کا نام انوار سہیلی رکھا ۔ اس کا اسلوب بڑا پر تکلف ہے اور اس میں صنائع و بدائع بکثرت استعمال کیے گئے ہیں ۔ اسی وجہ سے مشرق میں اس کتاب کو بہت سراہا جاتا ہے ۔ اس کے قلمی نسخے عام ہیں اور یہ کئی بار طبع ہو چکی ہے ۔ پہلی بار یہ ۱۸۰۴ء میں کلکتے سے شائع ہوئی تھی ۔ اس کی دیگر تصنیفات یہ ہیں : جواہر التفسیر لتحفۃ الامیر، فارسی میں قرآن مجید کی تفسیر، ۸۹۹ھ میں علی شیر کی درخواست پر لکھی گئی، لیکن وہ اپنی مجوزہ چار جلدوں میں سے صرف ایک جلد مکمل کر سکا کیونکہ اسے اپنے سرپرست کے لیے ایک مختصر تفسیر لکھنے کی خاطر اس سے ہاتھ اٹھانا پڑا ۔ اس مختصر تفسیر کا نام مواہب علیہ رکھا گیا تھا لیکن عام طور پر یہ تفسیر حسینی کے نام سے مشہور ہے، روضۃ الشہداء، حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کی شہادت کی تاریخ (اس کے ملخص دو مجلس اور منتخب روضۃ الشہدا کے نام سے موجود ہیں)، بدائع الافکار فی صنائع الاشعار، ایک رسالہ مخزن الانشاء اصناف کلام ، صنائع و بدائع نیز معائب سخن پر (۹۰۷ھ میں تحریر ہوا اور حسین میرزا کے نام سے منتسب کیا گیا) اور بعد ازاں صحیفۂ شاہی، دونوں کتابیں خطوط نویسی اور انشا پر ہیں، قصص و آثار حاتم طائی (یا رسالۂ حاتمیہ) ۸۹۱ھ میں مکمل ہوئی ۔ اس میں حاتم طائی [رک بآں] کی کہانی بیان کی گئی ہے ۔ تحفۃ الصلوات، ۔۔۔ رسالۃ العلیۃ فی الاحادیث النبویۃ، ۔۔۔۔۔ جلال الدین رومی کی مثنوی کا انتخاب بعنوان لباب معنوی، اس کے اقتباسات کے مختصر مجموعے لب لباب کے نام سے مرتب کیے گئے ۔ مذکورۂ بالا تصنیفات میں سے کئی ایک کا ترجمہ ترکی میں اور اول الذکر دو کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے ۔

مآخذ : (۱) Schefer : *Chrest. Pers.*، ۱: ۱۹۰ ببعد؛ (۲) Ethé : *Grundriss. d. Iranischen Philologie*، ۵ : اشاریہ ، بذیل مادۂ حسین واعظ ؛ (۳) وہی مصنف : *Cat. Pers. Mss., India office*، اعداد ۲۱۸۸، ۲۶۸۰ .

(T. W. ARNOLD)

کاشی : (یاقوت میں قاشانی، قاشی ؛ ابن بطوطہ میں قشانی)، یہ نام جو ایران کے شہر کاشان [رک بآں] سے نکلا ہے، چینی Faience کی ان مربع یا مسدس تختیوں کو دیا جاتا ہے جو عمارتوں کی بیرونی یا اندرونی دیواروں کی آرائش میں استعمال ہوتی ہیں ۔

کاشی سازی کا شمار ایشیائے قریب کے قدیم ترین فنون میں ہوتا ہے (جس سے آشوری اور ان کے بعد ہخامنشی بھی واقف تھے) اور جو ایران میں ازمنۂ وسطیٰ تک اور جیسا کہ معلوم ہوتا ہے خاص طور پر شہر کاشان میں باقی رہا ۔ شاہان صفویہ کے زمانے سے لے کر عصر حاضر تک کی جدید ایران کی یادگار عمارتیں (جن میں سے نسبۃً پرانی عمارتیں کھنڈر ہو چکی ہیں) چینی کی ان تختیوں سے مزیّن ہیں ۔ ان میں رواجی بیل بوٹے نقش کیے گئے ہیں (کاشی کاری) جن میں زیادہ تر نیلا، فیروزی اور سبز رنگ استعمال ہوا ہے اور سرخ اور زرد رنگ ان سے کم تر ۔ ایسی تختیاں بہت کمیاب ہیں جن میں مختلف تصویروں کی مینت کاری کی گئی ہو اور اسی لیے ان کی سب سے زیادہ قدر کی جاتی ہے ۔

جب ایرانی کاریگر، جو شاید عیسائی تھے (بعض تختیوں یا چوکوں پر سریانی زبان کے کتبے کندہ ہیں) اس صنعت کو شہر دمشق میں لائے ، تو شامی ان چوکوں کو قاشانی (عربی ا=قاشان سے) کہنے لگے ۔ غالبًا اب سے صدی قبل یہ فن بالکل معدوم ہو گیا ۔ جس کارخانے میں یہ تیار ہوتے تھے، اس کے کھنڈر آج بھی باب شرق کے باہر نظر آتے ہیں ۔ ترکی میں ان

تختیوں کی نقل ازنیق اور کوتاهیه میں کی گئی - حال ہی میں کارخانۂ مذکور کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی گئی تھی ، لیکن موجودہ زمانے کا کام قدیم فن پاروں کے حسن کی کسی طرح بھی برابری نہیں کر سکتا - ایران میں بھی یہی حال ہے؛ وہاں آج کل قدیم زمانے کے خوبصورت نمونوں کی نقلیں تیار کی جاتی ہیں .

مآخذ : (۱) یاقوت : معجم ، طبع وُسٹنفلڈ ، ۴ : ۱۵؛ (۲) ابن بطّوطه، طبع پیرس، ۱ : ۱۵۴ ، ۲ : ۳۶ ، ۱۳۰ ، ۲۲۵ ، ۲۹۷ ؛ ۳ : ۷۹ ؛ (۳) Chardin : *Voyage* ، ایمسٹرڈم ۱۷۳۵ ؛ ۳ : ۴ ؛ (۴) Pétis de la Croix : *Journal* طبع Langlès ، *Relation de Dourry-Effendi* ، پیرس ۱۸۱۰ء ، ص ۱۳۴ ؛ (۵) Morier : *Deuxième Voyage* ، ص ۲۵ ؛ (۶) A. von Kremer : *Topographie von Damascus* ج ۲ (*Denkscher . d. K. Akad* . d. Wiss، وی‌انا ۱۸۵۵ء ، ۶ : ۹) .

(Cl . Huart)

* **الکاشی :** جمشید بن مسعود بن محمود بن غیاث الدین، ایک ایرانی جو سمرقند میں الغ بیگ کی رصدگاہ کا پہلا ناظم تھا اور جب اس فرمانروا نے جداول هیئت [زیج] تیار کیں تو وہ اس کا شریک کار تھا - علم هیئت اور ریاضی میں تحقیقات کرنے کے علاوہ اس نے طب کا مطالعہ بھی کیا تھا - اس نے تقریباً ۸۴۰ھ/۱۴۳۶-۱۴۳۷ء میں وفات پائی ہوگی - اس کی تصنیفات میں حسب ذیل باقی بچی ہیں : (۱) زیج خاقانی (خاقانی کی جداول)، فارسی میں قسطنطینیہ (ایاصوفیا) میں قلمی نسخہ موجود ہے - یہ زیج ایلخانی (تیار کردۂ نصیرالدین الطوسی) کا تکملہ ہے؛ (۲) مفتاح الحساب، برلن، لائیڈن، برٹش میوزیم، انڈیا آفس وغیرہ میں موجود ہے - اس کے دیباچے کا ترجمہ F. Woepoke نے کیا ہے (رک بہ مآخذ)؛ (۳) الرسالة الکمالیّة فیز المعروف بہ سُلّم السماء (آسمان کا زینہ)، اجسام فلکی کے حجم اور درمیانی فاصلے کے بارے میں ہے، آکسفرڈ، لائیڈن، انڈیا آفس میں موجود ہے؛ (۴) رسالة فی استخراج جیب درجة واحدة، وغیرہ (کسی درجے کے جیب زاویے کے تخمینے پر ایک مقالہ) قاہرہ میں موجود ہے - اس میں الکاشی نے تیسرے درجے کی ایک مساوات (equation) تخمینے کے ایک نہایت دلچسپ عمل سے حل کی ہے (دیکھیے نیچے Hankel کی تصنیف).

مآخذ : (۱) دیباچۂ مفتاح الحساب ، مخطوطۂ برلن دیکھیے؛ (۲) Ahlwardt : *Verzeichn*، ۵ : ۳۴۴ ؛ (۳) H. Hankel : *Zur Gesch. der Mathematic im Altertum u. Mittelalter*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ص ۲۸۹ ببعد؛ (۴) F. Woepcke : *Passages relat. á des sommes de séries de cubes*، روم ۱۸۶۴ء؛ (۵) H. Suter در *Abhandl. z. Gesch. der mathem. wissensch* : ۱۰ ، ۱۷۳ .

(H. Suter)

کَاظم خان شیدا : رک بہ پشتو. ⊗

کاظمی : وہ نام جو ٹیپو سلطان، فرمانروائے * میسور ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء تا ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ نے چاندی کے بنے ہوئے روپے کے سولھویں حصے (ایک آنہ) کو دیا تھا؛ یہ نام ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظمؑ کی یادگار کے طور پر رکھا گیا تھا .

(J. Allan)

کاظِمَیْن : عراق کے چار شہر مزارات ائمہ کی ⊗ وجہ سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں، نجف جہاں حضرت امیرالمؤمنین علیؓ بن ابو طالب کا روضہ ہے اور جو شیعوں کا علمی مرکز ہے؛ دوسرا کربلا جہاں حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضے اور بعض شہدائے کربلا کے مزارات ہیں؛ تیسرا شہر سامّرہ ہے جس میں امام علی النقی اور امام حسین العسکری [رک بآں] کے روضے ہیں؛ چوتھا کاظمین ہے جو اس مضمون میں زیر نظر ہے .

وجہ تسمیہ : اس شہر میں دو اماموں کے مزار یکجا ہیں - ایک امام موسیٰ الکاظمؓ م ۱۸۶ھ/۸۰۲ء

بن جعفرؑ دوسرے امام الجواد محمد م ۲۱۹ھ/۸۳۴ء بن علی بن موسیٰ - چنانچہ اس شہر کا نام "کاظمین" دو کاظم یا "الجوادین" دو جواد ہو گیا، جیسے ظہرین، مغربین وغیرہ - دراصل یہ نام روضے کا تھا، لیکن اب شہر کا یہی نام پڑ چکا ہے اور شہر کے سٹیشن کا نام "الجوادین" رکھا گیا ہے۔ اسی طرح اندرون حرم کتب خانہ ہبۃ الدین شہرستانی کا نام بھی "مکتبۃ الجوادین" ہے - یہ شہر آبادی کے بعد مشہد الکاظم، کاظمیہ اور پھر کاظمین کہلایا - بغداد سے شمال مغرب کی طرف کم و بیش دس کیلومیٹر اور دریاے دجلہ کے دائیں کنارے سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے (عماد الدین : مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲، ص ۳۷۷) دجلے کا پل "کرخ" عبور کرتے ہی کاظمین کی حد شروع ہو جاتی ہے - یہاں کھجوروں کے باغ، مختلف پھلوں کے درخت اور خوشنما سبزہ زار ہیں موسم یہاں کا خوش گوار ہے - عراق کا مشہور دریا قریب ہے - اس کی ایک نہر شہر کی زرخیز زمین کو سیراب کرتی ہے - زیارت گاہ ہونے کی وجہ سے آبادی بہت زیادہ ہے - بڑے بڑے بازار، اچھے اچھے مکان، مسافر خانے، مہمان خانے، ہوٹل، چاے خانے دکانیں اور ہر قسم کا سامان تجارت فراوانی سے ملتا ہے - بغداد کے راستے آنے والے قافلے اور زائرین پہلے کاظمین آتے ہیں پھر یہاں سے کربلا اور نجف کا رخ کرتے ہیں - یہاں ہمیشہ زائرین کا مجمع رہتا ہے - لیکن خصوصیت سے محرم، صفر، رجب، ۱۵ شعبان، رمضان، عیدالفطر، عیدالاضحی میں خاص خاص دن اور اصطلاحاً "مخصوصی" کے دنوں میں یہاں لاکھ دو لاکھ زائر جمع ہوتے ہیں اور قیام کے لیے جگہ ملنا مشکل ہوتی ہے .

پاکستانیوں کے بعض مخصوص مہمان خانے بھی ہیں - اسی طرح کویت، بحرین، حجاز، لبنان، شام، پاکستان، ہندوستان، افغانستان اور افریقہ کے لوگوں نے بھی کچھ نہ کچھ مکانات مخصوص کر رکھے ہیں - عموماً یہاں کے خدام مہمان داری کے فرائض انجام دیتے ہیں - لیکن سب سے زیادہ اہمیت عراقیوں اور ایرانیوں کو حاصل ہے، عراق یہاں کے قدیم باشندے ہیں اور ایرانی قرب مکانی اور صدیوں پرانے مسلسل روابط دینی کی وجہ سے یہاں رہتے ہیں، ان کے مکانات و آثار بھی سب سے زیادہ ہیں - بلکہ درحقیقت یہ روضہ تو صرف انہیں کی عقیدت و دولت کا تعمیر کردہ ہے .

تاریخی نقطۂ نظر سے کاظمین کی آبادی کا واقعہ عجیب ہے، جب خلیفہ ابو جعفر المنصور نے بغداد تعمیر کرایا اور دارالخلافہ یہاں منتقل ہوا تو ۱۵۰ھ میں پہلی موت خلیفہ کے بڑے لڑکے جعفر کی ہوئی - اس وقت دریا پار ایک قریہ شونیز یا شونیزی صغیر یہاں آباد تھا - اس قریے کا قبرستان شہزادے کے لیے پسند کیا گیا اور مسجد کے قریب اسے دفن کیا گیا - قبر پر موزوں عمارت و قبہ بنا، مقبرے کی دیکھ بھال، قرآن خوانی اور دوسرے امور خیر کے لیے کچھ ملازم بھی رکھے گئے - قبر پر فاتحہ کے لیے شاہی خاندان اور متوسلین کی آمد و رفت شروع ہو گئی (عمادالدین : مجموعۂ زندگی چہاردہ معصوم، ص ۳۷۸؛ میرزا عباس فیض : تاریخ کاظمین، ص ۱۸ .

جعفر کی قبر کے بعد دوسرے مشاہیر بھی مرنے کے بعد یہاں دفن کیے گئے، خاندان نوفل کے سردار عیسیٰ بن عبداللہ اور مشہور عالم ابن الماحسون، ابو عبداللہ عبدالعزیز بن عبداللہ (م ۱۶۴ھ) (تاریخ کاظمین، ص ۱۸) لیکن قبرستان شونیزی کی عظمت کا دن وہ تھا جب ۱۸۳ھ میں امام الکاظم موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی السجاد علیہم السلام کا تابوت جسے بغداد سے ہارون الرشید کے چچا سلیمان بن ابی جعفر المنصور نے اپنے قبضے میں لیا اور شاہانہ احترام کے ساتھ وہ تابوت بغداد سے یہاں لا کر امام کو مسجد کے قریب سپرد لحد کیا (مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ص ۳۸، نیز رک بہ موسیٰ الکاظم) - سلیمان سلطنت کا نامور رکن،

بنی عباس کا بزرگ مرتبہ شہزادہ تھا، وہ دمشق و بصرہ کا والی رہ چکا تھا، اس کے بڑھاپے اور اعزاز کے دن تھے (سلیمان ۱۹۹ھ میں فوت ہوا) ۔ اس نے امام کی قبر پر عمارت اور عمارات پر قبہ تعمیر کرایا (باقر شریف القرشی: حیاۃ الامام موسی بن جعفر، ج ۲، ص ۴۸۵) امام کے وہ عقیدت مند جو بغداد میں رہتے تھے اسی وقت سے زیارت کو آنے لگے ۔

امام علی رضاؑ اور ان کے بعد امام محمد تقیؑ بھی لوگوں سے زیارت مزار امام موسی الکاظمؑ کی فضیلت بیان کرتے رہے ۔ عموماً لوگ زیارت مدینہ، نجف اور کربلا کے لیے آتے جاتے تھے۔ ائمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور دوسرے ائمۂ معصومین کی زیارت کے آداب بتائے تھے۔ اب اس مزار کی زیارت کے ثواب و آداب بھی بتائے جانے لگے اور لوگ دور دراز سے یہاں حاضر ہونے لگے ۔ زیارت و آداب زیارت کے لیے دیکھیے، مجلسی: تحفۃ الزائر، ص ۳۶۳؛ عباس قمی: مفاتیح الجنان، ص ۴۷۵ ۔

امام علیہ السلام کے مزار کی وجہ سے اس قبرستان کا نام "مقابر قریش" پھر مشہد الکاظم اور اس کے بعد کاظمیہ ہوگیا (تاریخ کاظمین، ص ۱۹) سنہ ۱۹۸ھ/۸۱۳ء میں محمد امین بھی مقابر قریش میں دفن ہوا ۔ اس کا مقبرہ بھی تعمیر ہوا ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ۲۱۶ھ/۸۳۱ء میں مامون کی والدہ زبیدہ بھی یہاں سپرد لحد ہوئی (بحث کے لیے وہی کتاب، ص ۱۹) ۔

۲۲۰ھ/۸۳۵ء میں امام موسی الکاظم کے پوتے امام الجواد، محمد بن علی الرضا علیہ السلام [رک بآں] یہیں دفن ہوئے اور ام الفضل بنت مامون الرشید نے اس مزار پر عمارت و قبہ بنوایا (تاریخ کاظمین، ص ۲۱) نویں امام کے لیے بھی سادات و علویین و دوستداران اہل بیت کا آنا جانا بڑھا۔ ان کے زیارت مشہد کے ثواب بھی حدیثوں میں بیان کیے گئے (تحفۃ الزائر، ص ۳۶۳؛ مفاتیح الجنان، ص ۴۷۵) ۔ کچھ عرصے تک تو اس جگہ کو بھی مقابر قریش یا مشہد الکاظم ہی کہا جاتا رہا، لیکن آہستہ آہستہ دونوں اماموں کی اہمیت کے پیش نظر دونوں کے ناموں کی ترکیب سے نام پڑا ۔ چونکہ امام الکاظمؑ بزرگ تھے، ان کی لحد بھی پہلے بنی تھی، لہٰذا کاظمین کہنا اچھا معلوم ہوا ۔

مشہد الکاظم والجواد یا کاظمین کی تعمیر: تاریخ و کتب زیارات و احادیث ائمۂ اہل بیت (کتاب المزار از ابن قولویہ اور جامع الاخبار و بحار الانوار) سے دونوں اماموں کے دو الگ الگ مزاروں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ۔ چونکہ امام موسی کاظمؑ، امام محمد الجوادؑ کے جد بزرگوار تھے اس لیے رسماً لوگ پہلے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور دعائیں کرتے تھے اور دعاؤں کی مقبولیت کے چرچے ہونے لگے ۔ قاضی ابو محمد حسن بن الحسین الجلال کی روایت ہے کہ مجھے جب بھی کوئی مشکل پیش آئی ہے، میں امام موسی بن جعفر علیہما السلام کے آستانے پر جا کر ان سے توسل اختیار کرکے خدا سے دعا کرتا ہوں؛ میری مشکل آسان ہو جاتی ہے (ابن الخطیب: تاریخ بغداد، ج ۱، ص ۱۳۰؛ مفاتیح الجنان ۴۷۵، تاریخ کاظمین، ص ۲۴) اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات ہیں ۔ جن کی وجہ سے عراق میں امام موسی کاظمؑ کا لقب ہی "باب الحوائج" زبان زد ہے ۔ یہ شہرت و عظمت شروع ہی سے ہو گئی تھی ۔ اس لیے حاجت مند بکثرت آتے اور روضے پر مجمع روز بروز بڑھتا رہتا تھا ۔

تیسری صدی ہجری میں بغداد کے ایک طالع آزما خاندان "آل نو بخت" نے عروج حاصل کر لیا ۔ یہ لوگ اماموں سے خاص عقیدت رکھتے تھے لہٰذا مشہد الکاظم و مشہد الجواد کی تعمیر و تزئین میں دوسرا حصہ ان لوگوں کا ہے (تاریخ کاظمین، ص ۳۰) ان کے بعد بویہی خاندان نے اقتدار حاصل کیا، ان میں معزالدولہ اور عضدالدولہ نہ صرف شیعہ تھے، بلکہ انہیں تعمیرات

سے خاص شغف تھا ۔ ان کی عقیدت نے مدینۂ منورہ کی تعمیر کروائی (عمدة الاخبار فی مدینة المختار، ص ۱۸۴، قاهره)، کربلا و نجف کے مزاروں کو از سرنو بنوایا اور وقف کرائے [رک بہ کربلا] نیز تاریخ النجف ماضیها و حاضرها) .

۳۵۳ھ میں بغداد کی مسجدوں کو رونق دی ۔ عاشور کے روز ماتم سید الشہداء کے لیے جلوس نکلوائے ۔ ظاہر ہے کہ ان جلوسوں کا ایک مرکز کاظمیہ قرار پا گیا ۔ عضدالدولہ نے ۳۷۲ھ کے بعد کربلا و نجف کی زیارت کی اور وہاں کے روضوں کی از سرنو تعمیر کا حکم دیا ۔ تعمیر کے بعد قیمتی ہدیوں اور اوقاف کی خدمت بجا لایا (محمد حسن : مدینة الحسین، ص ۱۰۶، نیز رک بہ کربلا) ۔ اس کی ان خدمتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بغداد سے قریب کاظمین کی تعمیر و آرائش و نگہداشت سے غفلت نہ برتی ہوگی ۔ ۳۶۹ھ میں بغداد کے عظیم المرتبت عالم اور شیخ مفید کے استاد جناب ابوالقاسم ابن قولویہ نے رحلت کی تو انہیں مشہد الکاظم میں دفن کیا گیا .

۴۰۰ھ سلطان الدولہ بویہی کا وزیر کربلا کی زیارت سے مشرف ہوا اور اس نے وہاں قابل ذکر تعمیرات کا اہتمام کیا ۔ ممکن ہے وہ کاظمین بھی آیا ہو اور یہاں کی تعمیرات کی اصلاح کرائی ہو ۔ ۴۱۳ھ میں شیخ مفید کے انتقال پر بویہیوں نے اپنے مذہبی عالم کا جنازہ بڑی شان سے اٹھایا اور انہیں مشہد الکاظم میں دفن کیا ۔ ۴۲۳ھ میں قم کا ایک اہم قافلہ زیارات مزارات ائمہ کے لیے آیا ۔ ۴۳۱ھ میں جلال الدولہ بویہی بغداد سے کربلا و نجف کی زیارت کو گیا، بلاشبہہ اس نے کاظمین میں بھی حاضری دی ہوگی ۔ اس دور میں بویہیوں کے زوال اور سلجوقیوں کے عروج، فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ کا تذکرہ ابن الاثیر نے قلم بند کیا ہے ۔ ان حالات نے کرخ و کاظمین کے لوگوں کو ترک وطن پر مجبور کیا اور شیخ مفید و سید مرتضی کے جانشین محدث و فقیہ بزرگ شیخ ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی نے ۴۴۸ھ میں نجف کی طرف ہجرت کی ۔ اس سے فرقۂ امامیہ کا مرکز علم و تدریس بغداد سے منتقل ہو گیا .

سلجوقیوں کے تسلط اور بغداد میں امن کی بحالی ہوئی تو کاظمین بھی رفتہ رفتہ زائرین کے مجمع سے آباد ہونے لگا ۔ کہتے ہیں کہ ۴۶۶ھ میں شرف الدولہ نے ایک ہزار دینار کے خرچ سے شہر پناہ اور دوسری عمارتیں بنوائیں (ابن الاثیر، سال ۴۶۶ھ) .

۴۷۹ھ میں ملک شاہ سلجوقی نے زیارات ائمہ کے لیے سفر کیا اور مزاروں کی ترمیم و تجدید کے احکام دیے (رک بہ کربلا؛ نیز مدینة الحسین، ص ۱۱۴، ۱۲۰) .

خلیفۂ عباسی کی اہم تعمیریں: بویہیوں کے بعد ناصر لدین اللہ الخلیفہ اور ابن علقمی نے کاظمین کی ترقی و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ۔ شہر پناہ کے علاوہ عمارت مشہدین، مہمان خانہ ۶۰۴ھ میں اور ۶۰۸ھ میں شیعہ سنی علوم و عقائد کا بڑا مدرسہ اور ایک یتیم خانہ بنوا کر کاظمین کو نئی زندگی بخشی، لیکن پانچ سال بعد دجلے نے اس رونق پر پانی پھیر دیا ۔ اس مرتبہ سیلاب کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ امام احمد بن حنبلؒ کا مزار دریا برد ہو گیا اور کاظمین کی تمام عمارتیں منہدم ہو گئیں ۔ پانی اترتے ہی ابن علقمی نے پھر تعمیرات کا کام شروع کر دیا اور ۶۱۴ھ میں شہر اور مزار پھر تیار ہو گیا ۔

۶۲۲ھ میں شہر کو آگ نے گھیر لیا ۔ کتب خانے اور مدرسے، روضوں کی عمارتیں اور اس کا سامان ضائع ہوا اور ناصر لدین اللہ کا قیمتی صندوق بھی زد میں آیا ۔ اس نقصان کی تلافی کے لیے الظاہر باللہ نے حکم جاری کر دیا اور مؤید الدین علقمی نے پھر تعمیرات کا آغاز کیا ۔ الظاہر باللہ نے رحلت کی تو مستنصر باللہ

اخراجات کا کفیل ہوا ۔ اب کی مرتبہ دجلے کا پل اور شہر کا بند بھی نیا بنایا گیا ۔ روضوں کی عمارتیں بھی مستحکم ہوئیں اور غالباً ۶۲۴ھ میں یہ کام ختم ہوا کیونکہ اب تک قیمتی لکڑی کا وہ نفیس منبت و طلا کار صندوق کاظمین میں موجود ہے جس پر خطِ کوفی جلی میں یہ عبارت تحریر ہے :

صندوق خاتم : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، ھٰذا ضریح الامام ابی الحسن، موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن ابی عبداللہ الحسین بن علی بن ابیطالب علیہم السلام .

پھر اسی خوبصورت نقش و نگار اور طلائی حاشیوں پر خط ثلث میں سونے سے لکھا ہے :

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا [الآیہ] ھذا ماتقرب الی اللہ تعالی بعملہٗ، خلیفتہ فی ارضہ ونائبہ فی خلقہ سیدنا و مولانا امام المسلمین المفروض الطاعۃ علی الخلق اجمعین ابوجعفر المنصور المستنصر باللہ امیرالمومنین ثبت اللہ دعوتہ ۔ فی سنۃ ستمائۃ و اربع و عشرون .

فارسی اصطلاح میں اس ساخت کے بکس کو ''صندوق خاتم'' کہتے ہیں ۔ تعویذ قبر پر صندوق خاتم تھا، اس کے گرد شمعدان ۔ زمین پر قیمتی فرش، دیواروں پر حریر و دیبا کے پردے، بالائے سقف مخروطی گنبد و مینار تھا جیسے زمرد خاتون اور زبیدہ خاتون کے مقبروں کے آثار سے اندازہ لگایا گیا ہے ۔ امام موسیٰ کاظم کے روضے کے قریب امام محمد الجواد کا مزار بھی اسی شان سے تعمیر ہوا تھا ۔ ان مزاروں کے ادھر ادھر مسجد، مدرسے، علما کے گھر، سادات کے مکان، متولیوں اور خادموں کے مسکن اور مسافروں کے لیے سرائیں تھیں ۔ سلاطین، خلفا ، امرا زیارت کو آتے تو درھم و دینار کے انبار ساتھ لاتے اور نذرو ھدیہ و امور خیر میں صرف کرتے، سونے چاندی کی قندیلیں اور نادر و نایاب آلات روضوں پر رکھتے (رک بہ، کربلا) ۔ نقیب الاشراف ان تمام معاملات کا نگران اعلیٰ ہوتا تھا.

کاظمین میں عباسی خلیفہ کی حاضری : کاظمین بغداد سے قریب تھا لہٰذا خلفا و وزرا کی آمد و رفت کوئی خاص بات نہ تھی ۔ مؤرخ بھی اسے عام بات سمجھ کر نہ لکھ سکے ۔ اتفاق سے دو ایک خلفا کے بارے میں کچھ تذکرے قلم بند ہو گئے ہیں ، مثلاً خود المستنصر باللہ ۳ رجب ۶۳۴ھ کو شاھانہ تزک و احتشام کے ساتھ آیا، مزاروں کی تعمیر کا معائنہ کیا، زیارت کی، نذرانہ چڑھایا اور نقیب الاشراف ابو عبداللہ حسین القاسمی کو شاھی نوازشات سے مفتخر کیا اور تین ھزار دینار کاظمین و نجف کے علوّیین کی خدمت کے لیے پیش کرکے واپس گیا (تاریخ کاظمین، ص ۱۱۳).

۶۴۱ھ میں المستعصم باللہ خلیفہ ہوا تو مؤیدالدین ابن علقمی کے ساتھ بغداد سے زیارت کاظمین کے لیے آیا ۔ راستے میں سخت بارش ہوئی لیکن شاھی جلوس نہ رکا اور بھیگتا ہوا قافلہ مشہد الکاظم پر حاضر ہوا .

۶۴۶ھ میں سیلاب نے پھر کاظمین کا رخ کیا ۔ ۶۴۷ھ میں المستعصم نے شہر و مشہد کو پھر نیا کر دیا اور ۱۱ ذی القعدہ کو تکمیل تعمیر کے ساتھ دونوں قبّوں پر بنی عباس کا شاھی اعزازی نشان نصب کیا گیا (تاریخ بغداد، ص ۱۱۸) .

کاظمین کی تعمیر میں بنی عباس کا یہ آخری حصہ تھا ۔ اس تعمیر کا چشم دید بیان وہ ہے جسے مشہور ادیب و مصنف یعنی نور الدین علی بن موسیٰ بن سعید المغربی (م ۶۷۳ھ) مؤلف کنوز المطالب فی اخبار آل ابی طالب، نے لکھا ہے ''وَلَمَّا وصلنا اِلٰی باب مشہد موسیٰ ابن جعفر تلقانا من خُدَّامہ من اَنْزَلنا علٰی بعد و وجدنا فی الطریق الیہ قبرا مُتَطَمِّساً یُدَاسُ فسئلنا عنہ، فقیل ھذا قبر الحسن بن الحجاج الشاعر، اوصی ان یدفن فی طریق ھٰذا المشہد لِیُدَاسَ باقدام زوارہ.

فَلَمَّا وصلنا الی الباب تلقانا الزُّوار من ولد الکاظم، فامرونا بنزع الاخفاف .

فلمّا دخلنا رأینا من الجمع المحتفل و اوانی الذهب و الفضة والستور و الطیب ملک ابصارنا و لما حللنا بالروضة التی فیها قبرالکاظم رأینا قبرا آخر ذکروا انه قبر حفیده محمد الجواد بن علی الرضا ابن موسی الکاظم و فی ذلک المشهد مایطول ذکره و یهول امره".

اور جب هم "شهر مشهد موسیٰ ابن جعفر" میں پهنچے تو خدام نے همارا استقبال کیا اور هدیں دور هی سے سواریوں سے اتار لیا، هم نے راستےمیں ایک بےنشان سی قبر دیکهی جو پیروں تلےروندی جاتی تهی، پوچهنے پر معلوم هوا که یه حسین ابن الحجاج شاعر(م ۳۹۱ھ) کی قبر هے جس نے وصیت کی تهی که اسے اس بارگاه کے راستے میں دفن کیا جائے تاکه زائرین کے قدم اس پر پڑیں .

هم دروازۂ مزار پر پهنچے تو سادات کاظمی نے همارا استقبال کیا اور هم سے جوتے اتارنے کی فرمائش کی - هم اندر داخل هوے تو بهت بڑا مجمع وهاں موجود تها، سونے چاندی کے آلات، پردے اور عطر و خوشبو نے همارے حواس پر غلبه کر لیا - هم نے روضے میں امام موسی الکاظم کی قبر کے علاوه ان کے پوتے امام محمد الجواد کی قبر بهی دیکهی - اس مزار میں جو کچھ پایا جاتا هے اس کی تفصیل طویل اور اهم هے (تاریخ کاظمی، ص ۱۱۴) .

اس بیان سے کاظمین کے خدام، زائرین، آداب زیارت اور شان عمارت کا بڑی حد تک نقشه سامنے آ جاتا هے - اسی زمانے کے ایک علوی عالم رضی الدین علی بن موسیٰ بن طاؤس (م ۶۶۴ھ) حلے سے کاظمین آئے اور یهاں قیام کیا - ان کے اصل الفاظ هیں "وتوجهت الی مشهد مولانا الکاظم واقمت به" (کشف المحجة، ص ۲۱۱) .

کاظمین کا دوسرا دور : ۶۵۶ھ میں هلاگو نے بغداد پر حمله کیا تو اس طوفان میں کاظمین بهی تاراج هوا، لیکن امن امان قائم هوتے هی علاء الدین جوینی و نصیر الدین طوسی نے شهر و مزار، قبه و بارگاه کی گزشته شان و شوکت کو بحال کیا اور جب یه دونوں فوت هوے تو حسب خواهش اسی قبرستان میں دفن کیے گئے .

خواجه علاءالدین جوینی نے ۱۴ ذی الحجة ۶۷۱ھ کو رحلت کی ان کا مقبره غربی رواق میں اب تک موجود هے (تاریخ کاظمین، ص ۱۱۹) .

خواجه نصیر الدین الطوسی نے ۲۸ ذی الحجة ۶۷۲ھ کو رحلت کی اور کاظمین میں دفن هوے - ان کی قبر بهی موجود و معلوم هے .

یاقوت نےمعجم البلدان میں ۶۵۶ھ کے بعد کاظمین کو بڑا آباد شهر اور فصیل بند لکها هے - ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) نے احوال امام موسیٰ الکاظم میں لکها هے "و قبره هناک مشهور یزار و علیه مشهد عظیم فیه من قنادیل الذهب و الفضة و انواع الآلات و الفرش مالا یحد و هو فی جانب الغربی "وهاں ان کی قبر مشهور هے، زیارت کی جاتی هے اس پر عظیم الشان روضه بنا هوا هے، جس میں سونے، چاندی کی قندیلیں اور طرح طرح کے سامان اور فرش و فروش کی عظمت کا اندازه نهیں لگایا جا سکتا - یه مزار شهر کے مغربی حصّے میں هے" .

۷۲۵ھ/۱۳۲۶ء کے سیلاب کے ایک سال بعد سلطان ابو سعید بهادر خان ابن خدا بنده نے اس نقصان کی تلافی کی - اسی زمانے میں ابن بطوطه نے کاظمین کی زیارت کی اور اس کے دو نقره کوب صندوقوں کا خاص طور پر ذکر لکها (مجموعۂ زندگانیِ چهارده معصوم، ص ۳۸۷) - ۷۳۶ھ میں صلاح الدین خلیل ابن ایبک نے لکها که "شهر باقاعده چهار دیواری کے اندر هے اور تمام ضروریات زندگی دستیاب هیں" (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۰) .

۷۶۹ھ میں خواجه مرجان نے کربلا و نجف کے ساتھ کاظمین کی اصلاح و تعمیر کے علاوه ایک مدرسے کی بهی تاسیس کی جس کے آثار اب تک باقی هیں .

سلطان حسن بن ادریس جلائری (م ۷۵۷ھ) نے دونوں مزاروں پر دو نفیس صندوق، اور عمارت پر دو گنبد اور دو مینار بنوائے (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۱؛ مدینۃ الحسین، ص ۱۳۴)۔

ساتویں صدی سے نویں صدی کے آخر تک کاظمین کی شان و شوکت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پہلے یہ عمارت عراقی طرز کی تھی اب اس میں ترکوں کے فن تعمیر کی نمود ہوئی۔

کاظمین کا تیسرا دور: دسویں صدی کے ربع اول میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے بغداد کو فتح کیا اور ۹۲۶ھ/ ۱۵۱۹ء میں کاظمین کی خستگی کے پیش نظر تمام عمارت کی نئے نقشے پر تعمیر کا حکم دیا، جس میں وسطی ایوان، ایوان کے گرد رواق، بڑی بڑی محرابیں، مقرنس چھتیں، رنگین نقشی کاشی کاریاں، آیات و احادیث، اسمائے الٰہیہ، چہاردہ معصوم کے نام، اشعار، تاریخیں اور آئینہ کاری، سامان آرائش، قالین اور دوسرے لوازم مہیا کیے۔ عمارت پر دو کاشی کار گنبد، دو مینار بنائے، بلند و بالا دیواریں اور شاندار نقرہ پوش دروازے نصب کیے۔ اندرون ایوان قبر پر اس عمارت کے کچھ حصے محفوظ ہیں اور ان پر ۹۲۶ھ و ۹۳۵ھ سنین اور شاہ اسمٰعیل و شاہ خدا بندۂ صفوی کے نام درج ہیں۔

جامع صفوی کاظمین: شاہ خدا بندہ نے نذر و نیاز کے علاوہ، روضے کی کہنہ مسجد کی جگہ بڑی شاندار ۷۲ ستونوں کی بلند و بالا، کاشی کار اور کتبوں سے آراستہ مسجد و محراب بنوائی۔

منبر سلیمانی عثمانی: ۹۴۰ھ میں بغداد پر صفویوں کا قبضہ ختم ہوا اور عثمانی خلیفہ سلطان سلیمان کربلا و نجف و کاظمین و سامرے کی زیارت کے لیے آئے۔ انھوں نے ہر روضے کی خدمت کی۔ کاظمین کی جامع مسجد کا خشتی منبر بنوایا جس کی تاریخ تکمیل کاشی رنگ و روغن میں ۹۴۱ھ تحریر ہے۔ ترکی طرز کا یہ منبر اسی انداز کا ہے جیسے مسجد الحرام میں سنگ مرمر کا۔ مینار اسی بادشاہ نے نذر کیا تھا، جس کے دروازے کی پیشانی پر "انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا ہوا ہے۔

مینار سلیمی: ترکی کے سلطان سلیم ثانی کے عہد میں والی بغداد سلیمان پاشا نے تعمیر و اصلاح عمارت کے ساتھ شمال شرقی زاویے کا مینار کو چھت کی سطح سے بلند تر کیا جس کی تاریخ اب تک درج ہے (۹۷۸ھ)۔

جہاں تک مینار کا تعلق ہے اس کی تعمیر ۱۰۳۵ھ میں شاہ صفی صفوی نے کرائی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نے نہ صرف میناروں کو بلند کیا بلکہ عمارت کے چاروں گوشوں پر چار مینار بنوائے۔ (تاریخ ص ۱۲۳)۔ ۱۲۱۱ھ میں محمد شاہ قاجار نے ان میناروں کو خوبصورت کیا، ان کے بالائی حصے کو چاندی سونے کی اینٹوں سے نقرئی و طلائی کر دیا۔ اب یہ مینار گول ہو کر بلند ہوتے اور بالائی حصے میں محراب دار چھوٹے چھوٹے مدور حلقے میں برج نما صورت اختیار کر لیتے ہیں جو اوپر سے مسقف، پھر ذرا پتلا ہوتا ہے اور تقریباً تین فٹ کی اونچائی پر کمر کھی ٹوپی اور کلس پر ختم ہوتا ہے۔ اس کلس اور گمزی میناروں کے پورے گلدستوں پر ۱۲۱۱ھ میں پہلے قاجار بادشاہ نے طلائی چادریں چڑھوا دیں۔

گنبد: یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس روضے کی خصوصیت ہمیشہ سے یہ چلی آتی ہے کہ میناروں کے درمیان۔ چھت کے اوپر دو گنبد تھے، جو اب تک کاشی کار تھے، ان کے کلس اب سنہری ہو گئے اور محمد شاہ قاجار نے دونوں گنبدوں اور کلسوں کو طلائی کر دیا۔

ضریح: صدیوں سے ائمہ کی قبروں پر قیمتی لکڑی کے خوبصورت اور منقش صندوق رکھے جاتے تھے، جو شمعوں کے گرنے یا بخور کی انگیٹھیوں کی آگ سے متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ ۱۰۳۳ھ میں جب شاہ عباس بزرگ دوسری مرتبہ زیارت کے لیے نجف سے کربلا اور کربلا سے کاظمین پیدل حاضر ہوئے انھوں نے بہت

سے ھدایا و انتظامات کے ساتھ ساتھ دو نفیس لکڑی کے "صندوق خاتم" پرانے صندوق مستنصری کے اوپر رکھے۔ اور ان کی حفاظت کے لیے، جالی دار، نقرئی وطلائی نقش و نگار سے آراستہ چوکور فولادی جنگلا نصب کیا یہ جنگلا ضریح کے نام سے یاد کیا جاتا ھے۔ یہ ضریح طول میں چھے میٹر اور عرض میں تقریباً چار میٹر ھے اور اب تک موجود ھے (مجموعۂ زندگانی چہار دہ معصوم، ۲ : ۳۸۳)۔

۱۳۸۳ھ میں ناصر الدین شاہ قاجار نے فولادی ضریح کے گرد ایک اس سے بڑی نقرئی منقش ضریح نصب کی۔

طلا کاری: اب تک کاظمین کے در و دیوار اور سقف و ایوان پر عموماً طلائی نقش و نگار ھوا کرتے تھے یا زیادہ سے زیادہ کلس پر سونے کا پانی چڑھا دیا جاتا تھا، صفوی، افشاری اور قاجار بادشاھوں نے جہاں قیمتی کاشی کاری کی طرف خاص توجہ دی، اسی طرح عمارت کے نمایاں حصوں پر سونے کا پانی چڑھایا۔ میناروں، گنبدوں، دروازوں اور ایوانوں پر سیکڑوں سیر سونے کے پترے اور اینٹیں لگوا دیں۔

۱۲۱۱ھ میں محمد شاہ قاجار نے دونوں بڑے بڑے گنبدوں کو از اول تا آخر سونے کے پتروں سے مطلا کرکے عمارت کی نئی شان اجاگر کی، ان گنبدوں کی کرسی پر طلائی حرفوں میں آیات، احادیث، سلام، اشعار اور تاریخ بڑی خوبصورتی سے تحریر ھے۔ محمد شاہ نے اندرون ایوان کے خشتی فرش کی جگہ سنگ مرمر کی سلیں لگائیں اور دیواروں کے زیریں حصوں پر بھی مرمر کی موٹی موٹی سلیں چاروں طرف لگوائیں۔ صحن کا جنوب مغربی حصہ کچھ تنگ تھا، اس نے ملحقہ مکان بڑی بڑی قیمتیں ادا کرکے خریدے اور صحن کو وسعت دی۔ فرش کی مزید مرمت و اضافہ ۱۲۸۰ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے کرایا۔ اس کے فوراً بعد والیِ بغداد مدحت پاشا نے اندرونی حصے میں طلا کاری کروائی۔ پھر کچھ رؤسا و تجار نے سونے کے پترے چڑھائے۔

ایوان طلا: ۱۲۸۵ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے برآمدے کے اندر ایوان کے داخلے والے در قبلہ کے بیرونی حصے پر بہت اونچا اور چوڑا در بنوایا اور اس کے اندر اور باھر نصف بالائی حصے اور روکار اور اندرونی دروازے کے بالائی حصے پر سونے کا نفیس پانی چڑھوایا۔ ایوان طلائی، دونوں گنبدوں چاروں میناروں اور دو ساعتی میناروں کی گمزیان دن کی دھوپ اور رات کو بجلی کی روشنی میں چکا چوند پیدا کرتی ھیں اور عجب نظر افروز جلوے پھیلاتی ھیں۔ یوں تو نجف، کربلا اور مشہد ھر جگہ گنبد و مینار اور طلائی ایوان ھیں مگر طلا کاری کا جو منظر کاظمین میں ھے وہ کہیں نہیں۔

آئینہ کاری: گزشتہ صدیوں میں کاظمین کے سقف اور در و دیوار پر مقرنس کاری، رنگا رنگی اور آئینہ بندی تھی، مگر آئینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ھندسی ترکیبوں سے شہد کے چھتوں کے مانند بناوٹ اور عجیب قسم کی سجاوٹ سے چسپاں کرنے کی صنعت نے ایوان، سقف اور در و بام کو نئی آب و تاب بخشی ھے۔ ۱۲۳۱ھ میں فتح علی شاہ قاجار نے شاہ اسمٰعیل صفوی کی کاشی کاری کے بجائے بڑے پیمانے پر اندرون ایوان اور بالائی حصوں کو آئینہ کاری سے مزین کیا۔ ۱۲۸۰ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے اور زیادہ آئینہ کاری کرائی۔ پھر فرھاد میرزا اور دوسرے مخیر عقیدت مندوں نے اس میں اضافے کیے اور اس وقت ایوان میں جب قمقمے، ٹیوب اور مرکری بلب روشن ھوتے ھیں اور جھاڑ فانوسوں کے رنگین فانوس چمک کر ان آئینوں میں عکس ڈالتے ھیں تو فضا میں ستارے ھی ستارے دکھائی دیتے ھیں اور بام و در چاندی، سونے اور رنگین روغنی اینٹوں سے آب و تاب پیدا کرتے ھیں۔

کاظمین کی موجودہ تعمیر: ۱۲۹۸ھ میں، اعتماد الدولہ فرھاد میرزا ابن عباس میرزا (م ۱۳۰۵ھ)

نے بڑے جذب و شوق سے عمارت کا نیا نقشہ بنوایا ، بوسیدہ عمارتوں کو گرا کر نئی بنیادوں کو استوار کیا، پختہ تعمیرات کو کاشی، آئینہ، سونا، چاندی، آیات و احادیث و اشعار سے مزین کیا، پانچ سال تک شہزادہ دن رات کام کی نگرانی میں مصروف رہا ۔ یہ پوری عمارت اب تک بھی نئی تعمیر نظر آتی ہے ۔ یہ تعمیر نجف و کربلا و مشہد اور دوسرے عتبات عالیات کے بعد ہوئی تھی اس لیے اس کا صحن و ایوان، غلام گردش اور دالان، برآمدے اور رواق، حرم اور مزار سب سے زیادہ کشادہ، روشن، وسیع اور ہندسی ہیں .

کم و بیش میل دو میل سے چاروں مینار اور ان کے وسط میں متناسب گول لمبی گردنی بلندی کے یکساں دو پیازی گنبد ان پر بڑے بڑے کاس نظر آتے ہیں ۔ شارع کاظمین ایک گول باغیچے پر ختم ہوتی ہے، سامنے باب القبلہ جس کے منقش چوبی دروازے کی چوکھٹ بازو، بالائی محراب و در اور اوپر مربع مینار پر چار رخوں والی گھڑی، اس کے اوپر چھوٹی سی طلائی گول گمزی اور کلغی ہے ۔ دروازے پر آئیے تو سامنے صحن، ایوان طلا، رواق کا بھاری بھرکم سنہری روپہلی دروازہ اور اندرونی ایوان کے وسط میں بڑی سی جالی دار چاندی سونے کی ضریح ہے .

تازہ ترین صورت حال : راقم مقالہ نے ۱۹۶۹ء میں کاظمین کی زیارت کی ۔ اس عمارت کی قدیم تصویر تاریخ آل امجاد میں اور نئی تصویریں متعدد کتابوں اور اخباروں میں دیکھی تھیں، خود تاریخ کاظمین کے مطالعے سے عمارت کا نقشہ ذہن میں پہلے سے موجود تھا، مگر کاظمین پہنچ کر محسوس ہوا کہ یہ عمارت جو انجنیئرنگ، جمالیات، تعمیر و تزئین کے لحاظ سے بہت عمدہ عمارت ہے، اب خاصی بدل چکی ہے ۔ اب شہر کاظمین کی شہر پناہ غائب ہو چکی ہے ۔ بلند و بالا جدید طرز کی عمارتوں کا سلسلہ بغداد و دجلہ سے جا ملا ہے اور شہر کے تقریباً وسط میں روضۂ مبارک ہے، صدیوں کی شکست و ریخت نے شہر کی آبادی اور سڑکیں بلند کر دی ہیں، لیکن روضہ کی خوشنما بلند اور چمک دار دیواریں، دیواروں کے بالائی حاشیے اور آٹھ دروازوں کی قوسوں اور پیشانیوں کے نفیس کتبے اور نصراللہ المشہدی کی خطاطی ۱۲۹۸ اور ۱۳۰۱ھ کے فن کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ جن سے عمارت کا جلال و جمال نمایاں ہے .

دروازے : طویل و عریض روضے کے بیرونی حصے کی چار دیواری آٹھ دروازوں کے ذریعے صحن میں راستہ دیتی ہے .

۱- باب القبلہ، ایوان طلا کے بالمقابل ہے، عموماً زائرین اسی دروازے سے صحن میں داخل ہوتے ہیں ۔ اس دروازے کے اوپر چوکور مینار پر چو رخی گھڑی ہے ۔ گھڑی کے اوپر مخروطی مینار ، گمزی اور کاس پر ختم ہوتا ہے اس پر سونا چڑھا ہوا ہے .

۲- باب المراد، مشرق میں واقع ہے، اس پر بھی باب القبلہ کی طرح مینار الساعۃ بنا ہے ۔ یہ بھی طلا پوش ہے ۔ یہ دروازہ بہت قدیم راستہ ہے .

۳- باب صاحب الزمان، غربی سمت میں ہے .

۴- باب فرہاد، حاجی فرہاد میرزا کا بنا کردہ دروازہ شرقی شمالی سمت میں ہے.

۵- باب قاضی الحاجات ، شمالی مشرقی سمت میں ہے .

۶- باب قریش، شمالی غربی سمت میں ہے.

۷- باب صافی، غربی و جنوبی سمت کی حد پر واقع ہے .

۸- باب جدید، جنوب مشرقی سمت میں ہے ۔ یہ دروازہ آیۃ اللہ ہبۃ الدین شہرستانی نے ۱۳۵۹ھ میں تعمیر کروایا تھا، اس میں داخل ہو کر بائیں طرف کے بڑے حجرے میں مکتبۃ الجوادین یا کتب خانۂ شہرستانی ہے .

دروازوں سے صحن میں آتے ہیں ۔ بیرونی دیوار

کے اندرونی حصے میں حجروں کی خوبصورت قطار ہے، یہ بڑے بڑے حجرے اور ہر حجرے کے سامنے چبوترے اور در بنے ہیں ۔ حجروں کے اندر امرا و علما کی قبریں ہیں ۔ قالین و آلات زیبائش سے آراستہ کمروں میں سے باب المراد کے شمالی حجرے میں فرہاد میرزا کی قبر ہے، یہ حجرے پورے دروں کے ستر اور نیم دروں کے سولہ ہیں ۔

صحن میں تین طرف تعمیرات و بیوتات ہے، شمالی سمت میں مسجد جامع صفوی اور جنوب مشرق میں مقبرۂ امام زادگان ابراہیم و موسیٰ ہے ۔ جس کی تعمیر عثمانی وضع کی ہے ۔

صحن شمالاً جنوباً طول میں ۱۳۵ میٹر اور عرض میں ۱۳۰ میٹر ہے (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۹)۔ چار دیواری سمیت پورا رقبہ تقریباً چھبیس ہزار میٹر ہے ۔

صحن کے تقریباً وسط میں عمارت روضہ ہے جس کے سامنے کے تین رخوں پر بلند ستونوں اور پہلو کے نسبۃً چھوٹے ستونوں پر برآمدے ہیں، ایک جنوب میں، ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں ۔ ہر برآمدے کے وسطی حصے کے دونوں طرف "کفش کنی" کے کھلے مسقف کمرے ہیں ۔ ہزاروں زائر یہاں جوتے اتارتے ہیں اور خدام انتہائی چابک دستی سے ایک لکڑی کی مدد سے انہیں اٹھا کر دیواری خولوں میں رکھ کر ایک نمبر آنے والوں کو دیتے ہیں ۔ کتنا ہی بڑا مجمع اور کیسے ہی اجنبی آدمی ہوں جوتا ہمیشہ اصل آدمی کو واپس ملے گا ۔ کفش کنی سے مسقف برآمدے میں آتے ہیں ، یہاں قالین کا فرش ہے اور سامنے دروازۂ رواق باب قبلہ کی محراب و دیوار پر سونا چڑھا ہے ۔ دوسرے دروازوں پر آئینہ کاری ، کاشی کاری ، نقش اور کتبے ہیں ۔ ہر دروازہ چاندی کا ہے ۔ دروازے کے دونوں پہلوؤں میں بڑے فریموں میں "دعاے اذن" لکھی ہے اسے پڑھ کر رواق میں داخل ہوتے ہیں ۔ یہ رواق کشادہ ہیں اور جھاڑ فانوس، آئینہ کاری، کتبات، پنکھوں اور ٹیوبوں سے آراستہ ہیں ۔

اہم قبریں : مغربی رواق میں پائے مزار کی طرف شیخ العلامہ ابوالقاسم جعفر بن محمد بن قولویہ (م ۳۶۹ھ) کی قبر ہے جسے ایک محراب اور سامنے پیتل کے جنگلے اور کتبے سے ممتاز کیا گیا ہے ۔ ابن قولویہ کامل الزیارات کے مؤلف اور شیخ مفید کے استاد تھے ۔

دوسری قبر جو اسی سے متصل ہے اور کتبے اور جنگلے سے مزین ہے،اس کے احاطے میں شیخ المفید، محمد بن محمد بن نعمان تلعکبری البغدادی (م ۴۱۳ھ) مؤلف الارشاد وغیرہ محو خواب ہیں ۔ تیسری اہم قبر، خواجہ نصیر الدین محمد بن حسن الطوسی (م ۶۷۲ھ) کی ہے جو وسیع محراب ، بڑے برنجی جنگلے اور بڑے کتبے سے آراستہ ہے ۔

رواق سے ہو کر ایوان خاص جاتے ہیں، اس کے دروازے بھی نقرئی ہیں اور ایرانی کاریگروں کی صنعت کے عمدہ نمونے ہیں ۔ اس کے پہلوؤں میں بھی فریموں کے اندر زیارت امامین عربی و مروی طریقے پر لکھی ہے ۔ اسے پڑھ کر اندر جاتے ہیں ۔ اندر نقرئی ضریح اور اس کے ارد گرد قیمتی قالینوں کا فرش ہے ۔ موٹے موٹے ستونوں پر قالب دار مقرنس چھت ہے جس کے قالب میں آئینہ کاری و طلا کاری اور نفیس کتبات ہیں، اسماے حسنیٰ الٰہیہ، اسماے رسول و ائمہ، آیات و احادیث، طغرے اور تاریخیں ہیں، جن جس میں قدیم تاریخ ۹۲۶ھ ہے ۔ چھت میں بھاری اور بڑے بڑے جھاڑ ہیں، وسط میں زردوز شامیانہ، اس کے نیچے مخملی چھت کی مستطیل وزنی ، شاندار اور نقرئی ضریح ہے، جس کے بالائی حاشیے پر عربی اشعار تحریر ہیں ۔ پھر محرابیں اور جالی ہے ۔ اندر جانے کا ایک دروازہ ہے جس میں قفل لگا ہے، یہاں ایک خادم ہر وقت موجود رہتا ہے ۔ ضریح پر سنہری کنگرےاور بیل بوٹے، ستون اور حاشیے فنی نفاستوں کے آئینہ دار ہیں ۔ ضریح کے چاروں طرف زیارت پڑھنے اور دعائیں کرنےوالوں کا ہر وقت مجمع رہتا ہے ۔ ارد گرد

کے کشادہ پہلوؤں میں نماز، تلاوت قرآن، دعا کی گونج اور صلوٰۃ کی صداؤں سے ایوان گونجتا رہتا ہے ۔ یہاں دو اماموں کی قبریں ہیں اس لیے دو زیارتیں پڑھی جاتی ہیں (رک بہ مفاتیح الجنان و زاد المعاد وغیرہ) نماز کے حرم میں اذان دی جاتی ہے پانچوں وقت ہزاروں نمازی نماز با جماعت ادا کرتے ہیں ۔ امامت کے فرائض شہر کے نامور اور مقدس علما ادا کرتے ہیں ۔

تولیت : اوقاف و مشہد کی تولیت عظمٰی خانۂ کعبہ کے ہزار برس پرانے کلید بردار خاندان بنی شیبہ کی ایک شاخ "البوشیخ" کے ذمے ہے؛ یہ حجازی خاندان تقریباً چار سو برس سے کاظمین کا متولی ہے دیکھیے (مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲، ص ۳۸۶) .

دکن، دہلی، اودھ، لاہور کے سلاطین اور امرا و نوابین نے اس کی مرمت و تزئین وغیرہ میں بڑی بڑی خدمات انجام دیں ۔ کاظمین کی عمارت کے علاوہ وہاں مدارس، کتب خانے اور علما کے مقبرے بہت ہیں.

مآخذ : (۱) میرزا عباس قمی: تاریخ کاظمین و بغداد، ۱۳۲۷ ش؛ (۲) عمادالدین حسین اصفہانی : مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲ ، طہران ۱۳۳۱ ش ؛ (۳) محمد حسن مصطفٰی : مدینۃ الحسین ، طہران ۱۳۶۸ھ ؛ (۴) محمد عباس شروانی : تاریخ آل امجاد، دہلی ۱۳۱۲ھ؛ (۵) علامۂ مجلسی : تحفۃ الزائر ، تبریز ؛ (۶) غلام علی احسن : رہبر زائران، آگرہ، ۱۳۵۳ھ؛ (۷) محمد ہاشم خراسانی : منتخب التواریخ، طہران ۱۳۴۷ھ ؛ (۸) مرتضٰی حسین فاضل : سفرنامۂ حج و زیارات ، خطی ۱۳۹۱ھ؛ (۹) شیخ عباس قمی : مفاتیح الجنان ، طہران ۱۳۲۹ھ .

(سید مرتضٰی حسین فاضل)

* **کاغَد** : کاغِد (فارسی لفظ کاغذ سے ماخوذ، شاید اصل کے اعتبار سے چینی) اسلامی ثقافت کے ارتقا کے زمانۂ آغاز میں اہل مشرق کے پاس صرف قرطاس (اوراق بردی، Papyrus) ہی ایک ایسی چیز تھی جس پر لکھا جا سکے؛ تالاس کے قریب اطلخ کی لڑائی میں چین کے جو جنگی قیدی اسیر بنا کر سمرقند لائے گئے تھے، پہلے پہل انھوں نے ۱۳۴ھ/۷۵۱ء میں چین میں مروجہ طریقے کے مطابق کتان اور سن کے چیتھڑوں اور ریشوں سے کاغذ بنانے کی صنعت رائج کی ۔ اس زمانے میں کاغذ کی جو مختلف قسمیں تیار کی جاتی تھیں، وہ حسب ذیل ہیں ۱- فرعونی : تہ وہ قسم تھی جو قرطاس (Papyrus) سے اس کے اپنے ملک (مصر) میں مقابلہ کرتی تھی ۔ عربی تحریر کا سب سے پرانا کاغذ جو مصر میں دستیاب ہوا ہے، ۱۸۰ھ تا ۲۰۰ھ/۷۹۶ء تا ۸۱۵ء ہے ؛ سلیمانی سلیمان بن رشید کے نام سے موسوم ہے جو ہارون الرشید کے عہد میں خراسان کا خازن تھا ؛ جعفری : جعفر البرمکی کے نام سے مشہور ہے ؛ طلحی، طاہریہ خاندان کے دوسرے فرمانروا طلحہ بن طاہر کے نام پر مشہور ہے ؛ طاہری، اسی خاندان کے بادشاہ طاہر دوم کے نام پر، نوحی : اس میں سامانی بادشاہ نوح اول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے .

سمرقند کے کارخانوں کے نمونے پر دوسرے مقامات پر بھی کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہوئے ۔ جعفر البرمکی کے بھائی الفضل نے جو ۱۷۸ھ/۷۹۴ء میں خراسان کا عامل تھا، غالباً بغداد کے محلے دار القز میں کاغذ کا کارخانہ قائم کیا ۔ تھوڑے ہی عرصے میں نہامہ، یمن اور مصر میں کارخانے بن گئے جہاں کاغذ نے آخر کار قرطاس (اوراق بردی Papyrus) کا استعمال ختم کر دیا ۔ اسی طرح دمشق، طرابلس، حما، منبج، طبریہ، المغرب، ہسپانیا، (بمقام شاطبہ Xatiua)، ایران اور ہندوستان میں بھی کاغذ بننے لگا ۔ آذربیجان میں زنجان سے دو دن کی مسافت پر خونج یا خونا کے باشندوں نے اس وجہ سے کاغذ کنان کا نام اختیار کر لیا تھا کہ وہاں بہترین کاغذ تیار ہوتا تھا ۔ مغلوں نے یہ مقام بالکل تباہ کر دیا تاہم انھوں نے وہاں ایک نو آبادی مغلیہ کے نام سے قائم کی (Barbier de Meynard : *Dict. de la Perse* ، ص ۲۱۹ ؛ (۲) حاجی خلیفہ :

جہان نما ، قسطنطنیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۲۹۸، و مترجمۂ Norberg، ۱ : ۳۶۵) .

کاغذ بنانے اور اسے رنگنے کے مختلف طریقوں کے متعلق J. V. Karabaček نے *Neue Quellen z. Papiergeschichte* میں بڑی دلچسپ تفصیلات دی ہیں، (در *Mitt. aus der Samml. der Papyrus Erzh. Rainer*، ۴ : ۷۵ ببعد) .

المَقْریزی (الخطط، طبع Wiet، ۲ : ۳۴) کے ایک بیان کے مطابق جعفر البرمکی نے سرکاری دفاتر میں رَق (parchment) کی جگہ کاغذ کو رائج کیا .

[جنگ عظیم سے قبل] مشرق ممالک میں جو کاغذ استعمال ہوتا تھا وہ تقریباً سارے کا سارا یورپ سے بن کر آتا تھا، [لیکن اب ان ممالک میں کاغذ کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں] - ایران میں ایک چینی کاغذ بہت تھوڑی مقدار میں ملتا تھا جسے خان بالیق (پیکنگ کا ترکی نام) کہتے تھے - دیرپا ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی مانگ رہتی تھی - قاہرہ کے مطابع زرد رنگ کا ایک مضبوط کاغذ "نباتی" پسند کرتے ہیں (فارسی نبات : مصری) .

قسطنطنیہ میں "آبہای شیرین یورپ" (The Sweet Waters of Europe) کی عام سیر گاہ اور شاہی کوشک کاغذ کے ایک کارخانے (کاغذ خانہ، عوامی تلفظ کت خانہ) کے نام سے منسوب ہے جو مدت گزری تباہ ہوچکا ہے .

مآخذ : (۱) الفہرست ، طبع Flügel ، ص ۲۱ ؛ (۲) القلقشندی : ضوء الصبح ، ۱ : ۴۱۲؛ (۳) وہی مصنف : صبح الاعشی، ۱ : ۴۷۴ ، ۴۷۶؛ (۴) Karabacek : *Mitt. aus der Samml. der Papyrus Erzh. Rainer* : ۳/۲ ، ۸۷ تا ۱۷۸ ؛ (۵) Chavannes : *Doc. sur les Tou-Kiue Occidentaux* ، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۲۹۷؛ (۶) Cl. Huart : *Les calligraphes et les miniaturistes de l'orient musulman* ، ص ۸ تا ۱۱ ؛ (۷) J. E. Polak : *Persien*، لائپزگ ۱۸۶۵ء، ۱ : ۲۶۸؛ (۸) Jouannin و Van Gaver : *Turquie* ، ص ۴۵۷ ؛ (۹) d' Ohsson : *Tableau de l'empire othoman* ، ۳ : ۱۵۵ .

(Cl. Huart)

الکاف : (al-kef)، تونس کا ایک شہر - یہ تونس سے ۱۱۰ میل جنوب مغرب میں اور الجیریا کی سرحد سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ۳۶ درجے ۱۱ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرق میں واقع ہے.

مآخذ : (۱) کتاب الاستبصار، طبع von Kremer، وی انا ۱۸۵۲ء، ص ۵۱ تا ۵۲ و مترجمۂ Fagnan : *L'Afrique Septentrionale* ، قسطنطنیہ، ص ۹۴ تا ۹۵ ؛ (۲) *Récit d'un voyage de Tunis au Kef exécuté en 1744*، طبع G. Dupont؛ (۳) Peyssonnel و Desfontaines : *Voyages dans les Régences de Tunis et d'Alger*، طبع Dureau de la Malle، پیرس ۱۸۳۸ء؛ (۴) Borbrügger : *Itinéraires archéologiques en Tunisie*، در *Rev. Afr.*، ۱۸۵۷ء؛ (۵) Guérin : *Voyage archéol. dans la Régence de Tunis* ، پیرس ۱۸۶۲ء، ۲ : ۵۳ تا ۷۲؛ (۶) G. Musset : *Reveue de l'Afrique française*، ۱۸۸۸ء؛ (۷) A. de la Berve : *En Tunisie* ، پیرس ۱۸۸۱ء، ص ۳۱ تا ۴۴؛ (۸) Espérandieu : *Etude sur le Kef* ، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۹) Cagnat و Saladin : *Voyage en Tunisie*، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۱۰) C. Monchi-court : *La Région du Haut-Tell en Tunisie*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ نیز دیکھیے مآخذ مقالۂ تونس .

(G. Yver) [تلخیص از ادارہ]

کافر : (ع؛ جمع: کُفّار)؛ اس کا مادّہ ک ف ر ہے، جس کے لفظی معنی ہیں چھپانا، ڈھانکنا - اسی لیے لغت میں لفظ "کافر" کا اطلاق رات، سمندر، عظیم وادی، بڑے دریا، سیاہ بادل اور زرہ کے لیے بھی ہوتا ہے (الفیروز آبادی : القاموس المحیط، قاہرہ ۱۳۵۷ھ، ۲ : ۱۲۸، بذیل مادّۂ کفر) - اسی طرح کاشتکار کو بھی لغت میں "کافر" کہہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ دانہ زمین میں

چھپاتا ہے، بلکہ آیت قرآنی اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ (۵۷ [الحدید] : ۲۰) کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس آیت میں کفار سے مراد کاشتکار ہیں ۔ اسی مناسبت سے کُفُور اور کُفْران کے معنی نا شکری کرنے کے ہیں اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہی معنی مراد ہیں (مثلاً ۱۱ [ہود] : ۹ ؛ ۲۲ [الحج] : ۶۶ ؛ ۷۶ [الدھر] : ۳، ۲۴ وغیرہ) ۔ پھر کفر کا زیادہ تر استعمال دین حق کے بجائے کسی اور دین کا پیرو ہونے کے لیے ہونے لگا اور کافر کا لفظ "غیر مسلم" کا مرادف ہو گیا؛ چنانچہ قرآن مجید کی اکثر آیات میں یہی معنی مراد ہیں ۔

"کفر" کی جو اصطلاحی تعریف علماے فقہ و کلام میں مشہور اور متفق علیہ ہے وہ یہ ہے : ھُوَ جَحْدُ کُلِّ مَاثَبَتَ عَنِ النَّبِیِّ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ادّعاؤہٗ ضَرُورَۃً (ابن الہمام : المسایرہ، دیوبند ۱۳۷۷ھ ص ۱۴۹، ۱۵۰) ۔ یہی تعریف معمولی لفظی فرق سے ابن نجیم کی البحر الرائق (مطبوعۂ قاہرہ، ۵ : ۱۲۹) میں بھی موجود ہے، یعنی کسی بھی ایسی چیز کا انکار کفر ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے بداھۃً یہ ثابت ہو کہ آپ نے اس کا دعوٰی فرمایا تھا، مثلاً توحید، آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی رسالت، آپ پر سلسلۂ نبوت کا ختم ہو جانا، آخرت کی زندگی، پانچوں نمازوں، زکوٰۃ، حج اور رمضان کے روزوں کی فرضیت، شراب اور زنا کی حرمت وغیرہ ۔ یہ سب چیزیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے یقینی اور بدیہی طور پر ثابت ہیں ۔ اس قسم کی جس چیز کا بھی انکار کیا جائے وہ کفر ہے اور ایسا انکار کرنے والے کو کافر کہتے ہیں ۔

جمہور اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ اصولاً "کفر" کا تعلق اعتقاد سے ہے ۔ اگر ایک شخص عمل میں کمزور ہو، مگر اسلام کے اساسی عقائد پر ایمان رکھتا ہو تو وہ کافر نہیں ہوگا ۔ اسے بے عمل، فاسق، فاجر اور اسی طرح کے کسی اور لفظ سے یاد کیا جائے گا ۔ انکار (عقیدہ) سے کفر لازم آتا ہے ۔ سستی عمل یا کسی بد عملی یا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا، ہاں فاسق [رک بآں] ہو جاتا ہے (ابو منصور الماتریدی : شرح الفقہ الاکبر، ص ۴۰ ؛ حیدر آباد، دکن ۱۳۲۱ھ) ۔ [یہ اس لیے ہے کہ انکار کے بعد نیک عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن انکار نہ کرنے کی صورت میں نیک عمل کی توقع رکھی جا سکتی ہے] ۔ بایں ہمہ یہ مد نظر رہے کہ اس نقطۂ نظر کے سلسلے میں جمہور امت کے خلاف بعض قدیم فرقوں نے اس سے اختلاف کر کے افراط یا تفریط کا راستہ اختیار کیا ہے ؛ چنانچہ فرقۂ کرّامیہ کا کہنا یہ تھا کہ ایمان صرف شہادتَیْن کے زبانی اقرار کا نام ہے، لہٰذا جو شخص زبان سے صرف یہ اقرار کر لے [شہادتَیْن کے ذریعے] وہ کفر سے محفوظ ہے، خواہ اس کا قلبی اعتقاد اور عملی زندگی اس کے اقرار کے خلاف ہو (الفرہاری : النبراس علی شرح العقائد، ملتان ۱۳۱۸ھ، ص ۳۹۹) ۔ دوسری طرف بعض خوارج کا کہنا یہ تھا کہ ہر طاعت جزو ایمان ہے، خواہ فرض ہو یا نفل، لہٰذا ایک طاعت کو چھوڑ دینے سے بھی انسان کافر ہو جاتا ہے، لیکن اکثر خوارج گناہ صغیرہ کے بجائے صرف گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر کفر کا اطلاق کرتے تھے (الآلوسی : روح المعانی، مطبوعۂ لاہور، ۱ : ۱۱۱) ۔ معتزلہ میں سے عبدالجبار اور ابوالہذیل وغیرہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ کسی بھی فرض یا مستحب کے ترک یا گناہ صغیرہ تک کے ارتکاب کی بنا پر انسان کو ایمان سے خارج قرار دے دیتے تھے، اگرچہ ان کے نزدیک وہ کفر میں داخل نہیں ہوتا تھا ؛ البتہ اکثر معتزلہ کے نزدیک کسی نفلی عبادت کے ترک یا گناہ صغیرہ کے ارتکاب سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا ؛ ہاں اگر کوئی فریضہ چھوڑ دے یا کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر لے تو اس سے وہ ان کے نزدیک ایمان اور کفر کے درمیان معلق ہو جاتا ہے، یوں کہ نہ اسے مومن کہا جا سکتا ہے نہ کافر ۔ اس نظریے کو

منزلۃ بین المنزلتین کا عقیدہ کہتے ہیں (اس بحث کی تفصیلات کے لیے دیکھیے العینی: عمدۃ القاری، استانبول ۱۳۰۸ھ، ۱: ۱۲۱، ۱۲۲ ببعد؛ نیز فخر الدین الرازی: التفسیر الکبیر، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۱۶۳ ببعد).

قرآن مجید میں کفار کے چھے گروہوں کا بطور خاص ذکر آیا ہے: (۱) مشرکین مکّہ، جو بت پرست تھے؛ مثلاً قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ (۱۰۹ [الکٰفرون]: ۱) میں یہی گروہ براہ راست مخاطب ہے؛ (۲) نصرانی یا عیسائی (تثلیث پرست)؛ چنانچہ ارشاد ہے: لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵ [المائدۃ]: ۷۳)=وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے؛ (۳) یہودی، [حضرت عزیر ؑ کو ابن اللہ کہنے والے]۔ قرآن مجید (۵ [النسآء]: ۱۵۵، ۱۵۶) میں ان پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے؛ (۴) صابیٔ (۲ [البقرۃ]: ۶۲؛ ۵ [المائدۃ]: ۶۹؛ ۲۲ [الحج]: ۱۷)، یعنی ستارہ پرست (ابن کثیر: التفسیر، قاہرہ ۱۳۵۶ھ، ۱: ۱۰۴)؛ (۵) مجوسی، یعنی آتش پرست (۲۲ [الحج]: ۱۷)؛ (۶) منافقین، یعنی وہ لوگ جو زبان سے اپنے آپ کو مؤمن کہتے، لیکن دل سے کافر تھے (۶۳ [المنٰفقون]: ۱).

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ تمام کافروں کا انجام آخرت میں جہنم ہے (۲ [البقرۃ]: ۳۹؛ ۳ [اٰل عمرٰن]: ۱۰ وغیرہ)، البتہ دنیوی احکام کے لحاظ سے کافروں کی متعدد قسمیں ہیں:

(۱) ذمّی [رک بہ ذمّہ]: ان کافروں کو کہتے ہیں جو کسی اسلامی حکومت میں حکومت کی اجازت سے مقیم ہوں۔ ان سے ایک معمولی ٹیکس (جزیہ) وصول کیا جاتا ہے اور ان کی جان، مال اور آبرو مسلمانوں کی طرح محفوظ ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو (حنفی مسلک کے مطابق) اس سے قصاص لیا جائے گا اور اس کے مال اور آبرو کی حفاظت سے متعلق بھی جملہ قوانین وہی ہیں جو مسلمانوں سے متعلق ہیں (ابن نجیم: البحرالرائق، مطبوعۂ قاہرہ، ۵: ۱۸۱؛ [نیز ابن القیم: احکام اھل الذمۃ]).

(۲) کافر مستأمن: اس کافر کو کہتے ہیں جو اسلامی مملکت میں حکومت سے اجازت لے کر زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لیے آیا ہو۔ اس مدت میں اس سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا اور اکثر احکام میں ایسا شخص بھی ذمّی ہی کی طرح ہوگا؛ مسلمانوں کے لیے اس کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت واجب ہے (الشّامی: ردّ المحتار، مطبوعۂ استانبول، ۳: ۳۴۴).

(۳) کافر حربی: وہ کافر ہے جو کسی [غیر معاہد] غیر مسلم حکومت کا باشندہ ہو۔ اگر اس غیر مسلم حکومت سے صلح کا کوئی معاہدہ ہے تو اس معاہدے کی شرائط کے مطابق عمل ہوگا اور اگر کوئی معاہدہ نہیں ہے تو ایسے کافروں کے جان و مال کی کوئی ذمے داری مسلمانوں پر نہیں ہے؛ ہاں مسلمانوں کے لیے ان سے غدر و خیانت اور دھوکا فریب جائز نہیں (ابن نجیم: البحرالرائق، ۵: ۱۰۷)؛ نیز حالت جنگ میں بھی غیر محارب عورتوں، بچوں، بوڑھوں، اپاہجوں، پاگلوں اور راہبوں کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح جو لوگ دوران جنگ میں اسیر ہو کر آئے ہوں ان کا مُثلہ کرنا (کسی عضو کو کاٹ ڈالنا) یا انھیں آگ میں جلانا جائز نہیں (الشّامی: ردّ المحتار، ۳: ۳۰۹).

(۴) مُرتد [رک بآں]: وہ شخص ہے جو پہلے مسلمان ہو، پھر کافر ہو گیا ہو۔ دارالاسلام میں رہتے ہوئے ایسا کرنا بنصّ حدیث سزائے قتل کا مستوجب ہے (البخاری، کتاب استتابۃ المرتدین، دہلی ۱۳۵۷ھ، ۲: ۱۰۲۳)؛ لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے دوبارہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے گی اور اگر اس کے دل میں کچھ اعتراضات و شبہات پیدا ہو گئے ہوں تو انھیں دور کیا جائے گا۔ اگر وہ پھر بھی اسلام نہ لائے تو تین دن تک اسے قید میں رکھ کر مہلت دی جائے گی؛ اس کے بعد قتل کر دیا جائے گا (ابن نجیم:

البحرالرائق، ۵ : ۱۳۵) - [دور جدید کے بعض مبصرین کی رائے یہ ہے کہ قتل مرتد کا حکم قرآن مجید میں موجود نہیں اور ایسا کرنا نص لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۲ [البقرة] : ۲۵۶) کے منافی سمجھتے ہیں، لیکن علما کی غالب اکثریت قتل مرتد کی قائل ہے] .

(۵) زِندیق : اس کافر کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی نبوت کا اعتراف کرتا ہو، لیکن اس کے دوسرے عقائد کافرانہ ہوں (التہانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۱۸۶۱ء، ۳ : ۱۲۵۲) .

جہاں تک کافروں کے ساتھ معاشرتی تعلقات کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں وسیع احکام ملتے ہیں، مثلاً کافروں کے معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے (۶ [الانعام] : ۱۰۸) اور کافر پر ظلم کر کے اس کی بد دعا لینے سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے (احمد بن حنبل : المسند، مطبوعۂ بیروت، ۳ : ۱۱۵۳) - اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ کافر کا بدن محض کفر کی وجہ سے ناپاک نہیں ہوتا؛ لہٰذا اس سے مصافحہ وغیرہ نہ کرنا محض شدت ہے، جس کے لیے کوئی سند نہیں (قاضی ثنا اللہ : تفسیر مظہری، دہلی ۱۳۸۰ھ، ۴: ۱۷۶) - [غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی سطح پر رواداری اور حسن معاملت کی تاکید ہے (البابرتی : العنایة مع فتح القدیر، مطبوعۂ قاہرہ، ۱ : ۷۵؛ ابن رشد : بدایة المجتہد، قاہرہ ۱۳۷۹ھ، ۱ : ۲۸۴)] - اگر کافروں کے برتنوں کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ وہ پاک ہیں یا ناپاک، تو [بغرض احتیاط طہارت] انہیں دھوئے بغیر کھانے پینے میں استعمال کرنا پسندیدہ نہیں؛ [یہ حکم عام ہے - خود مسلمانوں میں سے فساق و فجار کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے]، لیکن اگر کوئی [یہ سمجھ کر کہ یہ پاک ہیں] استعمال کر لے تو جائز ہے - اسی طرح ان کی بیمار پرسی کرنا، ان کی دعوت کرنا اور دعوت قبول کرنا، ان کو ہدیہ دینا یا ان کا ہدیہ قبول کرنا، اگر کسی دینی مصلحت کے خلاف نہ ہو تو جائز ہے - کسی یہودی یا مجوسی کو "اے کافر" کہہ کر پکارنا بھی مناسب نہیں، کیونکہ یہ اس کو گراں گزرے گا اور یہ دل آزاری ناجائز ہے؛ لیکن کافر کو "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم" کہنا یا لکھنا درست نہیں [کیونکہ السلام علیکم شعائر اسلام میں سے ہے اور اس سے مات کی انفرادیت متعین ہوتی ہے] - اس کے بجائے السلام علٰی مَنِ اتَّبَعَ الْہُدٰی لکھنا چاہیے (یہ اور اس جیسے بہت سے احکام فتاوٰی عالمگیری، بولاق - قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۵ : ۳۴۶ تا ۳۴۸ میں مذکور ہیں) .

[اسی معاشرتی انفرادیت اور تشخص کی خاطر] اہل کتاب کے سوا غیر مسلموں سے نہ شادی بیاہ کا تعلق قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، لیکن ذبیحہ کے سوا ان کے ہاتھوں کے تیار کیے ہوئے دوسرے کھانے مسلمانوں کے لیے جائز ہیں، بشرطیکہ ان میں کوئی حرام چیز نہ ہو - اہل کتاب (یہود و نصارٰی) کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز ہے (۵ [المائدة] : ۵) .

تصوف کی اصطلاح میں "کفر" اور "کافر" کے کچھ اور معانی بھی بیان کیے گئے ہیں، [لیکن وہ مجازی و اصطلاحی ہیں]، (دیکھیے التہانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۱۸۶۳ء، ۳: ۱۲۵۲).

مآخذ : متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن منظور : لسان العرب، بولاق ۱۳۰۰ھ، ۶ : ۴۵۹ تا ۴۶۷ ؛ (۲) الجوہری : الصحاح، قاہرہ ۱۳۷۵ھ، ۲ : ۸۰۷؛ (۳) وینسنک : المعجم المفہرس، لائیڈن ۱۹۶۷ء، ۶: ۳۰، بذیل مادّہ؛ (۴) انورشاہ کشمیری : اکفار الملحدین، کراچی ۱۳۸۷ھ، (نیز اردو ترجمہ از مولانا محمد ادریس میرٹھی، مطبوعۂ کراچی)؛ (۶) مفتی محمد شفیع : ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں، کراچی ۱۳۹۳ھ؛ [(۷) مفتاح کنوز السنة، بذیل مادّۃ الکافر] .

(محمد تقی عثمانی)

* **کافرستان** : ایک پہاڑی علاقہ، جو ہندوکش میں ۳۵ اور ۳۶ درجے عرض بلد شمالی اور ۷۰ اور ۷۱ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۵ ہزار مربع میل ہے۔ اس کا کچھ حصہ مملکت افغانستان میں شامل ہے، جسے نورستان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے؛ اور کچھ پاکستان کے ضلع چترال میں ہے۔ اس کی شمالی سرحد بڑی حد تک وہ فاصل آب ہے جو دریاے جیحوں اور دریاے سندھ کے معاون ندی نالوں سے سیراب ہونے والے علاقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے اور جس کے شمال کی وادیاں قبیلۂ غلچہ (رکّ باں) کے قبضے میں ہیں۔ کوہ ہندوکش کا وہ سلسلہ کافرستان کی مغربی سرحد سمجھا جاتا ہے جو درۂ خاوک کے قرب و جوار سے جنوب کی طرف چلا گیا ہے اور اسے پنج شیر اور نجراؤ کی وادیوں سے جدا کرتا ہے۔ مشرق میں کنر اور بشگل کی وادیوں کا درمیانی سلسلۂ کوہ اور جنوب میں کُنَر اور کابل کی وادیوں کے شمال کا سلسلۂ کوہ اس کی سرحدیں متعین کرتا ہے۔ یہ ملک متعدد وادیوں پر مشتمل ہے، جنھیں ایک دوسرے سے بلند پہاڑ جدا کرتے ہیں۔ اس کے بڑے بڑے دریاؤں کا فالتو پانی دریاے کابل یا دریاے کنر میں جا گرتا ہے، لہٰذا ان کا تعلق دریاے سندھ کے طاس سے ہے۔ مشہور دریا یہ ہیں: النگار یا کاؤ مع اپنے معاون الشنگ کے؛ پیچ (کامہ یا پریسن) اور بشگل۔ یہاں کے باشندے اپنے شرک اور تاریک خیالی پر سختی سے جمے رہنے کے باعث بہت مدت سے کافر کے نام سے مشہور ہیں اور انھیں سے ملک کا نام کافرستان نکلا ہے۔ قدیم زمانے ہی سے سیاہ پوش کا نام بھی مستعمل ہے، لیکن دراصل یہ صرف ان کے ایک حصے کا نام ہے (باقی سب کو مجموعی طور پر سفید پوش کہتے ہیں).

اس میں شک نہیں کہ سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں یہ علاقہ سلطنت کشان میں شامل تھا اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کپیسہ (Kapisa) کا کوہستانی ملک یہی تھا۔ تیمور نے اس ملک اور اس کے حکمران قبیلے کے لیے کتور کا نام استعمال کیا ہے۔ یہ نام چترال کے ہمسایہ ملک کے حکمرانوں کے لقب کے مماثل ہے اور بلاشبہہ موجودہ زمانے کے سب سے بڑے قبیلے کا نام کتیر، دراصل کتور ہی ہے۔ یہ امر بہت حد تک قرین قیاس ہے کہ یہ نام کشان فرمانرواؤں کے لقب کدارہ سے نکلا ہو۔ Wodd اور Yule نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مارکو پولو کسم (Casem، یعنی کشم، وادی کوکچہ میں) کے نزدیک جن شراب نوش قبیلوں سے ملا تھا وہ یہی کافر تھے، جو غالباً اس زمانے میں ہندوکش کی شمالی وادیوں تک پھیلے ہوے تھے؛ تاہم ان کا تذکرہ قطعی طور پر پہلی بار شہنشاہ تیمور کی توزک میں ملتا ہے۔ ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر چڑھائی کرتے وقت تیمور درۂ خاوک کے راستے ان کے ملک میں داخل ہوا تاکہ انھیں اندراب پر حملے کرنے کی سزا دے۔ وہ انھیں کتور اور سیاہ پوش کے نام سے یاد کرتا ہے۔ باوجودیکہ تیمور فتح کا دعوٰی کرتا ہے، لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ دشمن نے تاک لگا کر اس کی فوج کا بڑا حصہ تباہ کر دیا تھا اور اسے کوئی مستقل کامیابی حاصل کیے بغیر خاوک کی سمت لوٹنا پڑا تھا۔ بابر نے اپنی توزک میں اس ملک اور یہاں کے باشندوں کا بڑا صحیح صحیح حال بیان کیا ہے۔ اس نے کئی دریاؤں اور اضلاع کے وہی نام لکھے ہیں جو آج تک مستعمل ہیں۔ موجودہ زمانے میں الفنسٹن Elphinstone (۱۸۰۹ء) نے اپنے مشاہدات سے اور میسن Masson (۱۸۲۶ء) اور بڈلف Biddulph (۱۸۸۰ء) نے ملک میں داخل ہوے بغیر ان تمام معلومات کو جمع کر دیا جو اس کے بارے میں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ان میں سے الفنسٹن کا بیان خاص طور پر بہت قابل قدر ہے۔ لاک ہارٹ Lockhart پہلا یورپین تھا جو ۱۸۸۵ء میں کافرستان میں داخل ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء میں رابرٹسن Robertson پہنچا، جس نے ہندوکش کے کافروں پر اپنی تصنیف میں اس

ملک اور اس کے باشندوں ان کی رسوم، عقائد اور تنظیم کے بارے میں بہترین حال قلمبند کیا ہے .

۱۸۹۳ء میں حکومت ہند اور افغانستان کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے کافرستان کا علاقہ قطعی طور پر انگریزی سرحد سے خارج قرار دیا گیا ؛ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں امیر عبدالرحمٰن اس سارے علاقے کو فتح کرنے اور یہاں کے باشندوں میں تبلیغ اِسلام کے لیے روانہ ہوا ۔ قبیلۂ رام گلی نے جو کتیر کی شاخ تھا سب سے آخر میں اطاعت قبول کی ۔ رابرٹسن نے انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ (۱) سیاہ پوش قبیلے، جن کا ایک دوسرے سے بہت نزدیکی تعلق ہے (ان میں سب سے بڑا قبیلہ کتیر تھا)؛ (۲) متفرق قبائل، جن میں کوئی رابطۂ نسلی موجود نہیں ۔ انھیں وہ سفید پوش کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ ان میں سے بڑے بڑے قبیلے ویگلی (اور اشگن، جو اس کا قرابت دار ہے) اور پریسنگلی یا ویرون ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قبیلے آریائی نسل کی ایک قدیم قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زبانیں پساچہ زبان کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ کوھن Kuhn اور گرئیرسن Grierson کے نزدیک ان میں ایک ایسی زبان کی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندی زبانوں کے جدا ہونے کے بعد لیکن ایرانی زبانوں کے تشخص سے پہلے بولی جاتی تھی ۔ یہاں کی خالص بولیاں بشگلی، وای الا (Wai-ala) اور ویرون ہیں، جو ملک کے وسطی حصے میں مستعمل ہیں ۔ گوربتی، کلاشا اور پشائی بیرونی زبانیں ہیں ۔ پشائی فی الحقیقت کافرستان کی حدود سے باہر جلال آباد میں بولی جاتی ہے ۔ ایک اور زبان اَشْکُنْد ہے، لیکن اس کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا .

ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک یہاں جس قسم کی جاہلیت رائج تھی؛ اس میں مظاہر پرستی کے بہت سے عقائد شامل تھے، لیکن بعض بڑے بڑے دیوتا بھی عام طور پر مانے جاتے تھے ۔ ان میں بڑے بڑے دیوتا یہ تھے: امرا (خالق)، جس کا بڑا مندر پریسنگل میں تھا؛ مونی (پیغمبر)؛ گیش اور دیزانے (جنگ کا دیوتا اور دیوی) ۔ افغانوں کے فتح پانے سے پہلے ہی سرحدی علاقے کے بہت سے اضلاع مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے ۔ یہ نومسلم شیخ کے نام سے مشہور تھے؛ بکروں کی قربانیاں اور مذہبی ناچ عام تھے .

یہاں کا معاشرتی نظام یکسر قبائلی ہے ۔ ہر قبیلہ متعدد خیلوں اور کنبوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ قبائلی حکومت کا انتظام ایک مجلس کرتی ہے، جو زیادہ تر سرداروں یعنی جَسْت پر مشتمل ہوتی ہے ۔ یہ سردار مختلف برادریوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ قبیلے کی اصل حکومت چلانے کے لیے ہر سال اُررون، یعنی مجسٹریٹوں کا انتخاب ہوتا ہے ۔ مکان بہت اچھے بنائے جاتے ہیں اور ان سے بڑے مستحکم گاؤں بنتے ہیں ۔ عام طور پر کافر ذکی اور چالاک، لیکن جھوٹے، سازشی اور خود پسند ہوتے ہیں ۔ اس کے باوجود وہ مہمان نواز ہیں ۔ کافر عموماً ظالم نہیں ہوتے ۔ وہ بہادر ہیں اور آزادی کے دلدادہ اور اپنے ملک میں بڑے وقار سے کام کرتے ہیں ۔ وہ بہت جھگڑالو ہیں، لیکن دوسروں کے جھگڑے طے کرانے پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں ۔ ان کے ہاں چوری اور قتل قابل سزا جرائم نہیں سمجھے جاتے ۔ غلامی کا رواج عام ہے ۔ کچھ غلام تو موروثی ہوتے ہیں اور کچھ قبائلی لڑائیوں میں پکڑ کر بنائے جاتے ہیں، یا خریدے جاتے ہیں .

مآخذ : (۱) ملفوظات تیموری، در Dowson و Elliot : *Hist. of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء، جلد ۳ ؛ (۲) بابر نامہ، مترجمۂ A. S.Beveridge : *Memoirs of Babur*، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۳) *The Book of Ser Marco Polo*، مترجمۂ Yule و Cordier، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۱ : ۵۵، ۱۶۵ ؛ (۴) Elphinstone : *Caubul*، بار دوم، لنڈن ۱۸۳۹ء - ۱۸۴۲ء؛ (۵) Biddulph : *Tribes of the Hindoo Koosh*، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۶) Masson :

Travels in Afghanistan، لنڈن ۱۸۴۴ء؛ (۷) G. S. Robertson : *The Kafirs of the Hindu-Kush*، بار دوم، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ (۸) محمود دانشور : کافرستان (اردو ترجمہ از خلیل احمد)، لاہور ۱۹۵۳ء].

(M. Longworth Dames)

* **کافُور** (نیز قافُور، قَفُور؛ قب لسان العرب، بذیل مادّۂ ق ـ ف ـ ر اور ک ـ ف ـ ر؛ سنسکرت میں کرپورا؛ پراکرت میں کَپُورا، کَاپُورا؛ ملائی میں کَپُور)، انگریزی میں Camphor، جو *Laurus Camphora* اور *Dryobalanops aromatica* کی رال ہے ۔ قدیم ایرانیوں کے عہد سے اس کی تجارت ہندوستان سے ہوتی آئی ہے ۔ جب مدائن فتح ہوا تو عرب فاتحین کو وہاں کافور کا بہت بڑا ذخیرہ ملا ۔ یہ لوگ اس کا استعمال نہیں جانتے تھے ۔ انھوں نے اسے نمک سمجھا (البَلاذُری، طبع de Goeje، ص ۲۶۴؛ ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۲ : ۱۰۴) ۔ [یہ روایت ناقابل قبول ہے، کیونکہ کافور کا ذکر بلکہ اس کا استعمال قرآن مجید (۷۶ [الدھر]: ۵) ۔ میں مذکور ہے مقالہ نگار نے آگے خود اس کا حوالہ دیا ہے ۔ علاوہ ازیں احادیث میں غسل میت کے تحت یہ حکم وارد ہوا ہے کہ کافور کا بھی استعمال کیا جائے (الترمذی : جامع، ج ۱، ابواب الجنائز : باب ماجاء فی غسل المیت) ۔ ابن بیطار نے مختلف قسم کے کافوروں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے فَنْصُوری اور ریاحی بہترین سمجھے جاتے تھے ۔ یہ سب قسم کے کافور استعمال سے پہلے صاف کر لیے جاتے تھے ۔ بقول مارکوپولو (طبع Soc. de Geogr.، پیرس ۱۸۶۵ء، ۱ : ۴۴۷؛ مترجمۂ Yule، بتصحیح H. Cordier، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۲ : ۲۹۹، نیز تعلیقہ ۳، ص ۳۰۲ تا ۳۰۴) سب سے اچھا اور قیمتی کافور فَنْصُور کا ہوتا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سونے کے بھاؤ فروخت ہوتا تھا ۔ فَنْصُور غالباً بارُس Barus کا قدیم نام ہے (قب *Tijdschr. van het Kon. Nederl. Aardrijkskundig Genootschap*، سلسلۂ دوم، ۱۷ (۱۹۰۰ء) : ۱۸ تا ۲۲، ۲۷ تا ۲۹؛ *Encycl. van Nederl. - Indië*، بار دوم، ۱ : ۱۷۲ ببعد)، جو سماٹرا کے مغربی ساحل پر واقع ہے (تپنولی کی ریزیڈنسی) اور جہاں سے کافور فنصوری (Kapur Barus) آیا کرتا تھا ۔ عرب مصنفین فنصور کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں ۔ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے نصف اول سے ہمیں تاریخی اور جغرافیائی کتابوں میں اس جگہ کا ذکر ملتا ہے کہ یہیں سے بہترین کافور حاصل کیا جاتا تھا ۔

اس گوند کا نام قرآن مجید (۷۶ [الدّھر] : ۵) میں بھی پایا جاتا ہے [اِنَّ الاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا] : "بے شک نیک لوگ پییں گے اس پیالے سے جس کی ملونی کافور ہے" ۔ مفسرین کے نزدیک یا تو یہاں کافور سے مشروب کی خوشبو مراد ہے، یا پھر جنت میں اس نام کا کوئی چشمہ ہے (الطَّبَری : التفسیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۲۹ : ۱۱۱ ببعد) ۔ آخر الذکر تفسیر کی بنیاد یہ ہے کہ آیہ ۶ کے شروع میں عَیْن (چشمہ) کا ذکر آیا ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن بَیْطار : الجامع لمُفْرَدات الادْوِیَة، قاہرہ ۱۲۰۱ھ، ۴ : ۴۲ تا ۴۴، فرانسیسی ترجمہ از Leclerc، ۳ : ۱۲۷؛ (۲) المَسْعُودی : مُرُوج، مطبوعۂ پیرس، ۱ : ۳۳۸، ۳۴۰ ببعد؛ (۳) القَزْوِینی : آثارالبلاد، طبع Wüstenfeld، ص ۶۸؛ (۴) ابن بطّوطہ، مطبوعۂ پیرس، ۴ : ۱۴۱؛ G. Ferrand : *Textes géographiques*، ۱۹۱۳ء، ۱ : ۲، نیز بمدد اشاریہ، بذیل مادّۂ Camphre؛ (۶) Yule و Burnell : *Hobson-Jobson*، طبع جدید، از W. Crooke، لنڈن ۱۹۰۳ء، بذیل مادّۂ Camphor؛ (۷) W. Heyd : *Hist. du Commerce du Levant du Moyen-Age*، لائپزگ ۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ء، ۱ : ۱۶۵، ۱۷۴، ۲ : ۳۷۹، ۱۵۱، ۵۰۰، ۵۹۰ ببعد.

(Cl. Huart)

کافُور : ابوالمِسْک الاخْشِیدی (المتنبّی نے ایک *

قصیدے میں اسے حبشہ کے ایک مقام کی نسبت سے اللابی بھی لکھا ہے) ، چوتھی صدی ہجری میں شام اور مصر کا حکمران تھا، جس کی پیدائش نوبیہ یا حبشہ میں ۲۹۱ھ/۹۰۳ء اور ۳۰۸ھ/۹۲۰ء کے درمیانی برسوں میں ہوئی (سال پیدائش کے بارے میں مؤرخین کے بیانات میں اختلاف ہے) ۔ وہ ایک انتہائی بدصورت غلام کے درجے سے ترقی کرکے شام اور مصر کا حکمران ہوگیا ۔ اس نے علما کی سرپرستی کی ۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور ترین شاعر المتنبّی (رک بآں) کا دوست تھا ۔ ان وجوہات کی بنا پر عرب مؤرخین نے اس کے حالات نہایت ذوق و شوق سے لکھے ہیں اور استحقاق سے زیادہ اسے شہرت دی ہے ۔ چونکہ وہ علما اور شعرا کا مربی و قدردان تھا، اس لیے سوانح نگاروں نے اسے وفاداری اور نمک حلالی کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا ہے، اگرچہ وہ اخشیدیوں [رک بآں] سے یہ وفاداری نہ نباہ سکا ۔ اس کے سوانح اس کے معمولی حسب و نسب، اس کے عروج اور المتنبّی کے ساتھ اس کی رفاقت کے بارے میں لطائف و ظرائف سے مزیّن ہیں ۔ تاریخ میں اس کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے المغرب میں فاطمیوں [رک بآں] اور شمالی شام میں عرب خانوادوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا اور اپنی لیاقت و صلاحیت سے اخشیدیوں کی مملکت کو، جس کی تاسیس ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں ہوئی تھی، بیس برس تک تھامے رکھا ۔ اس کی وفات کے بعد یہ مملکت زوال پذیر ہوگئی ۔ جب وہ نو عمر غلام تھا تو اس نے اپنے ایک ساتھی سے، جسے باورچی بننے کا شوق تھا تاکہ وہ اپنے تنور شکم کو اچھی طرح روٹی سے بھر سکے، مصر کا حکمران بننے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا ۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ والی مصر محمد الاخشید (۳۲۳ھ/۹۳۵ء تا ۳۳۴ھ/۹۴۶ء) نے اسے خرید لیا ۔ مؤرخین کا یہ بیان کہ اسے جلدی بیماری کی وجہ سے واپس کرکے دوبارہ خرید لیا گیا، محض ملمع سازی ہے تاکہ وہ اس کی پستی کا اس کے حیرت انگیز عروج سے موازنہ کر سکیں ۔ ایک دوسرے راوی کا بیان ہے کہ اس کے سابق آقا نے رقم سمیت اسے والی الاخشید کے پاس واپس بھیج دیا، لیکن مؤخرالذکر نے رقم واپس کر دی اور کافور کو رکھ لیا ۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب کافور کے دوسرے رفقا ہاتھی دیکھنے کے لیے اپنے آقا کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تو وہ اپنی جگہ پر قائم رہا ۔ دونوں حکایتوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے آقا کا منظور نظر غلام بن گیا تھا ۔ والی نے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوے اسے اپنا معتمد علیہ بنا لیا تھا اور اس کی مکروہ صورت کے باوجود اسے اپنے بچوں کا اتالیق اور سپہ سالار مقرر کر دیا تھا ۔ اس کی فوجی صلاحیتیں ۳۲۹ھ/۹۴۰ء میں حلب کے قریب ایک جنگ میں ظاہر ہوئیں اور اس نے حاب فتح کر لیا ۔ ۳۳۴ھ/اواخر جولائی ۹۴۶ء میں جب الاخشید کو یہ محسوس ہوا کہ اب اس کی موت کا وقت قریب ہے تو اس نے کافور کو اپنے چھوٹے بیٹے انوجور کا سرپرست مقرر کر دیا، جسے اس نے اس سے پیشتر اپنے باپ کے ساتھ مشترک حکمران مقرر کیا تھا ۔ انوجور کی بلوغت کے بعد بھی حقیقی اقتدار کافور ہی کے ہاتھ میں رہا ۔ ۳۳۸ھ / ۹۴۹ء میں اس نے انوجور کے بھائی علی بن الاخشید کو مشترک حاکم اور جانشین تسلیم کرا کے اخشیدی خاندان کو تباہی سے بچایا ۔ بعد ازاں ۳۴۳ھ/۹۵۴ء میں بعض دوستوں کے ایما پر انوجور نے کافور کی اتالیقی سے اپنا دامن چھڑانا چاہا کیونکہ اس کی آزادی عمل محدود تھی اور اس کے اخراجات پر بھی قدغن تھی ۔ اسے کافور کے گران بہا محاصل سے صرف چار لاکھ درہم ملا کرتے تھے ۔ وہ فلسطین میں رملہ چلا گیا تاکہ وہاں سے شام اور مصر پر آزادی سے حکومت کر سکے، لیکن یہ منصوبہ بروے کار نہ آ سکا ۔ اس کی والدہ اور کافور کو اس امر کی بروقت اطلاع مل گئی اور انھوں نے انوجور کو راضی کر لیا ۔

انوجور نے ذوالقعدہ ۳۴۹ھ/دسمبر ۹۶۰ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس سال کے خاتمے پر کافور نے خلیفہ سے علی بن الاخشید کی حکمرانی کی توثیق کرا لی۔ علی اس وقت چوبیس برس کا ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی کافور کی سرپرستی میں تھا اور اسے چار لاکھ درہم کی رقم ملتی تھی۔ مصر کی فرمانروائی دوبارہ شام پر قائم ہو گئی اور حلب سے لے کر شمال میں طرسوس تک تمام مساجد میں جمعے کے خطبوں میں خلیفہ کے ساتھ علی کا نام لیا جانے لگا۔ جب علی نے چھے برس بعد ۳۵۵ھ/۹۶۶ء میں انتقال کیا تو کافور نے حکومت کی زمام کار خود سنبھال لی اور خلیفہ نے بھی اس کے تقرر کی توثیق کر دی کیونکہ اس وقت علی کا بیٹا احمد صرف نو برس کا تھا۔ کافور اپنی آزادی اور خود مختاری سے زیادہ دیر تک متمتع نہ ہو سکا۔ اس نے ۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں وفات پائی۔ اس کا جانشین احمد ہوا جس کے اختیارات اس نے خود سنبھال رکھے تھے۔

کافور نے شام اور مصر میں امن و امان قائم رکھا۔ الاخشید کی وفات کے بعد اس نے حلب کے فرمانروا سیف الدولہ سے دمشق چھین لیا جس پر مؤخرالذکر نے قبضہ کر لیا تھا۔ کافور نے بیدار مغزی سے خلیفۂ بغداد اور شمالی افریقیہ کے فاطمی حکمران سے یکساں تعلقات رکھے۔ کافور کے مال و دولت کی بڑی شہرت تھی اور اس کی ریاست میں سونے کے بجائے فنون لطیفہ کے بہترین خزائن تھے۔ وہ شان و شوکت کا دلدادہ تھا۔ سیف الدولہ کی طرح وہ علما اور شعرا پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اس کا دربار مقبول عام تھا اور ارباب علم اس کی قدردانی کے جویا رہتے تھے۔ جب المتنبّی سیف الدولہ سے کبیدہ خاطر ہو گیا تو کافور نے اسے قاہرہ بلا لیا جہاں المتنبّی نے چند سال قیام کیا۔ قیام کے ابتدائی دور میں اس نے کافور کی مدح میں مشہور قصائد لکھے۔ یہ رفاقت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ کافور نے وعدے کے مطابق اسے کوئی انتظامیہ عہدہ نہ دیا۔ کافور کا عذر یہ تھا کہ وہ اس شخص پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے جو نبوت کا دعوے دار ہو۔ کافور علم و ادب کا شائق تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتا تھا۔ اس کے دامن دولت سے بہت سے علما و فضلا وابستہ تھے۔ ان میں مشہورترین الکندی ہے جس نے اس کے لیے تاریخ مصر لکھی تھی۔

مآخذ: (۱) ابن سعید: کتاب المُغرِب فی حلی المغرب، جلد چہارم، جسے الکندی کی تاریخ مصر سے اقتباس سمیت Kn-L-Tallquist نے طبع کیا ہے۔ اس میں کافور کی مفصل سوانح کی ابتدا میں مآخذ بھی مندرج ہیں (ص ۷۸ تا ۸۶، عربی متن ص ۳۶ تا ۴۸)؛ (۲) الحلبی، در Wüstenfeld: *Die Statthalter Von Aegypten Zur Zeit der Chalifen*، ۳: ص ۳۷ تا ۵۰، ص ۵۹ تا ۶۱ (*Abh. Ges d. Wiss. Zu Göttingen D. K.*) ۲۱ (۱۸۷۶ء)؛ (۳) ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld، عدد ۵۵۶ نیز بمدد اشاریہ؛ (۴) المقریزی: الخطط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲: ص ۲۶ ببعد؛ (۵) ابوالمحاسن ابن تغری بردی: النجوم، ۲: ص ۳۷۳ تا ۳۹۵ بمواضع کثیرہ؛ (۶) المتنبّی: دیوان، (طبع دیتریسی) الکافوریات، ص ۶۲۳ ببعد اور مزید مآخذ منقولہ، در Tallquist: [(۷) Sadrud Din: *Saif-al-Dawla and his times*، مطبوعۂ لاہور؛ (۸) جلیل الرحمٰن اعظمی: ابو الطیب المتنبّی، ص ۱۴۱ تا ۱۶۴، مطبوعۂ کراچی)].

(M. Sober Nheim [و ادارہ])

کاکاصاحب: شیخ رحمکار (۹۸۳ تا ۱۰۶۳ھ)، صوبۂ سرحد کے مشاہیر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ کرامات اور خوارق عادات کی وجہ سے "قطب حقیقی" مشہور ہوئے اور تجلّی ذات سے متجلی ہونے کی شہرت پائی۔ صوبۂ سرحد، کابل اور افغانستان میں ان کے مریدوں کی تعداد ہزاروں [بلکہ لاکھوں] تک پہنچتی ہے [اور ان کے مزار پر زائرین کا ہجوم صوبۂ سرحد کے دیگر تمام مزارات سے زیادہ ہوتا ہے]۔ *

صوبۂ سرحد کا قبیلۂ کاکا خلیل ان کی نسل سے ہے۔ پشتو زبان میں ان کا اصلی نام "کستیرگل" تھا جو ایک خوشبودار پھول [یا زعفران] کا نام ہے، لیکن انھوں نے اپنے مریدوں میں "کاکا صاحب" اور "شیخ رحمکار" کے القاب سے شہرت پائی۔ وہ یکم رمضان ۹۸۳ھ بروزجمعہ صبح صادق کے وقت کاکا صاحب کی موجودہ زیارت سے چھے میل جانب جنوب و غرب، جو نوشہرے کے جنوب میں چھے میل کے فاصلے پر واقع ہے، ایک گاؤں میں "بختی" نامی ایک نیک بخت بی‌بی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کے اصل و نسب کے متعلق دو قول مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ آپ حسینی سادات کی نسل سے ہیں جو ۲۴ پشت میں حضرت امام حسین تک پہنچتی ہے۔ ان کے اجداد عراق، مشہد، بخارا، پشین (بلوچستان)، غزنی اور خوست میں مدفون ہیں۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں سید آدم [علاقۂ] کوہاٹ آئے۔ ان کا مزار موضع کربوغہ میں ہے۔ بعدازاں [ان کے بیٹے] سید غالب نوشہرے کے علاقے میں وارد ہوئے۔ ان کا مزار کوہ چراٹ کے دامن میں ہے۔ ان کے بیٹے سید نادر مست بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے [بیٹے] بہادر دار مست نے ایک صاحب کے نام سے بہت شہرت پائی۔ [مست بابا] اور ایک صاحب خٹک نوشہرہ کے علاقے میں [باہم دو میل کے فاصلے پر] مدفون ہیں۔ حضرت کاکا صاحب انھیں ایک صاحب کے فرزند تھے۔ اس روایت کا مأخذ عبدالحلیم بن کاکا صاحب کی تالیف مقامات قطبیہ [کے ناشر نے کتاب بطور ضمیمہ درج کی ہے] جو بعد کے مؤلفین نے بھی نقل کی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کاکا صاحب خٹک قوم کے افغان تھے۔ *Central Asia*، ۲ : ص ۷۸، طبع ۱۸۷۳ء، قاموس قبائل، ۲ : ص ۹۳۴ء، طبع ۱۹۱۱ء، گزیٹیر صوبۂ سرحد، ۲ : ص ۹۰۹، تاریخ پشاور، ص ۳۲۳ میں کاکا خیل کو خٹک قوم میں شمار کیا ہے۔ بہر صورت کاکا خیل [اور ان کے آبا و اجداد] کئی نسلوں اور کئی صدیوں سے خٹک قوم میں زندگانی بسر کر رہے ہیں اور ان کی زبان اور ان کے آداب و رسوم کو پوری طرح اپنا چکے ہیں۔

کاکا صاحب نے خٹک کے علاقے میں [شیخ اخ‌الدین المعروف بہ] اخون دین صاحب [جن کا مزار اکوڑہ میں ہے] اور اپنے [والد] ایک صاحب سے تعلیم حاصل کی اور [بعض روایات کے مطابق] والد ہی سے سلسلۂ چشتیہ [یا سہروردیہ یا ہر دو] کی اجازت پائی، لیکن وہ اپنے طریقے کو اویسی ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ ایک ہزار ہجری کے قریب ان کی شہرت کا آوازہ تمام سرحد اور افغانستان میں دور دور تک پھیل گیا۔ ان کے زہد و ریاضت، کرامات و تبلیغ دین، اخلاق و احکام دین کا بہت چرچا ہونے لگا۔ انھوں نے اخوند پنجو [رک بآں] اور سید آدم بنوری خلیفۂ حضرت مجددؒ سرہندی سے [بھی] روحانی فیض پایا اور عمر کا خاصا حصہ ریاضت و عبادت [زہد و تقوٰی] اور لوگوں کی ہدایت میں صرف کیا۔ [حضرت کاکا صاحب کے فیوض و برکات سے علاقے کے لوگ متعدد طریقوں سے مستفیض ہوئے۔ بہت باکمال بزرگوں نے ان سے روحانی کسب فیض کیا اور خرقۂ خلافت حاصل کیا، مثلاً خواجہ شمس الدین ہروی، کمال الدین بلخی، فقیر جمیل بیگ، (برادر خوشحال خان)، خواجہ شیخ بابر، شیخ دریا خان چمکنی اور حضرت مرزا گل بابا۔ قاضی عبدالحلیم اثر نے ان کے علاوہ تیس سے زائد مشہور خلفا کے نام تحریر کیے ہیں۔

عام مسلمانوں نے ان کے وعظ و نصیحت اور ارکان اسلام کی تلقین، تزکیہ و تربیت، درس و تعلیم اور جاری کردہ مدارس سے دینی فائدہ اٹھایا۔ ان کی مقبول دعاؤں، مخلوق خدا کی خیر خواہی، ان کو مفید مشورے دینے اور مسلمانوں کے آپس میں صلح و آشتی قائم رکھنے کی بدولت علاقے کے لوگوں کو عمومی فائدہ پہنچا۔ روحانی برکات کا فیض اس پر

مستزاد ہے ۔ انھوں نے انتہائی سادہ زندگی گزاری، خودداری ، حلم و بردباری ، شفقت و ہمدردی اور بے انتہا جود و سخا ان کے اخلاقی کمالات کے نمایاں جوہر تھے] ۔ جمعہ ۲۴ رجب ۱۰۶۳ھ / ۲۱ جون ۱۶۵۲ء کو اسّی سال [یا بقول بعض ۸۲ سال] کی عمر میں وفات پائی اور اس مقام پر دفن ہوے جو [تحصیل] نوشہرہ میں زیارت کاکا صاحب کے نام سے مشہور ہے ۔ [ان کے صاحبزادے شیخ عبدالحلیم نے ۱۰۸۱ھ میں ہندوستان سے معمار بلا کر ان کے مزار پر گنبد تعمیر کرایا جو اس علاقے میں مغلیہ فن تعمیر کا واحد شاہکار ہے] خوشحال خان خٹک ان کے مریدوں میں سے تھا .

کاکا صاحب کے بیٹوں کے نام : (۱) شیخ ضیاء الدین شہید [معروف بہ شہید بابا، کاکا صاحب کے گنبد کے پاس ایک دوسرے گنبد میں ان کا مزار ہے]؛ (۲) شیخ گل محمد معروف بہ حاجی بابا [ان کی قبر کاکا صاحب کی قبر سے متصل جانب مشرق ہے]؛ (۳) شیخ خلیل گل معروف بہ مزری بابا [مزار موضع کوٹ مالا کنڈ ایجنسی میں ہے]؛ (۴) شیخ عبدالحلیم صاحب معروف بہ حلیم گل بابا مؤلف مقامات قطبیہ [و شمس العارفین م-۱۰۹۶ھ، مزار زیارت کاکا صاحب میں ہے]، کاکا صاحب کے یہ چاروں فرزند صاحب نسبت بزرگ تھے ۔ خصوصاً شیخ عبدالحلیمؒ جن کے خاندان کو خصوصی تقدس حاصل ہے]؛ (۵) نجم الدین جو بچپن میں فوت ہوے .

[کاکا صاحب کی سکونت وفات کے وقت تک موجودہ قصبے سے، ایک میل جنوب مغرب کی طرف دامن کوہ میں ایک کچے مکان میں تھی ۔ یہ مقام اب "میلہ" (گھر) کے نام سے مشہور ہے ۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد اور دیگر متعلقین نے مزار کے قریب سکونت اختیار کی ۔ رفتہ رفتہ یہاں موجودہ قصبہ زیارت کاکا صاحب کے نام سے آباد ہوا ۔ آج کل اس کی آبادی تقریباً سات ہزار ہے ۔ اکثریت کاکا صاحب کی اولاد کی ہے ۔ سکونت پذیر لوگوں میں دوسرا مشہور خاندان (خاندان قضاۃ) کاکا صاحب کے استاد شیخ اخ الدین کی اولاد کا ہے ۔ جو اسی زمانے سے یہاں مقیم ہے] .

[کاکا صاحب کی اولاد کاکا خیل کہلاتی ہے ۔ یہ علاقۂ پشاور کی ایک با اثر قوم ہے اور قصبے کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی پھیلی ہوئی ہے ۔ عوام میں ان کا روحانی اثر و نفوذ مسلم ہے ۔ قوم کاکا خیل میں بہت سے افراد صاحب شہرت گزرے ہیں، مثلاً خان بہادر میاں رحیم شاہ (جنھوں نے اسلامیہ کالج کی بنا اور ترقی میں حصہ لیا اسلامیہ کالج پشاور)، فخر قوم میاں حمید گل، مولوی سید میرانجان (تحریک خلافت کے زعما)، مولانا عزیز گل، اسیر مالٹا خلیفۂ شیخ الہند] .

مآخذ : [حضرت کاکا صاحب کے تفصیلی حالات کے لیے مستند مآخذ کم ملتے ہیں ۔ شیخ عبد الحلیمؒ اور فقیر جمیل بیگؒ کی کتابیں مستند مگر تشنگی دور کرنے کے لیے ناکافی ہیں ۔ دوسرے معاصر اصحاب اور خلفا کے تذکرے جو اب مخطوطوں کی شکل میں بمشکل دستیاب ہوتے ہیں، عموماً مناقب اور کرامات پر مشتمل ہیں ۔ موجودہ صدی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں عموماً کسی خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر قیاس آرائیاں شامل کی گئی ہیں اور ان کو حقائق کا رنگ دیا گیا ہے ۔ اس لیے معروضی مطالعے کے لیے ان سے استفادے میں احتیاط کی ضرورت ہے] : (۱) شیخ عبدالحلیم بن کاکا صاحب : مقامات قطبیہ ، تصنیف ۱۰۶۶ھ دہلی ۱۳۱۸ھ؛ (۲) سیاح الدین کاکا خیل : تذکرۂ شیخ رحمکار ، (اردو) لاہور ۱۹۵۱ء؛ (۳) نصراللہ نصر : کاکا صاحب رحمکار (پشتو)، پشاور ۱۹۵۱ء؛ (۴) Mac. Gregah : *Gazetteer of the Frontier Province*، طبع ۱۸۸۷ء؛ (۵) *Central Asie*، طبع ۱۸۷۳ء، ج ۲؛ (۶) *Glossary of the tribes of the Punjab and North West Frontier*، ج ۲، طبع ۱۹۱۱ء؛ (۷) گوپال داس : تاریخ پشاور ، [اردو] لاہور ۱۸۷۰ء؛ (۸) میر احمد شاہ رضوانی : تحفۃ الاولیاء، لاہور ۱۳۲۱ھ؛

(۹) سید عبداللہ شاہ بخاری: مجمع البرکات [فارسی]، تالیف ۱۸۸۵ء، مخطوطۂ [مملوکۂ میاں فجر من اللہ کاکاخیل]؛ (۱۰) محمد امجد: تاریخ زیارت کاکا صاحب، از حکیم محمد امجد مطبوعہ لاہور؛ (۱۱) شمس الدین ہروی: اسرار المسالکین ای مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۲) جمال الدین: مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۳) شیخ اسمٰعیل: مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۴) گل نور ننگر ہاری: مناقب شیخ رحمکار، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۵) میاں محمد مبین: مناقب منظوم کاکا صاحب، مخطوعۂ مقالہ نگار؛ (۱۶) غلام احمد نوشہروی: مناقب کاکا صاحب مع شجرہ، لاہور ۱۹۰۸ء؛ (۱۸) فقیر جمیل بیگ دل: تذکرۃ الاولیاء، مخطوطہ، در پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی؛ (۱۹) عبدالحلیم اثر: روحانی رابطہ، پشاور ۱۹۶۵ء، ص ۵۷۳ تا ۵۹۳؛ (۲۰) اعجاز الحق قدوسی: تذکرۂ صوفیاے سرحد، مرکزی ادبی بورڈ ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۸ تا ۳۱۸.

(عبدالحی حبیبی و محمد عبدالقدوس)

* **کاکَوَیْہ (بنو)**: ایک شاہی خاندان جس نے ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء سے ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تک اصفہان اور ہمذان کے صوبوں پر حکومت کی۔ یہ خاندان دشمنز یار رستم بن المرزبان کی نسل سے تھا جو دیلم کا رہنے والا تھا۔ اس کے پاس شہریار کی جاگیر تھی اور آل بویہ کے فرمانروا مجد الدولہ نے اسے اسپہبذ کا خطاب دیا ہوا تھا (دیکھیے ابن اسفندیار: تاریخ طبرستان، مترجمۂ براؤن، ص ۲۳۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۹؛ ظہیرالدین: تاریخ طبرستان، طبع Dorn، ص ۱۹۵، ۲۰۹؛ میرخواند: روضۃ الصفاء، ۴: ص ۲۶).

کاکویہ دیلم کی مقامی بولی میں کاکو (ماموں) کا اسم تصغیر ہے (دیکھیے J. de Morgan: *Mission Scientifique en Perse*، ۵: ص ۲۱۶، شمارہ ۳۶۳؛ رضا قلی خان: فرہنگ [انجمن آرای] ناصری، بذیل مادّہ)۔ مؤسس خاندان [ابو جعفر] کو ابن کاکویہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ وہ مجدالدولہ کے ماموں کا بیٹا تھا۔ مجدالدولہ کی ماں [ابو جعفر ابن کاکویہ] کے والد دشمنزیار، جو مجدالدولہ کا سرپرست تھا، کی بہن تھی (ابن الأثیر، ۹: ص ۲۰۷، جہاں صفحہ ۱۴۶ کی بہ نسبت بہتر تشریح دی ہوئی ہے).

سکون پر دشمنزیار کے بجاے دشمنزار نام لکھا ہے (F. Justi: *Iranisches Namenbuach*، ص ۸۸؛ شجرۂ نسب، ص ۴۴۵)۔ اس خاندان میں پانچ بادشاہ گزرے ہیں:

۱۔ علاءالدولہ ابو جعفر محمد بن دشمنزیار الملقب بہ ابن کاکویہ جس نے ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء کے فوراً بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے میں سبقت کی آل بویہ کے فرمانروا فخرالدولہ [رک بآں] کی بیوی یعنی مجدالدولہ (جس نے اسے اصفہان کا عامل مقرر کر دیا تھا) کی ماں کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس نے ہمذان پر ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء، رے پر ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء اور اصفہان پر ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں قبضہ کیا۔ کردوں، طبرستان کے اسپہبذوں اور غزوں سے مسلسل جنگوں کے باعث وہ امن چین کے ساتھ ان مقبوضات پر حکومت نہ کر سکا۔ ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں سلطان مسعود نے جو اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا تھا، اس کے لیے اصفہان کی ولایت کی توثیق کر دی۔ ۴۲۵ھ/۱۰۳۴ء میں اس نے بغاوت کی اور دو بار شکست کھا کر اصفہان کھو بیٹھا۔ دو سال بعد اس نے اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور بالآخر کچھ مدت بعد اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاج الدولہ بویہی کی ملازمت سے برخاست ہونے کے بعد طبیب و حکیم ابن سینا [رک بآں] نے اسی کے دربار میں قلمدان وزارت سنبھالا تھا (ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld عدد ۱۸۹، مترجمۂ de Slane، ۱: ۴۴۲)؛ ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں اپنے انتقال کے وقت بھی وہ وزیر ہی تھا۔ علاءالدین نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں اپنے دارالحکومت کے گرد

فصیل بنوائی اور اس کے بعد ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء میں اس کی وفات ہو گئی۔

۲۔ ظہیرالدین ابو منصور فرامرز، علاء الدولہ کا سب سے بڑا بیٹا، اصفہان میں اس کا جانشین قرار پایا۔ اس نے اپنے بھائی ابوحرب کے خلاف جنگ کی۔ ابوحرب نے غز سلجوقوں سے اعانت طلب کی جن کا مستقر رے تھا۔ لڑائی میں مؤخرالذکر نے شکست کھائی۔ ظہیر نے ابو کالیجار بن سلطان الدولہ بویہی [رک بآں] کے ہاں پناہ لی اور اس بویہی سلطان کو اصفہان کا محاصرہ کرنے پر اکسایا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان یہ لڑائی، جو ۴۳۵ھ/۱۰۴۴ء تک جاری رہی، بالآخر ایک معاہدے کے ذریعے ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ظہیر نے کرمان کے دو قلعوں پر قبضہ کر لیا جو ابو کالیجار کے علاقے میں تھے۔ انھیں واپس لینے کے لیے ابو کالیجار نے ابرقوہ فتح کیا اور اصفہانی فوج کو شکست دے دی۔ ۴۳۸ھ/۱۰۴۷ء میں طغرل بیگ نے اسے اس کے دارالحکومت اصفہان میں محصور کر لیا اور اسے اس شرط پر اپنی جاگیر پر قابض رہنے دیا کہ وہ اطاعت گزار بن کر رہے گا۔ یہ صورت حال ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تک قائم رہی کیونکہ سلجوق فرمانروا نے ایک طویل محاصرے کے بعد اس سال اصفہان کو فتح کر لیا اور اسی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ یہ کہتے ہوے اس کی فصیلیں منہدم کرا دیں کہ حفاظت کے لیے دیواروں کی ضرورت فقط اس بادشاہ کو ہوتی ہے جو کمزور ہو۔ ابو منصور کو بطور جاگیر دو اضلاع یزد اور ابرقوہ ملے۔ جب ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں، طغرل بیگ خلیفہ القائم کی بیٹی سے شادی کرنے بغداد گیا تو ظہیر اس کا ہم رکاب تھا۔

۳۔ ابو کالیجار گرشاسپ، سابق الذکر کا بھائی تھا اور جب ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں غزوں نے ہمذان کا محاصرہ کیا تو اس شہر کا حاکم تھا۔ اس نے ان کے سردار گوکتاش سے صلح کرکے اس کی بیٹی سے شادی کر لی، لیکن رے کی تسخیر کے بعد غزوں نے دوبارہ حملے شروع کر دیے اور اسے کُنکَور کے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ یہ ترک ہمذان میں ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء میں داخل ہوے۔ جب اس طرح ترک اپنے تعاقب میں ابو کالیجار کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے تو انھوں نے اس پر حملہ کر دیا، لیکن وہ بچ نکلا۔ اس واقعے کے فوراً بعد اس کے باپ علاءالدولہ نے ترکوں پر اچانک حملہ کرکے انھیں شکست دی۔ علاءالدولہ کی وفات کے بعد گرشاسپ نہاوند میں اقامت پذیر ہوگیا۔ فرامرز نے ہمذان فتح کرکے اسے اس شرط پر اپنے بھائی کو بطور جاگیر عطا کر دیا کہ وہاں خطبہ اسی (فرامرز) کے نام کا پڑھا جائے گا۔ ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء میں طغرل بیگ نے ہمذان فتح کر لیا اور گرشاسپ سے مطالبہ کیا کہ کُنکَوَر اس کے حوالے کر دے، لیکن اس کے محافظوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ۴۳۶ھ/۱۰۴۴ء میں گرشاسپ نے ہمذان دوبارہ حاصل کر لیا اور ابو کالیجار بویہی کے باجگزار ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس سے اگلے سال طغرل بیگ نے اپنے بھائی یِنّال کو اس شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا جہاں سے وہاں کا فرمانروا فرار ہو کر جوزقان کے کردوں کے ہاں پناہ گزین تھا۔ یِنّال نے ۴۳۹ھ/۱۰۴۳ء میں کنکور فتح کر لیا جس کا فرمانروا گرشاسپ کا ایک عامل عقبر بن فارس تھا اور اس نے اپنے لیے ہتیار ڈالنے کی مفید مطلب شرائط منوانے کے لیے یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ ابھی اس کے پاس کافی سامان اور رسد موجود ہے۔ اپنے مقبوضات سے محروم ہونے کے بعد گرشاسپ نے ابو کالیجار بویہی کے ہاں پناہ لی۔ ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء میں وہ اصفہان میں موجود تھا جہاں اس نے مودود غزنوی کی تجاویز کو بخوشی منظور کیا جو سلاجقہ کے مقابلے کے لیے مدد کا طالب تھا، لیکن صحرا میں اس کے بہت سے سپاہی ضائع ہو گئے اور خود بیمار پڑ گیا

اور اس کی وجہ سے اسے واپس آنا پڑا - ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء میں اھواز کے مقام پر وفات پا گیا .

۴- علی بن فرامرز، اس نے ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء میں سلجوق داؤد کی بیٹی ارسلان خاتون سے شادی کی، جو سلطان ملک شاہ کی پھپی تھی - جب اس نے کرمان میں پناہ لی تو اسے یزد کی جاگیر عطا کر دی گئی (*Rec. de Textes rel. a l'hist. des Seljoucides*، ۱: ۲۶) - وہ ۴۸۸ھ/۱۰۹۰ء میں تُتش کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا (ابن الاثیر، ۱۰ : ۳۱۲) .

۵- علاءالدولہ ابو کالیجار گرشاسپ بن علی، یزد کا شاہزادہ ہونے کی وجہ سے وہ شاہان سلجوق کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھا - اس نے سلطان محمد اور سنجر کی بہن سے شادی کی تھی - اپنی جاگیر سے محرُوم ہونے کے بعد، جو سلطان محمود نے اپنے ساق قرجہ کو عطا کر دی تھی، علاءالدولہ نے سنجر کے سائے میں پناہ لی - وہ اس جنگ میں شریک تھا جس میں سنجر نے اپنے بھتیجے کو شکست دی تھی (۵۱۳ھ/ ۱۱۱۹ء) - وہ فرزین کے قلعے سے جہاں محمود نے اسے قید کر رکھا تھا، فرار ہو گیا تھا (*Rec. de textes rel. à l'hist. des Seljoucides*، ۲ : ۱۳۳) .

مآخذ : (۱) ابن الاثیر، طبع Tornberg، جلد ۹، ۱۰، بذیل مادّۂ دشمنز یار، فرامرز، گرشاسپ، علی بن ابی منصور؛ (۲) *Rec. de textes rel. á l'hist. des Seljoucides*، طبع Houtsma، ۲ : ۱۹، ۲۵، ۵۲، ۱۳۳، ۱۵۱؛ (۳) منجم باشی : تاریخ، طبع ۱۲۸۵ء، ۲ : ۵۰۳ تا ۵۰۴؛ (۴) Edw. G. Browne : *Rare. Ms. history of Isfàhàn*، در *Journ. Roy. As. Soc.*، ۱۹۰۱ء، ص ۳۳۳؛ (۵) D. Tornberg : *Revue de la numismatique belge*، سلسلۂ سوم، ۲ : (برسلز ۱۸۰۸ء)؛ (۶) H. Sauvaire : وہی کتاب، سلسلۂ سوم، جلد ۶، ۱۸۶۲ء؛ (۷) J. G. Stickel، در *Zeitschr. d. Deutsch. Morg. Gesellsch*، ۱۸ : ۲۹۷ ببعد، ۳۹ : ۷۱؛ (۸) P. Horn، در *Grun-driss der iran. Philologie*، ۲ : ۵۶۵ .

(CL. HUART)

کالی کٹ : (یا کالی گوڈ = قلعۂ مرغ)، احاطۂ * مدراس (کیرالا) کے ضلع مالا بار میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ایک بندرگاہ - [۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے باشندوں کی تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں مسلمان خاصی تعداد میں ہیں، جو موپلا [رَک بان] کہلاتے ہیں] - یہ عرب مہاجرین کی اولاد سے ہیں جنھوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں - زمانۂ قدیم سے کالی کٹ بحری تجارت کا مرکز رہا ہے - یہاں ابن بطوطہ (۱۳۴۵ء) اور عبدالرزاق (۱۴۴۲ء) سیاحت کرتے ہوے آئے تھے - دونوں ہندو راجہ زمورن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جس نے ملک میں امن و امان قائم کرکے تجارت کی حفاظت کا سامان کر دیا تھا - راجہ زمورن کے اخلاف ابھی تک زندہ ہیں - کالی کٹ، پہلا ہندوستانی مقام ہے جہاں واسکوڈی گاما ۱۴۹۸ء میں آیا تھا - یہاں چالیس مساجد ہیں - ان میں شیک کندہ پلی کی بھی جامع مسجد ہے، جو شیخ مأمون کویا کے مزار پر تعمیر ہوئی ہے - یہ عرب تھے اور سولھویں صدی عیسوی میں مصر سے آئے تھے - ان کی نیکی و پارسائی کی بڑی شہرت تھی .

موپلوں کے دیوانی مقدمات اور دیگر تنازعات کا تصفیہ بھی اسی جامع مسجد میں ہوتا ہے - کالی کٹ Calicot سے (چھینٹ = چھپا ہوا کپڑا) نکلا ہے - [کالی کٹ کیرالا کے مسلمانوں کا علمی و ثقافتی مرکز ہے - ایک اسلامیہ کالج کے علاوہ عربی کے کئی مدارس ہیں - یہاں سے ناریل، چاے اور قہوہ دساور جاتے ہیں - شہر میں سوتی کپڑا بننے، ناریل کا تیل نکالنے اور صابن بنانے کے کئی کارخانے ہیں] .

مآخذ : (۱) *Madras District Gazetteers*، مالا بار (مدارس ۱۹۰۸ء)؛ [(۲) *Encyclopaedia Brit-*

tannica، ج ۴ بذیل مادّہ] .

(J. S. Cotton و [ادارہ])

* **کامران** : بحیرۂ قلزم میں ایک چھوٹا سا جزیرہ جو تہامہ کے ساحل پر زبید کے مقابل واقع ہے ۔ کامران کا مورچہ بند شہر ہمیشہ سے تہامہ کے فرمانرواؤں کے زیر نگین رہا ہے ۔ المقدسی کے زمانے میں یہاں شاہ یمن کے جیل خانے تھے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا جسے العقد کہتے تھے۔ یہاں محصول اور چنگیاں وصول کی جاتی تھیں .

مشہور فقیہ محمد بن عبدوبۃ ، جو ابواسحٰق الشیرازی کا شاگرد اور اصول الفقہ کی چند کتابوں کا مصنف تھا، کامران کا باشندہ تھا اور یہیں مدفون بھی ہے ۔ جب کبھی طوفان اٹھتا ہے اور جہازوں کے لیے خطرہ نظر آتا ہے تو لوگ اس کی قبر کی مٹی سمندر میں پھینکتے ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنے سے طوفان ٹل جاتا ہے .

آج کل کامران حاجیوں کے قرنطینے کا مستقر بن گیا ہے؛ اس موضوع پر دیکھیے Snouck Hurgronje: *Mekka*، ۲: ۲۹۹ حاشیہ ۱؛ وہی مصنف: *Verspreide Geschriften* (بون و لائپزگ ۱۹۲۳ء ببعد)، ۳ : ۲۷، ۳۲ .

مآخذ : (۱) المقدسی (طبع de Goeje)، در *BGA*، ۳ : ۱۰۳؛ (۲) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld)، ۳: ۸۰.

(V. Vacca)

* **کامران شاہ دُرّانی** : افغانستان کے سدوزئی خاندان کا آخری فرمانروا، جس نے ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں اپنے باپ محمود شاہ سے ہرات کی محدود بادشاہت ورثے میں پائی اور اس پر ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء تک حکومت کرتا رہا ۔ تیمور شاہ کے بیٹوں، یعنی شہزادگان زمان، شجاع الملک اور محمود کے درمیان جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان میں شہزادۂ کامران نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہادر سپاہی ہے ۔ ۱۲۲۱ھ میں اس نے شجاع الملک سے قندھار چھین لیا، لیکن چند ہی روز بعد یہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں اس نے ان حوادث میں بڑا نمایاں حصہ لیا جن کے نتیجے کے طور پر درّانی سلطنت کا شیرزاہ بکھر کر رہ گیا ۔ اس نے دوست محمد سے اپنی بہن کی توہین کا یہ بدلہ لیا کہ (دوست محمد کے باپ) فتح خان بارک زئی وزیر کی، جس کی بدولت محمود شاہ کو بادشاہت ملی تھی، آنکھیں نکلوا کر اس کا سر قلم کر دیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ ہرات کے سوا باقی سارا ملک ہاتھ سے نکل گیا ۔ کامران آخر عمر میں عیاش اور آرام طلب ہو گیا لیکن اپنے لائق اور بے باک وزیر یار محمد الکزئی کی کوششوں سے وہ ہرات پر قابض و متصرف رہا ۔ اس کے عہد کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۳۷ تا ۱۸۳۹ء میں ایران کے قاجاری بادشاہ نے ہرات کا محاصرہ کیا ۔ اس محاصرے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب انگلستان اور روس کی باہمی رقابت تھی ۔ ایرانیوں کے مشیر کار روسی افسر تھے۔ اس کے برعکس دفاع کا روح و روان ایک نوجوان انگریز افسر لفٹیننٹ ای ۔ پوٹنجر (E. Pottinger) تھا ۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں یار محمد نے ، جو ایرانیوں کے ساتھ ملا ہوا تھا، کامران شاہ کو قتل کر دیا اور ہرات پر خود قابض ہو گیا ۔ کامران نے ہرات میں اپنے سکّے ضرب کرکے چلائے .

مآخذ : (۱) Elphinstone : *Caubul* ، بار دوم، لنڈن ۱۸۳۹ - ۱۸۴۲ء؛ (۲) Ferrier : *History of the Afghans*، لنڈن ۱۸۵۸ء؛ (۳) Kaye : *History of the War in Afghanistan*، لنڈن ۱۸۴۴ء؛ (۴) Mohan Lal: *Life of Dost Muhammed*، لنڈن ۱۸۴۶ء .

(M. Longwohth Dames)

* **کامران میرزا** : بابر کا دوسرا بیٹا اور ہمایوں کا سوتیلا بھائی ۔ اس کی ماں کا نام گلرخ بیگم تھا ۔ ۱۵۰۹ء کے لگ بھگ وہ شہر کابل میں پیدا ہوا، شاعرانہ طبیعت پائی تھی؛ لیکن بے حد ظالم اور بدخصال

تھا اور ہمیشہ نئی نئی چالیں سوچتا رہتا تھا ۔ اس نے ہمایوں کے خلاف بار بار علم بغاوت بلند کیا ۔ آخر اواخر ۱۵۵۳ء میں سرداروں نے ہمایوں کو مجبور کر دیا کہ وہ کامران کو بصارت سے محروم کرکے اس کی ضرر رسانی سے نجات حاصل کرے ۔ ۱۵۵۴ء میں کامران مکۂ معظمہ چلا گیا اور اکتوبر ۱۵۵۷ء میں اس نے وہیں وفات پائی ۔ اس کے بارے میں سب سے دلچسپ بات اس کی بیوی ماہ چیچک بیگم ارغون کی وفاداری ہے جو سندھ کے فرمانروا شاہ حسن کی بیٹی تھی ۔ ماہ چیچک بیگم نے اپنے باپ کے روکنے کے باوجود شوہر کے ساتھ جہاز پر بیٹھ کر مکۂ معظمہ جانے پر اصرار کیا اور اس کے باپ نے جو اعتراضات کیے تھے ان کے جواب میں یہ کہا کہ آپ نے کامران کے عروج کے دنوں (۱۵۴۶ء) میں مجھے اس کے حوالے کیا تھا ، اب مصیبت کے وقت میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں ۔ اس نے اپنے خاوند کی وفات کے چند ماہ بعد مکۂ معظمہ میں وفات پائی ۔

کامران کو بابر نے قندھار کی حکومت سپرد کی تھی ۔ ہمایوں کے ابتدائے عہد میں وہ پنجاب کا صوبیدار مقرر ہوا ۔ جن دنوں تخت سلطنت خالی تھا اور ہمایوں ترک وطن کرکے ایران گیا ہوا تھا، کامران اور اس کا چھوٹا بھائی عسکری افغانستان پر حکومت کر رہے تھے ۔ کامران نے اپنے پیچھے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں چھوڑیں ۔ لڑکے کو جس کا نام ابوالقاسم تھا اور جس نے شاعری اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی، اکبر نے ۱۵۵۷ء میں گوالیار میں قید کر دیا اور چند سال بعد اسے ایک خطرناک حریف سمجھتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ تینوں لڑکیاں بیاہی گئیں ۔ ان میں سے ایک لڑکی نے جس کا نام گلرخ تھا مردانہ ہمت پائی تھی ۔ اس کی شادی ابراہیم حسین سلطان سے ہوئی اور وہ اور اس کا بیٹا اکبر کے پہلو میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے (فرشتہ، طبع سنگی، ص ۲۲۱ و محمد حسین آزاد : دربار اکبری) .

مآخذ : (۱) ابوالفضل : اکبر نامہ ، جلد ۱؛ (۲) محمد حیدر : تاریخ رشیدی انگریزی مترجمۂ N. Elias و E. Denison Ross؛ (۳) جوہر آفتابچی : *Memoirs of the Emperor Humāyūn* ، مترجمۂ Major Stewart (O.T.F. ۱۸۳۲ء) ؛ (۴) توزک بابری ؛ (۵) Erskine : *Memoirs of Baber* ؛ (۶) گلبدن بیگم : ہمایوں نامہ، (*O.T.F.*) لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۷) بدایونی : منتخب التواریخ، ۱ : ۴۵۱ ببعد ؛ (۸) Elliot Dowson ، ۴ : ۴۹۸ ، جلد ۵ و ۶؛ [(۹) کامران : دیوان، مطبوعۂ اعظم گڑھ]؛ مخطوطۂ بانکی پور (*Cat.*، ۲، ۱۴۵، ۲۱۵) میں کامران کے سوانح حیات دیے گئے ہیں .

(H. BEVERIDGE)

کام رُوپ : [بھارت کے صوبۂ آسام کا ایک ضلع، جس کا موجودہ رقبہ ۳۸۰۴ مربع میل اور آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۶۲۵۷۲ ہے ۔ ۴۰۰ء کے قریب کامروپ کی ریاست کی حدود بھوٹان سے خلیج بنگالہ تک پھیلی ہوئی تھیں اور پراگ جیوتش پور (موجودہ گوہاٹی) اس کی راجدھانی تھا ۔ ہندوؤں کے تنتری فرقے کا آغاز اسی علاقے سے ہوا ہے]۔ محمد بختیار خلجی اور اس کے بعد بنگالے کے دوسرے حاکموں نے کامروپ کو اسلامی حکومت میں شامل کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں کیں وہ یہاں کے گھنے جنگلات اور مرطوب [اور مضر صحت] آب و ہوا کے باعث بار آور نہ ہوئیں ۔ ۱۲۵۶ء میں اختیارالدین یُوزبک طغرل خان نے کامروپ پر حملہ کیا اور اپنی فتوحات کی یادگار میں ایک مسجد بھی یہاں بنائی [لیکن یہاں مستقل حکومت قائم نہ ہو سکی]۔ ۱۶۳۸ء میں کہیں جا کر مسلمانوں کو کام روپ میں قدم جمانے کا موقع نصیب ہوا اور یوں گوہاٹی مسلم حاکموں کا صدر مقام بنا، [لیکن جب شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان جنگ تخت نشینی شروع ہوئی (۱۶۵۸ء) اور

*

مغل لشکر اس میں حصہ لینے کے لیے یہاں سے نکل گیا تو اہوم راجا نے، جس کی ریاست کامروپ کے پڑوس میں واقع تھی، کامروپ پر قبضہ کرکے پورے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی ۔ عالمگیر [رک بآں] نے زمام حکومت سنبھالنے کے بعد میر جملہ کو بنگالے کا صوبیدار مقرر کیا، جس نے کوچ بہار کو مغلیہ سلطنت میں شامل کرنے کے بعد آسام کی طرف پیش قدمی کی (جنوری ۱۶۶۲ء) ۔ اہوم فوجیں پسپا ہوتے ہوتے برہم پتر کے کنارے تک پہنچ گئیں ۔ ۱۳ مارچ کو ایک بحری لڑائی میں میر جملہ نے دشمن کا بیڑا بھی تباہ و برباد کر دیا اور ۱۷ مارچ کو وہ اس کے صدر مقام گڑھ گاؤں میں داخل ہوگیا، جہاں کثیر مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا ۔ راجا اپنے ساتھیوں سمیت پہاڑوں میں جا چھپا، تاہم موسم برسات کا آغاز ہوتے ہی اس نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور کئی چوکیوں پر قبضہ کر لیا ۔ اسی دوران میں مغل لشکر میں وبا پھوٹ پڑی، جس سے بہت سے فوجی ہلاک ہوگئے ۔ میر جملہ نے ان مشکلات کا بڑی ہمت اور استقلال سے مقابلہ کیا اور برسات ختم ہونے پر دوبارہ دشمن پر حملہ کر دیا ۔ اہوم راجا اور اس کے امرا نے ایک بار پھر پہاڑوں میں پناہ لی اور بالآخر اس نے بیس ہزار تولے سونا، سوا چار لاکھ تولے چاندی، ۱۱۰ ہاتھی اور حرم شاہی کے لیے اپنی بیٹی پیش کرکے صلح کی درخواست کی ۔ آسام کے یہ علاقے چار سال تک مغلوں کے قبضے میں رہے ۔ ۱۶۶۷ء میں اہوم راجا نے پھر لڑائی چھیڑ دی اور تمام چھنے ہوئے علاقوں کی بازیابی کے علاوہ گوہاٹی پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا ۔ اس کے بعد کامروپ پر دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہ ہو سکی ۔ ۱۸۲۶ء میں یہ علاقہ برطانوی حکومت کی حدود میں شامل ہو گیا [اور اب بھارت کا حصہ ہے] ۔

مآخذ : (۱) H. Blochmann : *Koch Bihár, Koch Háje, and Asám, in the 16th and 17th centuries, according to the Akbarnámah, the Pádisháhnámah, and the Fathiya i, Ibriyah.*، در *JASB*، جلد ۴۱، حصہ ۱ (۱۸۹۲ء)، ص ۲۷۹ ببعد؛ (۲) E.A. Gait : *The Koch Kings of Kamarupa*، در *JASB*، ۶۲/۱ (۱۸۹۳ء) : ۲۷۹ ببعد؛ (۳) B. C. Allen : *Gazetteer of Kamrup*، الٰہ آباد، ۱۹۰۳ء، ص ۲۷ ببعد؛ [(۴) *Encyclopaodia Britannica*، طبع ۱۹۶۹ء، ۱۳ : ۲۰۱؛ (۵) *The Cambridge History of India*، ۴ (۱۹۶۳ء) : ۲۳۳، ۲۳۶؛ (۶) Majumdar : *An Advanced History of India*، بمدد اشاریہ؛ (۷) سید ہاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، مطبوعۂ کراچی، ۱ : ۵۵۴ ببعد] .

(ا آ، لائیڈن، بار اول [و ادارہ])

کامل : عربی علم عروض کی پانچویں بحر، * سالم بحر کے ہر مصرع میں مُتَفَاعِلُنْ تین بار ہوتا ہے ۔ اس کے تین عروض اور نو ضربیں ہیں :

پہلا عروض مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

دوسرا عروض مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

تیسرا عروض مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلَاتُنْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلَانْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ

مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُ

مُتَفَا اور مُتَفَا کے علاوہ تمام ارکان میں دوسرے

حرف کی حرکت کو متفاعلن میں ساکن کیا جا سکتا ہے (مُتَفَاعِلُنْ) یا دوسرا حرف صحیح مع حرکت کے گرا دیا جا سکتا ہے ۔ (مَفَاعِلُنْ) یا مُتَفَاعِلُنْ میں دوسری حرکت صحیح کے ساتھ والا حرف مد گرا دیا جا سکتا ہے (مُتَفْعِلُنْ) لیکن یہ بہت ہی شاذ و نادر ہے ۔

ان زحافات کے نتیجے کے طور پر مُتَفَاعِلُنْ کا رکن مُتَفَاعِلُنْ (= پر غلط ہے) (مُسْتَفْعِلُنْ ہونا چاہیے ؟) مَفَاعِلُنْ (= مُتَفَاعِلُنْ)، مُتْفَعِلُنْ (= مُفْتَعِلُنْ) بن جانے کا ایسا کرنے سے (یعنی مُتَفَاعِلُنْ کی تا کو اضمار سے ساکن کر دینے سے) اگر تمام قصیدے کے اندر کہیں بھی سالم مُتَفَاعِلُنْ نہ آئے تو پھر بحر رجز بن جائے گی ۔

(MOH. BEN CHENEB)

⊛ **تعلیقہ :** علم عروض کی بحر کامل بھی وافر کی طرح عربی سے مخصوص کی جاتی ہے اور وافر ہی کے ارکان کے اجزا کو مقدم مؤخر کرکے مستخرج ہوتی ہے، یعنی مَفَاعِلَتُنْ کو عِلَتُنْ مَفَا بنا کے مُتَفَاعِلُنْ سے بدل لیتے ہیں، لیکن یہ فارسی اور اردو میں بھی رائج ہے اور اس کے بعض اوزان فارسی اور اردو میں بہت دلپذیر اور مقبول عام ہیں ۔

اس کے عروض : (۱) مُتَفَاعِلُنْ (سالم)، (۲) مُتَفَاعِلُنْ = مُسْتَفْعِلُنْ (مضمر)؛ (۳) مُتَفَاعِلُتُنْ = مُسْتَفْعِلَاتُنْ (مضمر مرفّل)؛ (۴) مُتَفَا = فَعِلُنْ (احذ)؛ (۵) مُتَاعِلُنْ = مَفَاعِلُنْ (موقوص)؛ (۶) مُتْفَعِلُنْ = مُفْتَعِلُنْ (مخزول) چھے قسم کے آئے ہیں ۔

اس کی ضربیں : (۱) مُتَفَاعِلُنْ (سالم) (۲) مُتَفَاعِلُنْ = مُسْتَفْعِلُنْ (مضمر ؛ (۳) مُتَفَاعِلُتُنْ = مُتَفَاعِلَاتُنْ (مرفّل)؛ (۴) مُتَفَاعِلَانْ (مذال)؛ (۵) مُتَفَالُنْ = فَعِلَاتُنْ (مقطوع)؛ (۶) مُتَفَا = فَعِلُنْ (احذ)؛ (۷) مُتْفَعِلُنْ = مُفْتَعِلُنْ (مخزول) ؛ (۸) مُتَفَاعِلُتُنْ = مُسْتَفْعِلَاتُنْ (مضمر مرفّل)؛ (۹) مُتَفَاعِلَانْ = مُسْتَفْعِلَانْ (مضمر مذال)؛ (۱۰) مُتَفَا = فَعِلُنْ (مضمر احذ)؛ (۱۱) مُتَاعِلُنْ = مَفَاعِلُنْ (موقوص)؛ (۱۲) مُتْفَعِلَاتُنْ = مُفْتَعِلَاتُنْ (مخزول مرفّل) ؛ (۱۳) مَفَاعِلُتُنْ = مَفَاعِلَاتُنْ (مرفّل موقوص)؛ (۱۴) مُتَفَالُنْ = مَفْعُولُنْ (مضمر مقطوع)؛ (۱۵) مُتْفَعِلَانْ = مُفْتَعِلَانْ (مخزول مذال) ؛ (۱۶) مُتَاعِلَانْ = مَفَاعِلَانْ (موقوص مذال) سولہ قسم کی آئی ہیں ۔

عربی میں بحر کامل مسدس الاصل ہے ۔ اسے وافی و مجزو دو طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے ۔ دونوں کو ملا کر چوبیس وزن آئے ہیں ۔

وافی : (۱) مسدس، سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ چھے بار؛ (۲) مسدس، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلَاتُنْ؛ (۳) مسدس، صرف ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعْلُنْ ۔ بسکون عین ؛ (۴) مسدس، عروض و ضرب احذ، باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین ۔ دو بار ؛ (۵) مسدس، عروض احذ، ضرب احذ مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بسکون عین؛ (۶) مسدس، صرف ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین؛ (۷) مسدس، سب ارکان مضمر مُسْتَفْعِلُنْ چھے بار؛ (۸) مسدس، سب ارکان موقوص ۔ مَفَاعِلُنْ چھے بار اس وزن کو ہزج مقبوض شمار کرنا اولی ہے، اس لیے کہ ہزج میں صرف ایک عمل سے یہ وزن حاصل ہو جاتا ہے اور کامل میں تین مرتبہ عمل کرنا پڑتا ہے ؛ (۹) مسدس، سب ارکان مخزول ۔ مُفْتَعِلُنْ چھے بار ؛ (۱۰) مسدس، ابتدا مضمر، ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مَفْعُولُنْ ؛ (۱۱) مسدس ، عروض و ضرب مضمر مرفّل باقی ارکان مضمر ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلَاتُنْ ۔ دوبار؛ (۱۲) مسدس، صدر، ابتدا و حشو دوم مضمر، ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفَاعِلَانْ ؛ (۱۳) پانچ ارکان کا پورا شعر ۔ پہلا، دوسرا سالم ، تیسرا

چوتھا مضمر اور پانچواں رکن احذ مضمر ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُسْتَفْعِلُن مُسْتَفْعِلُن فَعْلُن ۔ بسکون عین ۔ یہ تیرھواں وزن پانچ رکن کا معقّد آیا ہے اور وافی ہی میں شامل ہے ۔

مجزو : (۱) مربع ، صرف ضرب مرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلاتُن؛ (۲) مربع، صرف ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان؛ (۳) مربع، سالم، مُتَفاعِلُن چار بار؛ (۴) مربع، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن؛ (۵) مربع، صرف ضرب مضمر مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مَفْعُولُن؛ (۶) مربع، صرف ضرب مرفّل مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُسْتَفْعِلاتُن؛ (۷) مربع، صرف ضرب مضمر مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُسْتَفْعِلان؛ (۸) مربع، صرف ضرب موقوص مرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن ۔ مَفاعِلاتن؛ (۹) مربع، صرف ضرب مخزول مرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُفْتَعِلاتُن؛ (۱۰) مربع، صرف ضرب موقوص مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلان؛ (۱۱) مربع، صرف ضرب مخزول مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُفْتَعِلان؛ یہاں تک عربی کے چوبیس اوزان ختم ہو گئے ۔

فارسی اور اردو میں یہ بحر از روے اصل دائرہ مثمن ہے ۔ وافی کے نو، مجزو کے تیرہ اور مشطور کے دس کل بتّیس اوزان رائج ہیں ۔

وافی : مثمن سالم ۔ مُتَفاعِلُن آٹھ بار؛ (۲) مثمن، عروض و ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان ۔ دو بار؛ (۳) مثمن، بے در بے ایک رکن سالم ایک مضمر ۔ مُتَفاعِلُن مُسْتَفْعِلُن مُتَفاعِلُن مُسْتَفْعِلُن ۔ دو بار؛ (۴) مثمن، عروض و ضرب مذال، صدر و ابتدا مضمر ، دونوں مصرعوں کے پہلے حشو سالم دوسرے مضمر ۔ مُسْتَفْعِلُن مُتَفاعِلُن مُسْتَفْعِلُن مُتَفاعِلُن دو بار؛ (۵) مثمن، ہر رکن موقوص ۔ مَفاعِلُن آٹھ بار ۔ ہمارے نزدیک اس وزن کو ہزج مقبوض شمار کرنا اولٰی ہے، اس لیے کہ ہزج میں صرف ایک عمل سے یہ وزن حاصل ہو جاتا ہے اور کامل میں تین بار عمل کرنا پڑتا ہے؛ (۶) مثمن، ترتیب وار ایک رکن سالم ایک موقوص ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن ۔ دو بار؛ (۷) مثمن، عروض و ضرب موقوص مذال باقی ترتیب وار ایک رکن سالم ایک موقوص ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مَفاعِلان ۔ دو بار؛ (۸) مثمن، صدر سے ضرب تک ایک رکن سالم ایک مخزول ۔ مُتَفاعِلُن مُفْتَعِلُن چار بار؛ مثمن، عروض و ضرب مضمر مقطوع، حشو اول و سوم مخزول مسکن باقی ارکان سالم ، مُتَفاعِلُن مُفْعُولُن مُتَفاعِلُن مُفْعُولُن ۔ دو بار.

مسجزو : (۱) مسدس، ہر رکن سالم، مُتَفاعِلُن چھے بار؛ (۲) مسدس ، عروض و ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن ۔ دو بار؛ (۳) مسدس، عروض و ضرب سالم، دونوں حشو موقوص، صدر و ابتدا مضمر ۔ مُسْتَفْعِلُن مَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ دو بار؛ (۴) مسدس، عروض و ضرب مضمر مذال، دونوں حشو مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُسْتَفْعِلُن مُسْتَفْعِلان ۔ دو بار؛ (۵) مسدس، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فعلاتن؛ (۶) مسدس، عروض و ضرب مضمر مقطوع ، دونوں حشو موقوص باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مَفاعِلُن مَفْعُولُن ۔ دو بار؛ (۷) مسدس، صرف ضرب احذ باقی سب ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلن ۔ بحرکت عین؛ (۸) مسدس، صرف ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن ۔ بسکون عین ؛ (۹) مسدس ، عروض مقطوع ، ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن ۔ مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن ۔ بحرکت عین؛

(۱۰) مسدس، عروض مقطوع، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین؛ (۱۱) مسدس، عروض و ضرب احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین دو بار؛ (۱۲) مسدس، عروض احذ، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین؛ (۱۳) مسدس، عروض و ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین - دو بار.

مَشْطُور: (۱) مربع، هر رکن سالم - مُتَفاعِلُن چار بار؛ (۲) مربع، عروض و ضرب مُرفّل باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلاتُن - دو بار؛ (۳) مربع، عروض و ضرب احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین - دو بار؛ (۴) مربع، صرف ضرب مرفّل باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلن مُتَفاعِلاتُن؛ (۵) مربع، صرف ضرب مذال باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان؛ (۶) مربع، عروض مذال، ضرب مرفل باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان - مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلاتُن؛ (۷) مربع عروض و ضرب مذال باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان - دو بار؛ (۸) مربع، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن؛ (۹) مربع، عروض و ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین - دو بار؛ (۱۰) مربع، عروض احذ، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین - مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین.

مآخذ: (۱) السّکاکی: مفتاح العلوم؛ (۲) محقق طوسی: معیار الاشعار؛ (۳) مظفر علی اسیر: زر کامل العیار؛ (۴) مرزا محمد جعفر اوج: مقیاس الاشعار؛ (۵) مظفر علی اسیر: شجرة العروض؛ (۶) قدر بلگرامی: قواعد العروض؛ (۷) میزان الافکار شرح معیار الاشعار؛ (۷) میر شمس الدین فقیر: حدائق البلاغت؛ (۸) صہبائی: معیار البلاغت؛ (۹) فان دک: محیط الدائرہ.

(مرزا ہادی علی بیگ)

الکامل: رک بہ الملک الکامل. *

کانْسُو: [یا کَنْسُو؛ عوامی جمہوریۂ چین کا * ایک صوبہ، جس کے شمال میں چینی منگولیا، جنوب میں چن گھائی اور سزْچُوأن، مشرق میں نِنگسِیہ ہُوی اور شِنسی اور مغرب میں سن کیانگ، اویغور کے صوبے واقع ہیں - سن کیانگ یا چینی ترکستان کا علاقہ پہلے کانسو ہی میں شامل تھا، لیکن ۱۸۸۴ء میں اسے علٰحدہ کر دیا گیا - صوبۂ کانسو کا رقبہ ۳۶۵۰۰۰ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ (۱۹۷۱ء میں) ہے] - یہ صوبہ سب سے پہلے شہنشاہ قبلای کے عہد میں ۱۲۸۲ء میں قائم ہوا تھا - کہا جاتا ہے کہ اس کا نام انتہائی شمال مغربی علاقے کے دو شہروں کانچوفو Kaučou-fu اور سچاؤ Sučou پر رکھا گیا تھا - ان دونوں شہروں کا ذکر حدودُ العالم اور گردیزی (قب Barthold: *Otčet o poiezdke v Irednyuyn Aziyu*، ص ۹۲) میں پہلے ہی آ چکا ہے، اوّل الذکر کا بشکل خامچو Khamčū (مغلوں کے عہد میں قَمْچُو Kamčū یا قَمْچی Kamči) اور ثانی الذکر کا بشکل سَخْچو Sakhčū (بعد ازاں شُکْچُو Shukčū یا سُوکچی Sūkči).

تیرھویں صدی عیسوی تک اس علاقے پر ترک (اویغور Uigur) یا تبتی (تنگوت Tangut) نسل کے غیر ملکیوں کی حکومت رہی - مغلوں کی فتح سے فوراً پہلے یہاں ایک تنگوت [تنگ قُوت] سلطنت قائم تھی، جس پر ہیا Hia یا سی ہیا Si-hia خاندان (۱۰۳۲ تا ۱۲۲۷ء) حکمران تھا اور اس کا دارالحکومت نِنگ ہیا Ning-hia تھا - رشیدالدین (طبع Blochet، ص ۴۸۴ ببعد) نے بارہ صوبوں (شینک shīnk، چینی: شِن shin) کی جو فہرست دی ہے اس میں دو صوبوں کو، جن کے صدر مقام علی الترتیب کِین

چان فو Kinčanfū (موجودہ سیان فو Sian-fū، شنسی کا دارالحکومت) اور قمچو Kamčū (کانچو Kančou) تھے، تنگوت (تنگ قوت) کی سلطنت میں شمار کیا ہے۔ در حقیقت قمچو Kamču اس زمانے میں کانسو کا صدر مقام تھا۔ کانسو اور شنسی دونوں ایک ہی حاکم کے ماتحت تھے، لیکن یہ حاکم کانسو کے نہیں بلکہ شنسی کے صدر مقام میں رہا کرتا تھا۔ کانسو اور شنسی کے درمیان دریاے ہوانگ ہو Hoang-ho حد فاصل کا کام دیتا تھا، چنانچہ کانسو کا موجودہ صدر مقام لن‌چاؤ فو Lanchou-fu اس زمانے میں شنسی میں شامل تھا۔ کِین چان فو Kinčainfū کے ضمن میں مارکوپولو (طبع Yule و Cordier، ۲ : ۲۴) نے منگلای Mangalai (م ۱۲۸۰ء، جسے رشیدالدین نے مینگ قالا Mingkāla لکھا ہے) کا ذکر کیا ہے کہ وہ قبلای Kūbilai کا تیسرا بیٹا اور تنگوت کا حکمران تھا۔ اس کے برخلاف رشیدالدین (ص ۴۹۵ ببعد) کے نزدیک اس مرتبے پر اس کا بیٹا انندہ Ananda فائز تھا۔ رشید الدین لکھتا ہے کہ اس علاقے میں اسلام کے غلبے کا باعث انندہ تھا۔ وہ ۱۲۷۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا (آٹھویں / چودھویں صدی کے اوائل میں اس کی عمر تیس سال تھی، وہی کتاب ص، ۳۶۰، س ۶) اور اس نے اپنے مسلمان رضاعی والدین کے ہاں پرورش پائی تھی۔ اس نے اپنے اسلام لانے کا کھلم کھلا اعلان اس وقت کیا جب ایران میں سلطان غازان مسلمان ہوگیا (یعنی تقریباً ۱۲۹۵ء میں؛ [رک بہ غازان]؛ نیز دیکھیے رشید الدین، ص ۶۰۲)۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی فوج ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا تھا (کتاب مذکورہ، ص ۶۰۰)۔ اسی طرح کسانوں کو چھوڑ کر تنگوت کے باقی باشندے بھی مسلمان ہو گئے (وہی کتاب، ص ۵۹۹)۔ اس کے چچا زاد بھائی اور قبلای کے جانشین تیمور (۱۲۹۴ تا ۱۳۰۷ء) نے اس تبدیلی مذہب پر اس سے مؤاخذہ کیا، لیکن انندہ بدستور اسلام پر قائم رہا اور کچھ مدت تک معطل رہنے کے بعد پھر اپنے مقبوضات پر بحال کر دیا گیا۔ ۱۳۰۷ء میں ایک گروہ نے اسے تخت نشیں کرنے کی کوشش کی؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک اور مدعی سلطنت، یعنی تیمور کا بھتیجا خَیْشان (۱۳۰۷ تا ۱۳۱۱ء) تخت نشین ہو گیا تو انندہ کو قتل کر دیا گیا (d'Ohsson: *Histoire des Mongols*، ۲ : ۵۲۵ ببعد) کہیں ۱۳۲۳ء میں انندہ کے بیٹے اورک تیمور کو تنگوت کا حاکم بنایا گیا (Blochet، در رشید الدین، ص ۳۶۲، حاشیہ c)۔

جیسا کہ مارکوپولو (طبع Yule و Cordier، ۱ : ۲۰۳، ۲۱۹) نے لکھا ہے، انندہ سے پہلے بھی کانسو میں مسلمان موجود تھے۔ دوسری طرف وہ ہوانگ ہو کے جنوب میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی ذکر نہیں کرتا (Ll، انگریزی، مادۂ چین، ۱ : ۸۵۱، میں غلطی سے *Mission d'Ollone*، ص ۴۳۵، کی پیروی کرتے ہوے مارکوپولو سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ صرف صوبۂ یُنّان Yünan ہی میں مسلمان موجود ہیں)۔ کہا جاتا ہے کہ ترکی بولنے والے سَلَر Salar جو آج کل ہوانگ ہو کے جنوبی کنارے پر آباد ہیں، منگ خاندان کے عہد (۱۳۶۸ تا ۱۶۴۴ء) ہی سے وہاں رہتے چلے آ رہے ہیں اور ان کو سرکش رعایا بتایا گیا ہے (W. W. Rockhill: *The Land of the Lamas*، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۴۰)، اگرچہ اس زمانے میں مسلمانوں کی کسی بغاوت کا ذکر نہیں ملتا۔ ۱۳۹۸ء کے قریب تیمور کی سر زمین تک یہ قصہ پہنچا کہ منگ خاندان کے بانی نے تقریباً ایک لاکھ مسلمان قتل کر ڈالے اور اپنی سلطنت سے اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالا ہے (نظام الدین شامی و عبدالرزاق سمرقندی، در Barthold: *Uluglek*، پیٹروگراڈ ۱۹۱۸ء، ص ۴۲ ببعد، حاشیہ ۶)، لیکن اس کی تصدیق چینی مآخذ سے نہیں ہوتی۔ ہاں مانچو عہد (از ۱۶۴۴ء)

میں کانسو کے مسلمانوں کی بغاوتوں کا ذکر ملتا ہے، جو ۱۶۴۶ء میں رونما ہوئیں اور پھر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں کئی بار ان کا اعادہ ہوا۔

زمانۂ حال میں جتنے مسلمان کانسو میں ہیں اتنے یقیناً دوسرے صوبوں میں نہیں ہیں (ان کی تعداد کے اندازے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے)۔ اب سے کچھ پہلے تک اسلامی تہذیب و تمدن اور سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز اِلوچاؤ Iločou (دارالحکومت لِن‌چاؤفو کے جنوب مغرب میں) تھا، جسے "چینی مکہ" کہتے تھے۔ اس سے پہلے بھی اِلوچاؤ کو خاص اسلامی شہر سمجھا جاتا تھا، (آبادی تقریباً ۳۰۰۰۰)؛ ۱۸۸۴ء میں سیاح G. Potanin (*Tangustko-Tibetskaya Okraine Kitaya*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۳ء، ۱ : ۱۶۹) کو بتایا گیا تھا کہ اب وہاں ایک مسلمان بھی باقی نہیں۔ آگے چل کر مسلمانوں کو فقط اتنی اجازت تھی کہ وہ وہاں علٰحدہ بیرونی بستیاں بنا کر رہیں (*Mission d'Ollone*، ص ۲۳۵)۔ کانسو میں مسلمانوں کا علاقہ دو علٰحدہ علٰحدہ حصوں میں منقسم ہے، یعنی جنوب مغرب میں اِلوچاؤ سِنِنگ Iločou-Sining اور شمال مشرق میں نِنگھیہ کِنت سِپئو Ninghia-Kintsip'u؛ درمیانی علاقے میں چینیوں نے پہاڑی قلعے تعمیر کر لیے ہیں (کتاب مذکور، ص ۲۵۳)۔ کِنت سِپئو کو، جسے بعض اوقات "چینی مدینہ" کہا گیا ہے، سب سے پہلے مشہور مصلح دین اور ایک بغاوت کے قائد ماھُوا لُنگ Ma Hua-Lung نے بسایا تھا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں بھی کانسو کی بہ‌نسبت شِنسی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے (Dabry de Thiersant : *Le Mhométisme en Chine*، ۱ : ۱۴۱، ۱۵۶)۔ ان کی زبان اور لباس بھی چینیوں سے مختلف تھا (کتاب مذکور، ص ۱۵۵)۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ عصر حاضر کے دُنگن Dungans یا تُنگن Tungans نے اس زمانے کے کہیں بعد چینی زبان اختیار کی ہوگی۔

یہاں کی بغاوتیں مقامی نوعیت کی تھیں اور انھیں اسلام کے جھنڈے تلے عام بغاوت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کانسو کی بڑی بغاوت میں، جو ۱۸۷۱ء میں شروع ہوئی تھی، شنسی میں مکمل امن و امان رہا (Dabry کتاب مذکور، ۱ : ۱۵۹)۔ شنسی میں جس بغاوت کا آغاز ۱۸۶۱ یا ۱۸۶۲ء میں ہوا تھا وہ کانسو میں اس وقت جا کر پھیلی جب شنسی سے نکالے ہوئے باغی وہاں پہنچے۔ کانسو میں شنسی سے کہیں زیادہ شدت سے یہ جنگ جاری رہی، جس کا وہاں کے مسلمان باشندوں پر، نیز صوبے کی عام معاشی خوشحالی پر تباہ کن اثر پڑا۔ جس طرح اس سے کچھ پہلے شنسی سے کانسو میں باغیوں کے اخراج کی وجہ سے شنسی کے مسلمانوں کی تعداد میں خاصی کمی ہو گئی تھی، اسی طرح اب (از ۱۸۷۲ء) کانسو سے بہت سے مسلمان اپنے دلیر رہنما بوَیان اَخُون Boyan-akhūn کے زیر قیادت مغرب کی جانب ترک وطن کر گئے۔ بویان اخون (اسے چینی میں بویان ہو Bo-yan-ho یا پای ین ہو Pai-yen-ho بھی لکھا جاتا ہے؛ اس (اسلامی نام محمد ایوب تھا) کی جائے ولادت کے متعلق مختلف بیانات ملتے ہیں۔ وہ مدت تک پیکنگ میں رہ چکا تھا اور بغاوت سے کچھ ہی دن پہلے کانسو میں آیا تھا۔ دسمبر ۱۸۷۷ء میں بویان اخون اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ روسی سرحد عبور کر کے سِمِرہ چیہ Semirečye میں داخل ہو گیا۔ چینی حکام نے مطالبہ کیا (جو ظاہر بات ہے کہ منظور نہیں ہوا) کہ اسے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ ۱۸۸۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد سِمِرہ چیہ میں مقیم دنگنوں نے اسے بطل قوم کی حیثیت دے دی اور اس کی شان میں گیت لکھے گئے۔ اس امر کا پتا نہیں چل سکا کہ کانسو میں بھی اس کی یاد احترام و عقیدت کے ساتھ منائی جاتی ہے یا نہیں۔ آخری بغاوت کا آغاز (۱۸۹۵-۱۸۹۶ء) سُلَر نے کیا اور کہا جاتا ہے کہ اس کا باعث ان کے حاکم کا

ایک فرمان تھا، جس کی رو سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آئندہ ایک چینی قدر و قیمت کے لحاظ سے دس مسلمانوں کے برابر سمجھا جائے۔ موجودہ جمہوری حکومت کے خلاف کانسو میں کسی قسم کی تحریک نظر نہیں آتی۔

[چین کے مسلمانوں کی مجموعی آبادی بدرالدین (چینی مسلمان) کی رائے کے مطابق کروڑوں تک پہنچی ہے، لیکن مصدقہ اطلاعات میسر نہیں۔ بہرحال ۱۹۵۵ء میں ایک کروڑ کے قریب بتائی گئی تھی اور ان میں ہوی، اویغور، قازق، خَلْخَہ، تاجیک، تاتاری، لاریک، چنگ سیانگ، سَلَس اور پاوآن شامل تھے۔ زیادہ تر مسلمان چین کے شمال مغرب میں سنکیانگ، کانسو اور چنگ ہای کے صوبوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن ہوی، چین کے اور حصوں میں بھی موجود ہیں۔ جمہوریۂ چین کے قیام (۱۹۴۹ء) کے بعد سے مسلمانوں پر سے پابندیوں کو ختم کرکے انھیں دوسرے چینیوں کے مساوی حقوق مل گئے ہیں اور انھیں شخصی قانون کی حد تک مذہبی آزادی حاصل ہے۔ چین میں مسجدیں موجود ہیں اور ان میں سے اکثر کے ساتھ مذہبی تعلیم کے مدارس بھی ہیں۔ کانسو کے صوبے میں لینسیا Linsia کی جامع مسجد میں عیدالفطر کے موقع پر بیس ہزار سے زائد لوگوں نے نماز ادا کی (دیکھیے مرقع تصاویر، المسلمون فی الصین، مطبوعۂ حکومت چین ۱۹۵۵ء)۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ الصین].

مآخذ : (۱) P. Darby de Thiersant : *Le Mohamétisme en Chine*، ۲ جلد، پیرس ۱۸۷۸ء؛ (۲) وہی مصنف : *De l'insurrection mohametane dans la Chine occidentale*، در *Journ. As.*، ۱۸۷۴ء، سلسلۂ ہفتم، ۳: ۱۷ تا ۴۵؛ (۳) بغاوت ۱۸۷۱ء کے متعلق ایک معاصر کا بیان، در *Mémoires concernants les Chinois*، ۹: ۳۲۲ ببعد؛ (۴) W. Wassiljew : *Der Mohammedanismus in China*، جرمن ترجمہ : *Der Erschliessung Chinas* از Dr. R. Hübe، مع اضافات از A. Conrady، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۸۰ تا ۱۱۰، ۲۲۰ تا ۲۳۶؛ (۵) *Mission d'Ollone 1906-1909*، پیرس ۱۹۱۱ء اور اس میں مندرج تصنیفات، نیز اس تصنیف کے بارے میں روسی رسالوں میں شائع شدہ مضامین، خصوصاً (۶) F. Payarkow : *Postliedniy epizod dunganskago vozstaniya (Pamyatnaya Kinizku Semir. Ohlasti) na 1901 god*، نیز علٰحدہ شکل میں، ۷۵ صفحات)؛ جو زیادہ تر دنگنی مآخذ سے لیا گیا ہے اور اس میں ایک دستاویز بھی شامل ہے (ایک مختصر سی روداد، جو مصنف کی درخواست پر دنگن طبیب لکوکنی Likokni نے لکھی اور جس کا M. Stashkow نے روسی میں ترجمہ کیا)؛ سَلَر اور ان کی زبان (فہرست الفاظ) کے بارے میں (۷) P. Potanin : *Tangutsko-Tibetskaya okraina Kitaya*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۸۹۳ء، ۱: ۱۶۹ ببعد، ۲: ۴۲۶ تا ۴۳۴؛ (۸) F. Poyarkon، در V. Ladigin : *Salari*، در *Etnograf. Obozrieniye*، ۱۸۹۳ء، شمارہ ۱، ص ۱ تا ۴۳.

(W. BARTHOLD)

کانگو : افریقہ کے ایک ملک اور ایک دریا کا نام۔ دریا وسطی افریقہ کے عظیم طاس کے پانی کا تنہا نکاس ہے۔ یہ طاس مشرق میں "جوف عظیم" (The Great Rift) کے مغربی کناروں، شمال میں کوہستان مونگا Monga، مغرب میں کرسٹل Cristal کے سلسلۂ کوہ اور جنوب میں سطح مرتفع لنڈا Lunda سے گھرا ہوا ہے۔ چونکہ اس دریا کے معاون، خط استوا کے شمالی اور جنوبی دونوں حصوں کا پانی اس میں لا کر ڈالتے ہیں، اس لیے دوسرے دریاؤں کے مقابلے میں یہ متواتر جاری رہتا ہے۔ اس دریا کے راستے میں جا بجا آبشار واقع ہیں، خصوصاً اس علاقے میں جو سٹینلے پول Stanley Pool اور سمندر کے درمیان واقع ہیں؛ لیکن اس کے باوجود دریا میں اس طرح کے طویل ٹکڑے موجود ہیں جن میں جہاز آسانی سے چل سکتا ہے اور

یوں ایک قطعی ناقابل عبور جنگلی علاقے میں آدمیوں اور سامان تجارت کی تھوڑی بہت نقل و حرکت ممکن رہی ہے ۔ ان گھنے جنگلوں کے اندرونی علاقوں میں افریقہ کے قدیم ترین باشندے، جو "بونے" (Pygmies) ہیں، اب بھی اپنے مخصوص اور امتیازی انداز میں شکار کھیل کر اور درختوں کے پھل کھا کر زندگی بسر کرتے ہیں ۔ دریاؤں کے کناروں پر یا دریاؤں کے قریب کے علاقوں میں اور آج کل زیادہ تعداد میں ان سڑکوں کے کنارے جو جنگلی علاقوں کو قطع کرکے بنائی جا رہی ہیں، وہ حبشی قبیلے آباد ہیں جن میں سے اکثر "بنتو" زبانیں بولتے ہیں ۔ یہ لوگ آہنی آلات استعمال کرتے ہیں اور تھوڑی بہت زراعت کرنے کے علاوہ شکار کرکے اور مچھلیاں پکڑ کر بسر اوقات کرتے ہیں ۔ یہ جنگلی قبیلے "بنتو" نسل کے لوگوں میں سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں اور اس کی وجہ بلاشبہہ یہ ہے کہ کسی کا ان تک پہنچنا بہت دشوار ہے ۔

لیکن کانگو کی وادی کے صرف درمیانی حصے میں گھنے جنگل ہیں ۔ اس کے آس پاس کے مرتفع گھیرے کو "نباتاتی جھاڑیوں" (Ochard Bush) کا علاقہ کہتے ہیں اور اس میں جھاڑیوں کو کاٹ چھانٹ اور جلا کر غلے کی کاشت کی جا سکتی ہے ۔ مشرق اور مغرب کی طرف گھاس کے وسیع میدان ہیں، جہاں مویشی پالے جا سکتے ہیں ۔ گرد و پیش کے ان علاقوں پر ہجرت اور فتح کے اثرات کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مقامی باشندوں نے انھیں علاقوں میں سیاسی جماعتیں قائم کر لی ہیں ۔ نیل اور کانگو کے بن دھارے میں واقع جنگل کے شمال میں Zande کی متعدد ریاستوں کا وجود سترھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی اس نو آبادکاری اور فتوحات کا نتیجہ ہے جن کا آغاز سوڈان کے جنوبی کناروں کی طرف سے ہوا تھا ۔ جنگل کے مشرقی جانب، مغربی وادی کی سطح مرتفع میں رواندا Ruanda اوروندی Urunde کی حکومتیں اور ان کی متعلقہ ریاستیں ان فاتحین کی یادگار ہیں، جو سوڈان یا جنوب مغربی حبش کی طرف سے یہاں آئے تھے اور جن کی چودھویں یا پندرھویں صدی عیسوی میں اس علاقے میں موجودگی کی شہادتیں ملی ہیں ۔ جنگل کی مغربی جانب، ہلکی جھاڑیوں کی سطح مرتفع اور گھاس کے اس کھلے میدان میں جو کانگو کی وادی کو اطلانتک کی ساحلی سطح مرتفع سے جدا کرتا ہے، بکانگو کی بہت بڑی حکومت بھی ان تھوڑے سے مہاجروں نے قائم کی جو شاید جھیل چاڈ Chad کی طرف سے یہاں آئے تھے ۔ اس حکومت سے پرتگالیوں نے پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تعلقات قائم کر لیے اور پھر اس کا اثر و رسوخ غابون Gaboon سے انگولا Angola تک پھیل گیا ۔ جنوب کی طرف کانگو کی حکومت کی بہت سی شاخیں تھیں جن میں سے ایک یقیناً کسائی Kasai کے بالائی علاقے کی ریاست باکوبہ Bakuba ہے ۔ لوبا کنڈا Luba-Kunda کی ریاستیں بھی، جو کانگو زمبزی Congo-ZambaZi کی درمیانی بلند سرزمین پر واقع ہیں، مہاجروں ہی کی قائم کی ہوئی ہیں، لیکن ابھی یہ بات تحقیق طلب ہے کہ یہ لوگ مغرب کی طرف سے یہاں آئے یا مشرق کی طرف سے ۔

لوگوں کی آمد و رفت سے جو خیالات مغربی بنتو افریقہ میں پھیلے وہ بنیادی طور پر وادی نیل کی قدیم دنیا کے باقیات تھے ۔ یہ خیالات یہاں سوڈان کے ان جنوبی اطراف سے آئے جو اس وقت تک اسلام کے زیر اثر نہیں آئے تھے ۔ اسی اثنا میں تقریباً چار صدیوں تک، یعنی پندرھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے وسط تک کانگو کی وادی پر، جس کے باشندے ہنوز کافر اور فطرت پرست تھے، یورپ دور ہی سے اپنا اثر ڈالتا رہا ۔ اس علاقے میں یورپ کا زیادہ تر مفاد غلاموں کی تجارت سے وابستہ تھا جس نے عیسائیوں کی ابتدائی تبلیغی کوششوں کو سخت نقصان

پہنچایا اور بالآخر ان کا گلا گھونٹ دیا ۔ پرتگال کے مخلوط النسل سوداگروں نے، جو Pombeiros کہلاتے تھے، سترھویں اور اٹھارھویں صدی ہجری میں لونڈا اور انگولا کی دوسری بندرگاھوں سے اپنی سرگرمیاں شروع کیں اور کانگو کی وادی کے جنوبی کناروں سے دور تک پھیلتے چلے گئے ۔ غالب گمان یہ ہے کہ تانبے کی کانوں والے Katanga کے علاقے میں کبھی ان کی مڈبھیڑ مشرقی افریقہ کے سمندری ساحل کی سواحلی بندرگاھوں کے سوداگروں سے ہوئی ہو جو ایسے ہی کچے مسلمان تھے، جیسے کچے عیسائی Pombieros تھے ۔ درحقیقت بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ جو تجارت انیسویں صدی سے پہلے بنتو افریقہ کے دور دراز علاقے میں ہوتی تھی اس میں زیادہ تر افریقہ کے نیام وزی (Nyamwezi) اور بسا (Bisa) جیسے قبائل کی کارفرمائی تھی اور ساحلی لوگوں کا خواہ عرب ہوں یا سواحلی، اس تجارت میں زیادہ ہاتھ نہ تھا ۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہیں انیسویں صدی میں جا کر جب مصر سے غلاموں اور ہاتھی دانت کے تاجر جنوبی سوڈان میں داخل ہوئے یا اس سے بھی بڑھ کر، جب زنجبار کے ابوسعیدی خاندان کی رعایا مشرقی افریقہ میں داخل ہوئی تو مسلمانوں کی کچھ تعداد وادی کانگو کے اطراف میں پہنچنی شروع ہوئی ۔ اجیجی (Ujiji) کی عرب نوآبادی کی بنیاد ۱۸۴۰ء کے چند سال بعد پڑی اور یوں ایک مستول والے جہاز سمندر پار کرکے تانگا نیکا کی جھیل کے کناروں پر پہنچنے شروع ہوئے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وادی کانگو کے مشرق اور وسطی علاقوں میں عرب مسلمانوں اور سواحلیوں نے کاروبار پر مکمل قبضہ کرلیا تھا تاآنکہ انیسویں صدی کے نویں عشرے کے اواخر اور دسویں عشرے کے اوائل میں بڑی طاقتوں نے استوائی افریقہ کے علاقے پر قبضہ کرکے اس کے حصے بخرے کر لیے ۔ جب بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ دوم نے کانگو کی خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی تو غلاموں کی تجارت کا خاتمہ ہوا اور عرب اور سواحلی جنگجو جن کی سرگرمیوں کا حال لِونگ سٹون، اسٹینلی اور دوسرے سیاحوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، نابود ہو گئے ۔ بہت سے عرب اور ان کے مشرقی افریقیہ کے ہم مذہب، جدید نوآبادیاتی نظام حکومت کے تحت مستقل طور پر کانگو میں آباد ہو گئے ۔ افریقیہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی لوٹ مار کے بجائے ایک پُرامن تجارتی زندگی شروع ہو گئی اور اس کے بعد سے اسلام کی تبلیغ میں بھی باقاعدگی اور تیزی پیدا ہوگئی ۔

کانگو کے مسلمانوں کی موجودہ تعداد تقریباً دو لاکھ ہے اور ان کی عظیم اکثریت شافعی مذہب کی پیرو ہے اور طریقۂ قادریہ سے تعلق رکھتی ہے ۔ ان میں خوجے [رَک باں] بھی ہیں، جو زیادہ تر روانڈا ۔ اروندی اور صوبۂ کیوو کے مشرقی حصے میں آباد ہیں اور کچھ سٹینلے وِل (Staneley-ville) اور کسنگو (Kasongo) میں رہتے ہیں ۔ یہ لوگ سرگرم تاجر ہیں اور خاصے منظم ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی ہیں ۔ احمدیوں [رَک باں] کی تعداد صرف چند درجن ہے، لیکن وہ کتابوں اور رسالوں کی تقسیم کے ذریعے اپنے مسلک کی تبلیغ کا کام بڑے انہماک سے کر رہے ہیں ۔

صوبۂ مشرق، صوبۂ کیوو اور روانڈا ۔ اروندی میں کم سے کم ۱۷۵ منظور شدہ مسجدیں ہیں ۔ رومنگوے (Rumungwe)، جھیل نیانزا (Lake Nyanza)، سٹینلے ویلے، پونتھیر ویلے، کرنڈو (Kirundu) اور کنڈو (Kindu) میں قرآنی مکاتب ہیں، لیکن کشش اور توجہ کا سب سے بڑا مرکز اجیجی (Ujiji) ہے، جہاں ایک بڑا مدرسہ ہے، جس میں بچوں کو عربی پڑھائی جاتی ہے ۔

مسلمانوں کے ہر ایک گاؤں میں ایک مسجد ایک (Drapeau de confrerie) لواء الاخوۃ (اسلامی

برادری کا جھنڈا)، ایک معلم اور ایک امام ہوتا ہے۔ زنجبار کے برخلاف، مشرقی کانگو کے مسلمانوں میں تعلیم کم ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو الدمیری یا السیوطی کی کتابیں پڑھتے ہیں، لیکن عموماً ان کی تعلیم قادریہ اشغال کی چند عام کتابوں تک محدود ہے۔ طریقے میں داخل ہونے کا دستور جسے مریدی کہتے ہیں، سینیغال (Senegal) میں بھی بہت عام ہے اور زنگیوں میں بڑی عزت و وقعت رکھتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے حصول سے عزت اور مرتبہ دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مسجدیں جو ایک خاص نقشے کے مطابق بنی ہوئی ہیں زنجبار کے نمونے کی ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر کی حیثیت ایک بڑے جھونپڑے سے زیادہ نہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صرف تھوڑے ہی سے ایسے ہیں جو عربی جانتے ہیں۔ یہاں کی عام بولی کسواھلی (Kiswahili) ہے، جو حقیقت میں ایسی بنتو ہے، جو عربی سے متأثر ہے۔ یہی زبان ساحل زنجبار کے باشندوں کی مادری زبان ہے۔ زنگی مسلمان جنھوں نے شمال سے جمہوریۂ وسطی کانگو اور چاڈ سے مغربی کانگو میں داخل ہونا شروع کر دیا ہے، ثقافتی اعتبار سے بہت اونچا معیار رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر سوداگر ہیں، جو عبادات سے متعلق کتابیں اور عربی میں لکھے ہوئے تعویذ فروخت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی جو عام عدالتیں یہاں قائم ہیں روز بروز شافعی مسلک اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

عام طور سے زنگی مسلمانوں کی تعلیم بڑی محدود ہوتی ہے اور انھیں اتنی عربی اور سواحلی بھی نہیں آتی کہ اسلام کی تبلیغ کا جو پروگرام ریڈیو سے نشر ہوتا ہے وہ اسے بھی اچھی طرح سمجھ سکیں۔ جو کتابیں عام طور سے مقبول ہیں، ان میں قرآن حکیم کے علاوہ زنجبار کے ایک شیخ حسن بن امیر الشیرازی کی تصنیف، المعراج الدردیر، العقد العقیان علی مولد الجیلانی، دلائل الخیرات، جس میں اور بہت سے متون، مثلاً شاذلی کی حزب البر، حزب البحر اور حزب النصر شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ قرآن مجید کے مکمل یا نامکمل ترجمے بھی سواحلی زبان میں موجود ہیں۔ سواحلی میں سورۂ یٰسٓ کا ترجمہ، میراث پر شیخ الشیرازی کا رسالہ اور نماز پر ایک بہت ہی مقبول عام رسالہ جس کا نام "Sula na Manrisho Yake" ہے، بھی قابل ذکر ہیں۔

مآخذ : (۱) J. B. Labat: *Relation historique de l'Ethiopie occidentale, contenant la description des royaumes du Congo, Angolla et Matamba*، پیرس ۱۷۵۳ء؛ (۲) Abbé Proyart: *Histoire du Loango, Kakongo et autres royaumes d'Afrique*، پیرس ۱۷۷۸ء؛ (۳) R. Avelot: *Les grands mouvements de peuples en Afrique, Jaga et Zimba*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۴) Delaisse et Poutrin: *Enquête coloniale*. . . ، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۵) P. Marty: *Études sur L'Islam au Sénégal, au Soudan, en Guinee Sural Côte d'Lvoire an Dahoney*، پیرس ۱۹۱۷ تا ۱۹۲۶ء؛ (۶) A. Gouilly: *L'Islam en A O F.*، پیرس ۱۹۲۶ء، *Notes et Études Docmentaires*، عدد ۱۹۵۲ (۱۹۴۷ء)، عدد ۱۶۴۲ (۱۹۵۲ء)؛ (۷) Lieut. L. Nekkech: *Le Mouridisme depuis 1912 st. Louis du Senegal*، برسلز ۱۹۵۲ء؛ (۸) J. Maes and Boone: *Les Peuplades du Congo Belge*، برسلز ۱۹۳۱ء؛ (۹) وہی مصنف: *Bibliographie du Musée du Congo Belge sous le titre: Bibliographie éthnographique du Congo Belge*، برسلز ۱۹۳۲ء؛ (۱۰) Foureau: *D'Alger au Congo par le Tchad*، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۱۱) Casati: *Dieci anni in Equatoria*، میلان ۱۸۹۱ء؛ (۱۲) R. P. Sacleux: *Dictionnaire Swahili-Français*، (مع عربی اشتقاقات)، پیرس ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۱ء؛ (۱۳) R. P. Vanden Eynde: *Grammarire Swahili*، برسلز بلا تاریخ؛ (۱۴) Cornet:

Le Congo physique، برسلز ۱۹۳۸ء؛ (۱۵) G. Hardy: *Vue génerale de l'Histoire d'Afrique*، بارچہارم پیرس ۱۹۴۲ء؛ (۱۶) Deschamps: *Les religions de l'Afique*، پیرس بلاتاریخ؛ (۱۷) H. Baumann and Westermann: *Les Peuples et les civilisations d l'Afrique*، مترجمۂ Hamburger، پیرس ۱۹۵۱ء؛ (۱۸) V.L. Grottanelli: *I. Bantu (Le Razze e i Popoli della Terra di R. Biasutti)*، ۳: ۴۴۵ تا ۴۶۳، Turin، بلاتاریخ ۱۹۵۵ء؛ (۱۹) *Revue de l'Université de Bruxelles*، ۱۹۵۴ء، ص ۵ تا ۱۶ اور ۱۹۵۷ء، ص ۲ تا ۳، مسائل کانگو کے لیے مخصوص ہے؛ (۲۰) P. Ceulemans: *La Qustion Arabe et le Congo*، برسلز ۱۹۵۹ء؛ (۲۱) H.M. Stanley: *Through the dark continent*، ۲ جلد، لنڈن ۱۸۷۸ء؛ (۲۲) مصنف مذکور: *Twenty-five years' progress in Equatorial Africa*، لنڈن ۱۸۹۷ء؛ (۲۳) مصنف مذکور: *In darkest Africa*، لنڈن ۱۹۰۴ء؛ (۲۴) R. P. Henri Neyrand: *L'Evolution religieuse de L'AEF.* در *E'tudes Américaines, L'AEF.*، پیرس بلا تاریخ: ۱۷؛ (۲۵) G. Eichtal: *De l'état actuel et de l'avenir de l' Islamisme dans l'Afrique centrale*، پیرس ۱۸۴۱ء؛ D. Westermann (۲۵): *Geschichte Afrikas*، Wiem...؛ A. Abel (۲۵): *Documents concernant le Bahr al Ghazal (1893-1894)*، در *Bulletin de l'Académie Royale des Sciences coloniales*، ۱۹۵۴ء، ۱۳۸۵ تا ۱۴۰۹؛ (۲۶) مصنف مذکور: *Les masulmans noirs du Manié'ma et de la Province Orientale*، برسلز Coll. de l'Institut de Sociologie Solovay، ۱۹۵۹ء؛ (۲۷) *Annuaire du Monde Musulam*۔ (مقالے کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو A. Abel و R. A. Oliver نے مہیا کی ہیں)۔

(ادارہ، ؤ ؤ، لائیڈن بار دوم)

* **کانم**: وسط سوڈان میں ایک علاقہ جو جھیل چاڈ Tchad کے مشرق اور شمال مشرق میں واقع ہے۔ چند برس قبل کانم کے متعلق ہماری معلومات صرف Bath، جس نے ۱۸۵۱ء میں اس کے کچھ حصے کا سفر کیا تھا اور Nachtigal جو بورکو (Borku) جاتے ہوے یہاں سے گزرا تھا، کے بیانات تک محدود تھیں۔ ۱۹۰۰ء کے بعد علمی وفود اور ان افسروں اور اہلکاروں کے اکتشافات سے جنھیں چاڈ کے فوجی علاقے کا نظم و نسق سپرد تھا، اس امر کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ مذکورۂ بالا دونوں سیاحوں کی ابتدائی معلومات کی تصدیق و تکمیل کی جا سکے۔

اگر کانم کے نام کے وسیع ترین مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو Nachtigal کی راے میں اس کا اطلاق اس علاقے پر ہوتا ہے جس کے شمال میں کور (Kawar) سے جھیل چاڈ کو جانے والی تجارتی شاہراہ گزرتی ہے، جنوب میں بحر الغزال [رک بآں]، مشرق میں ایگوئی (Eguei) کا نشیبی حصہ اور مغرب میں جھیل ہے اور یہ ۱۴ سے ۱۶ عرض بلد شمالی اور ۱۲ سے ۱۴ طول بلد مشرق (گرینوچ) کے درمیان واقع ہے۔ اس کے رقبے کا اندازہ ۲۷۰۰۰ سے ۳۰۰۰۰ مربع میل تک لگایا جا سکتا ہے۔ محدود معنوں میں کانم اس وسیع رقبے کے صرف ایک حصے پر مشتمل ہے جس کے مغرب میں جھیل چاڈ، جنوب میں بحرالغزال اور مشرق میں منگہ Mnaga کا پہاڑی علاقہ ہے جو اسے ایگوئی سے جدا کرتا ہے۔

مآخذ: H. Barth: *Travels and Discoveries in North and Central Africa*، لنڈن ۱۸۵۷ تا ۱۸۵۸ء جلد ۵، اشاریہ، بذیل مادّۂ *Kánemhú, Kánem*؛ (۲) Nachtigal: *Sahara und Sudan*، لائپزگ و برلن ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۹ء، جلد ۲، فصل ۵؛ (۳) H. Carbou: *La région du Tchad et du Ouadaï*، پیرس ۱۹۱۲ء (*Publications de l'Ecole des Lettres d'Alger*، جلد ۳۷ و ۳۸)؛ (۴) Cornet: *Au Tchad*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۵) G. Destenave:

Le lac Tchad Rev. Générale des Sciences ، ۱۹۰۳ء؛ (۶) Fouques : *Le Kanem, Revue, des troupes coloniales*, ۱۹۰۶ء؛ (۷) F. Foureau : *D'Alger au Congo par le Tchad* ، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۸) Mission : *Documents scientifiques* ، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۹) A. Foureau : *Deux annees dans le région du Tchad, Bull. du Comité de l'Afrique française, Renseignements coloniaux* ، ۱۹۰۳ء؛ (۱۰) Hartmann : *Der Islamische Orient* جلد ۱)؛ (۱۱) Cl, Huart : *Le Tchad et ses habitants, La Géographie* ، ۱۹۰۳ء؛ (۱۲) P. Joalland : *De Zinder au Tchad et conquéte du Kanem, La Geographie* ، ۱۹۰۱ء؛ (۱۳) Labatut : *Le territoire militaire du Tchad Bull. de la Soc. de géogr. D'Alger et de, l'Afrique du Nord* ، ۱۹۱۱ء؛ (۱۴) C. Largeau : *Situation des pays et protectorats du Tchad au point de vue économique Revue Coloniale* ، ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۴ء؛ (۱۵) Marquart : *Die Benin Sammlung* ص ۸۱ تا ۸۸؛ (۱۶) Becker : *Zur Gesch. des Östlichen Sudan* (*Der Islam*) ۱ : ۱۵۳ ببعد)؛ (۱۷) S. Passarge : *Zur Oberflächenges-taltung von Kanem, Petermann's Mitteil* ، ۱۹۰۴ء؛ (۱۸) H. A. MacMichael : *The Arabs in the Sudan* کیمبرج، ۱۹۲۲ء؛ (۱۹) G. J. Lethem : *Colloquial Arabic of the Shuwa Dialect* لنڈن ۱۹۲۰؛ (۲۰) *Notes on the Tribes etc, of Northern Nigeria* ، طبع دوم لاگوس ۱۹۲۲ء ص ۲۴۵ ببعد؛ (۲۱) نیز رک بہ ماخذ تحت مادّہ ہاے بورنو وادی۔

(G. YVER [تلخیص از ادارہ])

⊛ **کانم، بورنو**: کانم کے متعلق قدیم ترین حوالہ مسعودی کی مروج الذہب و معدن الجواہر میں ملتا ہے جو ۳۳۲ھ/۹۴۳ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے تینتیسویں باب میں وہ بنو کشم (حبشیوں) کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ان میں سے نوبیہ، بجہ اور زنج کے قبائل تو المغرب کی جانب جا کر آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ زغاوہ، کانم، مرکہ اور غانہ کے اطراف میں ہے۔ اس کے علاوہ وہ ممالک حبش کے دوسرے علاقوں اور دمدمہ میں بھی آباد ہیں (مسعودی : مروج، طبع de Meynard و Courteille ، پیرس ۱۸۶۴ء، ۳ : ۱ و ۲)۔

اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبیداللہ البکری، کتاب المسالک و الممالک (طبع Slane ، الجزائر، ۱۹۱۱ء)، میں طرابلس کے جنوب مغرب میں ایک زویلہ کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے کہ زویلہ کے صحرا سے پرے اور اس شہر سے چالیس روز کے فاصلے پر کانم کا ملک واقع ہے جہاں حبشی بت پرستوں کی ایک نسل آباد ہے اور ان تک پہنچنا بہت مشکل ہے (ص ۱۱)۔

المقریزی (م ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء) نوبیہ کے حالات کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے: "نیل کے ایک پہلو پر ایک ملک ہے جس کا نام کانم ہے اور وہاں کا بادشاہ مسلمان ہے۔ یہ ملک ملی (مالی) سے بہت دور ہے۔ اس کے صدر مقام کو الجمی (الجمع) کہتے ہیں۔ اس ملک کا پہلا شہر جو مصر کی جانب ہے، زلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس شہر اور ککہ (کاکا) کے درمیان جہاں سے دوسری حد شروع ہوتی ہے، پورے تین ماہ کا سفر ہے۔ یہ سلطنت جو افریقیہ اور برقہ کے درمیان واقع ہے، جنوب کی جانب تک غرب الاوسط کے متوازی پھیلتی چلی گئی ہے۔ یہاں کی زمین خشک، پتھریلی اور بنجر ہے" (اقتباس در Quartremere : *Memoires*، ۲ : ۲۷ و ۲۸)۔ عرب مصنفین نیل کا نام نائیجر کو دیتے رہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ نیل ابیض سوڈان کے جنوب میں پہنچ کر نائیجر سے جا ملتا ہے اور "الکانم وہ بہت بڑا علاقہ ہے جسے نیل مبارک خوب سیراب کرتا ہے

اور الجمع اور التاجو کی حکومت کا درمیانی فاصلہ دس منزلوں کے برابر ہے" (اقتباس، در Hamker : *Spec. Cat.*، ص ۲۰۶) اور ان (اہل نوبیہ) کے نزدیک الکانم ہے - یہ ایک بڑی قوم ہے جس میں زیادہ تر مسلمان ہیں - ان کا شہر الجمہ (الجمع) ہے (کتاب مذکور، ص ۲۰۵)- المقریزی کے زمانے میں کانم کا بادشاہ الحاج ابراہیم بن آل سیف بن ذویزن تھا اور یہاں کا بڑا شہر کانم تھا جو بورنو کا صدر مقام تھا (کتاب مذکور، ص ۲۰۷)- ظاہر ہے کہ صدر مقام کا نام اس ملک کے نام سے ملتبس ہو جاتا ہے .

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء سے کچھ پہلے سلطنت کانم یا بورنو میں جس کا بڑا شہر الجمہ (جمی Njimye درکانم) تھا، ایک بادشاہ ہیوم Hume نامی حکومت کرتا تھا - وہ مسلمان تھا جس نے ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی تھی - وہ نسلاً بربری اور بردوعہ کے قبیلے سے تھا - وہاں کے باشندے آہستہ آہستہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے - H. Barthotd (*Travels and Discoveries in North and Central Africa*، انگریزی ترجمہ ۱۸۵۷-۱۸۵۸، ص ۲۶۴ و ۲۶۵، حاشیہ) اہالی بورنو کی ایک عام روایت کے حوالے سے لکھتا ہے کہ سیفوہ Séfuwa نے اس وقت اسلام قبول کیا جب وہ مصر ہی میں آباد تھے اور ان کو اسلام کی تبلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خاص ایلچی نے کی تھی - اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں اور صرف یہ سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ یہ ایک عام روایتی بیان ہے جو بورنو میں زبان زد خلائق ہے - Mischlich : *Contributions to the History of the Hausa States*، در *Journ Afr. Socy.*، ۳ (۱۹۰۴ - ۱۹۰۵: ص ۴۵۵ تا ۴۷۹) میں یہ روایت ذرا اختلاف سے بیان ہوئی ہے - اس روایت کے مطابق بورنو کے ایک بادشاہ دلمی نامی نے اسلام کی ترقی کا حال سنا اور اس نے اپنا ایک نمائندہ مکۂ معظمہ میں اس غرض سے بھیجا کہ وہاں سے ایک مبلّغ بورنو بھی بھجوایا جائے - اس درخواست کی تعمیل میں خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے (۱۴ھ تا ۲۳ھ) عمرو بن العاصؓ کو چند صحابیوں کے ساتھ وہاں بھیج دیا - ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور بورنو کے تمام لوگ [اسلام کے اصولوں اور اچھائیوں سے متأثر ہو کر بہت جلد مسلمان ہو گئے] - البکری کے بیانات کہ اس کے زمانے میں اہالی بورنو بت پرست تھے اور ان کے ہاں جانا کوئی آسان کام نہ تھا، [محل نظر ہیں].

المقریزی کے زمانے میں جو مسلم خاندان وہاں حکومت کرتا تھا، اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ وہ تین صدیوں سے زیادہ عرصے سے وہاں حکومت کر رہا تھا - وہ بیان کرتا ہے کہ اس ملک میں سب سے پہلا مبلّغ اسلام ایک شخص حاجی ہادی العثمانی پہنچا، جو اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کی اولاد میں سے بتاتا تھا - اس کے بعد اس ملک کی حکومت قبیلۂ یزنی میں منتقل ہو گئی جو سعید بن ذویزن کی اولاد میں سے ہیں - یہ لوگ امام مالکؒ کے پیرو ہیں اور مذہبی عقائد و فرائض کے پورے پابند ہیں - شہر فسطاط (قاہرۂ قدیم) میں انھوں نے ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء میں مالکی فقہ کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کیا اور یہ مدرسہ ابن راشق کے نام سے موسوم تھا - یہ وہی مدرسہ ہے جس میں ان کے سفیر آ کر ٹھیرا کرتے تھے (المقریزی نیز Quatremere : *Memoires*، ۲ : ۲۸)- ہادی کے متعلق، جو ویسے تو ایک غیر معروف شخص ہے، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے خاندان سے تھا جس کی تصدیق اس کے نام کی ترکیب سے ہوتی ہے ، لیکن اس کا براہ راست حضرت عمرؓ کی اولاد سے ہونا ظاہر نہیں ہوتا - حضرت عثمانؓ قبیلۂ قریش کے اموی خاندان سے تھے - اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ یہ اور قسم کی روایت ہو اور کسی بعد کے زمانے میں اموی خاندان کے کچھ پناہ گزینوں نے یا ان کے حلیفوں نے

افریقیہ کے کسی دور دراز مقام میں جا کر پناہ لے لی ہو۔ المقریزی اپنی تصنیف میں کسی دوسری جگہ اپنے زمانے میں یہ لکھتا ہے کہ کانم میں بنو سیف حکومت کرتے تھے (مذکورۂ بالا) اور اس بات کی تصدیق تاریخ بورنو (*Chronicle of Bornu*) سے بھی ہوتی ہے جو دسویں صدی ہجری کی ایک تصنیف ہے اور اس کے اقتباسات لائپزگ اوریئنٹل سوسائٹی (۱۸۵۲ء، ص ۳۰۵ ببعد) کے "جرنل" میں M. Blau کے ترجمے اور حواشی کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی رو سے بھی بورنو کے مسلم حکمران خاندان کا سلسلۂ نسب سیف بن ذویسع تک پہنچتا ہے جس کی وجہ سے وہ "سیفوہ" یا "یزنی" کہلانے لگے۔ سیفوہ یا سفوہ کے نام سے، جو اس خاندان نے اختیار کیا تھا، اب بورنو میں کوئی بھی واقف نہیں (*Doc. scient. de la Mission Tilho*، پیرس ۱۹۱۱ء، ص ۳۵۲)۔ قدیم زمانے کے حکمرانوں کو تُبَّع کہتے تھے اور یہ نام یمن کے قدیم حکمرانوں کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ سلاطین کانم و بورنو کی فہرست کے مطابق (کتاب مذکور، ص ۳۴۲ تا ۳۵۱) مورث اعلیٰ سیف بن ایسّتہ Aissata تھا جسے مکّتہ (مکّی) کہہ کر پکارتے تھے۔ اس طرح یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ عربی نسل سے تھے۔ کوئھوں کی اصل بھی وھی تھی جو تبّعون کی تھی۔ تبّعون کی طرح وہ بھی رفتہ رفتہ یمن سے کانم آئے تھے اور سفر میں غریب طلبہ کی طرح بسر اوقات کرتے تھے۔ یمن سے کانم تک کے سفر کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا ہوگا۔ وہ دائرویہ Dieraoua کے علاقے میں سترھویں صدی ہجری کے نصف میں آباد ہونے لگے۔ اس زمانے میں تبع کزرسومو Kazer Soumo ین حکومت کرتے تھے اور انھوں نے سارے ملک پر اپنا تسلط جما لیا تھا اور ان کی مملکت کی حدود چاڈ سے لے کر نائیجر تک وسیع ہو گئی تھیں (کتاب مذکور، ص ۲۹۶)۔ یہ کوئی مستند تاریخی بات نہیں بلکہ محض زبانی روایت ہے اور غالباً بعد کے زمانے میں وضع ہوئی کہ سفوہ یا تبع یمنی یا مکّی الاصل تھے۔ عبدالرحمن بن عبداللہ بن عمران بن عامر جو سیدی ٹمبکٹو کے لقب سے مشہور ہیں، اپنی تصنیف تاریخ السودان (طبع ومترجمۂ O. Houdas، پیرس ج ۱، متن ۱۸۹۸ء، ج ۲، ترجمہ ۱۹۰۰ء) میں لکھتے ہیں کہ حکمران خاندان یمن سے آیا تھا، لیکن یہ تاریخ سترھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور اس اعتبار سے صرف مرقجہ روایات ہی کی حامل ہو سکتی ہے۔ بقول المقریزی اسلام کے بعد پہلا بادشاہ محمد بن جبل بن عبداللہ بن عثمان بن محمد (*Spec. Cat.* : Hamaker، ص ۲۰۵) تھا، لیکن فہرست (مذکورۂ بالا) میں اس کا نام ھیوم Hume درج ہے جو دگ یا دک کی اولاد میں سے تھا۔ قدیم کافر خاندان دگوہ یا آل دگ کے نام سے مشہور تھا اور بعد کا مسلم خاندان آل ھیوم کہلاتا تھا۔ Barth کے اعداد و شمار کے مطابق عہد ھیوم ۹۷۰ء تا ۱۰۹۱ھ کے لگ بھگ ہے، نختیگل Nachtigal ۱۰۶۰ء تا ۵۲۴ھ کے زمانے کو ترجیح دیتا ہے اور مشن تلھو Mission Tilho کی رائے میں یہ زمانہ ۴۶۳ء تا ۴۸۶ھ کے درمیان کا ہے (*Doc. scient de la. Miss. Tilho*، ص ۳۴۸ تا ۳۴۹)۔ زیادہ معقول بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کانم کے مسلم حکمرانوں کا عہد حکومت پانچویں صدی ہجری کے آخری حصے سے شمار کیا جائے اور المقریزی کے اس بیان سے کہ "اس کے بعد (ھادی العثمانی) حکومت یزنیوں میں منتقل ہو گئی" (مذکورۂ بالا) یہ مراد لی جائے گی کہ ھادی پہلا شخص تھا جس نے اسی صدی کے پہلے حصے میں اس ملک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔

پانچویں صدی سے کانم کے مسلمانوں اور مسلمان بادشاھوں کے متعلق تو بہت حوالے ملتے ھیں، لیکن اس سے پہلے زمانے کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں احیاے دین کے جذبے

سے سرشار ہو کر مسلمان شمال کی جانب سے مغربی سوڈان میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہے تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کانم میں اسلام شمال کی جانب سے آیا ؟ آرنلڈ *Preaching of Islam*، ص ۳۲۰ میں لکھتا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت اس ملک میں مصر کی جانب سے ہوئی، لیکن اپنے اس بیان کی تائید میں وہ کوئی سند پیش نہیں کرتا۔ غالباً اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ ایک قدیم راستہ جبل النری J. en-Nari سے ہوتا ہوا ایک نخلستان میں سے گزرتا تھا، جو اب غیر آباد ہے اور وہاں سے مشرق شمال مشرق کی جانب مصر جا پہنچتا تھا۔ اس راستے کے قدیم آثار ابھی باقی ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی علم ہے کہ بورنو کے علاقے کے حاجی پہلے زمانے میں بھی اور اب بھی اکثر اوقات مصر کے راستے ہی مکۂ معظمہ آتے جاتے ہیں۔

تاریخ بورنو (مذکورۂ بالا) میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو صنہاجہ بربریوں (*Jour. Leipz. Or. Soc*، ص ۳۰۵ ببعد) سے منسوب کیا گیا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ہوسہ زبان میں بربریوں کے نام سے "بورنو قوم" مراد لی ہے۔

اسلامی دنیا میں بورنو کے تعلقات رسل و رسائل تین اطراف سے قائم تھے، شمال مشرق بذریعۂ مصر بالائی، شمال بذریعۂ طرابلس اور شمال مغرب بذریعۂ المغرب (تونس، الجیریا، مراکو)۔ مشرق کی طرف کو نظر انداز کر دینا چاہیے کیونکہ سولھویں صدی عیسوی تک اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ جب اسلام پہلے پہل کوردوفان Kordofan اور دارفور کے علاقوں میں پھیلا تو اس وقت اس جانب سے کوئی اسلامی یا عرب اثر اس ملک پر پڑا ہو۔ اس وقت تک نوبیہ اور حبشہ (ای سینیا) کی وجہ سے راستوں میں رکاوٹ تھی لیکن جب نوبیہ میں نصرانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

۷۸۸ھ/۱۳۸۸ء میں حکمران خاندان بورنو کو ملک سے خارج کرکے اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ بلالہ Bulala کے رستے مغرب کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد مائی علی غجدنی Mai 'Ali Ghejideni نے برنی یا بورنو جدید کی حکومت قائم کی۔ ۱۸۰۸ء میں حکومت فلہ نے بورنو پر حملہ کیا اور اس سے اگلے سال اسی حکومت نے بورنو قدیم کو تباہ کر دیا۔

۱۸۹۳ء کے لگ بھگ ربہ حبشی نے جو زبیر پاشا کا غلام تھا، بجرمی Bagermi کی جانب پیش قدمی کی اور بورنو پر حملہ کر دیا۔ احسم Ahsem شاہ بورنو نے راہ فرار اختیار کی اور ربہ نے شہر میں داخل ہوکر اسے پوری طرح تباہ کرکے دکوہ Dikwa میں نیا صدر مقام بنا لیا۔ ربہ ۱۹۰۰ء میں مارا گیا اور اس کے دو سال بعد انگریزوں نے Shehu Garbai کو کہ Kuka میں تخت نشین کر دیا۔

(DE LACY O'LEARY [و تلخیص از ادارہ])

کانو (الحوصة کی زبان میں کانُو): وسط سوڈان * کا ایک شہر جو قوقه (قاموس الاعلام، ۵: ۳۷۵۱) سے ۳۰۰ میل مغرب اور سکوتو Sokoto سے ۲۹۰ میل مشرق جنوب مشرق میں، سطح سمندر سے ۱۲۰۰ فٹ کی بلندی اور ۱۲ درجے ۲۷ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸ درجے ۲۰ دقیقے طول بلد مشرق (گرینچ) پر واقع ہے۔ کانو ایک دلدلی میدان کے وسط میں آباد ہے جس پر گورون دُچی Goron Duchi اور دَلَہ کی منفصل خشک چٹان والی پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔

مآخذ: (۱) Leo Africanus، طبع R. Brown، لنڈن (Hakluyt Society)، ۱۸۹۶ء، ۳: ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۸ ببعد؛ (۲) *Description de l'Afrique*، ج ۷، طبع Schefer، ۳: ۳۰۵؛ (۳) O. Temple: *Notes on the Tribes etc. of Northern Nigeria*، ۱۹۲۲ء، ص ۳۶۳ تا ۳۸۶؛ (۴) H. Barth: *Travels and Discoveries in North and Central Africa*، ۱۸۵۶-۱۸۵۸ء،

۲ : ۹۷، ۱۰۷، ۱۲۱ تا ۱۲۵، ۱۴۳، ۵ : ۳۵۸ ؛ (۵) Schön : *Dictionary of the Hausa Language*، لنڈن ۱۸۷۶ء بذیل مادّۂ قابو، ص ۱۰۳، ۱۰۴ (۶) *Nigerian Magána Hausa* : Schön (۷) ؛ *District. Gazetteers*، لنڈن ۱۹۱۸ء، ص ۲۶۳ تا ۲۶۵ (۸) Harris : *Hausa Stories*، Weston Super Mare تاریخ ندارد، ص ۸۲ تا ۸۹؛ (۹) P. L. Monteil : *De Saint Louis à Tripoli par le Tchad*، پیرس ۱۸۹۳ء، باب ۱۰؛ (۱۰) C. H. Robinson : *Hausaland*، لنڈن ۱۸۹۶ء، باب ۸؛ (۱۱) C. P. Lucas : *Historical Geography of the British Colonies*، ج ۳، ۱۹۱۳ء؛ (۱۲) *Le Commerce des caravanes tripolitaines dans la région du lac Tchad et le Sokoto.* — *Bulletin du Comité de l'Afrique Française*، ۱۸۹۸ء، *Renseigrements coloniaux*؛ (۱۳) Marquart : *Die Benin-Sammlung*، ص xcx تا xcxii؛ (۱۴) Mischlich و Lippert : *Beiträge zur Geschichte der Haussasta-aten Mitth. d. Sem. f. Or. Sprachen*، سلسلۂ ششم، ۳ : ۵ تا ۷۰؛ (۱۵) Paul Staudinger : *Im Herzen der Haussaländer*، لائپزگ ۱۸۹۱ء نیز رک بہ مآخذ بذیل مادّۂ هوسه (Hausa).

(تلخیص از ادارہ) G. Yver]

* **کانَ و کانَ** : جدید عربی نظم کی ایک قسم ہے۔ یہ اہل بغداد کی ایجاد ہے اور اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ قصہ گو اپنے قصے کے شروع میں کَان و کَان کہا کرتے تھے، جس کا مطلب ہے "ایک زمانے میں ایسا ہوا"۔ ابتدا میں "کان و کان" قصے کہانیوں کو کہتے تھے جن کی عبارت میں قافیہ بندی کا اہتمام کیا جاتا تھا، بعد میں دیگر مواضع کے لیے اور بالخصوص اخلاقی رجحان رکھنے والے مواضع کے لیے یہ طرز بیان استعمال کرنے لگے۔ عامی زبان میں اس کا استعمال صرف مشرق میں ہوتا تھا، خاص کر بغداد میں جہاں یہ اسلوب ایجاد ہوا۔ "کان و کان" ایک قسم کی نظم ہے جس میں دو ابیات کا ایک بند ہوتا ہے۔ اس کا وزن ماہرین عروض یہ بتاتے ہیں:

مستفعلن فاعلاتن مستفعلن مستفعلان
" " " فعْلان

لیکن راقم مقالہ نے جو ۴۲ نمونے اس قسم کی نظم کے دیکھے ہیں، ان میں پہلے مصرع کا آخر رکن مستفعلن ہوتا ہے، مستفعلان نہیں، لہٰذا ہر بند کے دوسرے بیت کا آخری مصرع ہم قافیہ ہوگا۔ اس کے اہم ترین زحافات یہ ہیں: مستفعلن سے ص یا ف گر جاتی ہے اور فعْلان کو اکثر فاعلان کر لیتے ہیں۔ الابشیہی: المستطرف، بولاق ۱۲۹۲ھ، ۲ : ۲۷۳ ببعد؛ ابوالفداء: تاریخ، قسطنطنیہ ۱۲۸۶ھ)، ۴ : ۱۵۸؛ اور بالخصوص حریفیش: الروض الفائق، قاہرہ ۱۳۱۱ھ ص ۲۳، ۲۶، ۲۹، ۳۳، ۳۴، ۴۲، ۵۳، ۵۵، ۷۱، ۷۴، ۷۷، ۸۰، ۸۶، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۴، ۱۶۹، ۱۸۱، ۱۹۱، ۲۰۴، ۲۱۷ میں کان و کان کے نمونے دیے ہیں۔

مآخذ : ان مآخذ کے علاوہ جن کا ذکر مقالۂ عروض میں آیا ہے، دیکھیے (۱) الخفاجی: شفاء الغلیل، قاہرہ ۱۳۲۵ ص ۹؛ (۲) المحبّی: خلاصة الاثر، قاہرہ ۱۲۸۴ھ، ۱ : ۱۰۹؛ (۳) الابشیہی: المستطرف، بولاق ۱۲۹۲ھ، ۲ : ۲۵۲ تا ۲۷۷؛ (۴) محمد طلعت: غایة الارب فی صناعات شعرالعرب، قاہرہ ۱۳۱۶ھ، ص ۹۲ تا ۱۱۰؛ (۵) محمد زیات: تاریخ آداب اللغة العربیه، قاہرہ (بلا تاریخ)، ۱ : ۱۲۹ تا ۱۵۰؛ (۶) H. Gies : *al-Funūn-al-Sab'a.-Ein Beitrag z. rennin. sieben neuerer arab. Versarten*، مقالہ، لائپزگ ۱۸۷۹ء، ص ۵۳ تا ۶۲۔

(Moh. Ben Cheneb)

* **کانون** : ایک مہینے کا نام جو تَدْمُر (Palmyra) کے قدیم کتبوں میں بھی ملتا ہے (دیکھیے S. A. Cook : *A Glossary of Aramaic Inscriptions*، بذیل مادّہ) اور مَرْحیشوان کا مرادف ہے۔ بعد کے زمانے میں یہ مہینوں

کے سریانی ناموں میں (دیکھیے Payne Smith : *Thesau-rus Syr.*، ذیل مادّہ) کانون قدم (kᵉdēm) یا قدمایا (kaḏmāyā) اور کانون حرای ḥrāy یا حرایا ḥrāyā کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ یہاں دونوں کانون بالترتیب نواں اور دسواں مہینا ہیں ۔ البیرونی اپنی کتاب الآثارالباقیہ، (طبع Sachau، ص ۶۰) میں سریانی ناموں کو صحیح طور پر کانون قدیم اور کانون حرای کی شکل میں نقل کرتا ہے ۔ عربی اصطلاح میں یہ مہینے کانون الاوّل اور کانون الآخر کہلاتے ہیں ۔ ان میں سے پہلے کا ذکر حدیث میں ایک قابل لحاظ عنوان سے آیا ہے ۔ مسلم: صحیح، کتاب الاشربہ، حدیث ۹۹، میں پانی کے برتنوں کو ڈھانپ کر رکھنے کے قاعدے کے ضمن میں جس کا ذکر دوسرے مقامات پر بھی آیا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ ''سال میں ایک رات ایسی بھی آتی ہے جس میں وبا کسی بے ڈھکے برتن کو نہیں چھوڑتی'' ۔ اسی حدیث کی ایک اور روایت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے : ''ہمارے درمیان رہنے والے باہر کے لوگ (اعاجم) اس کا خدشہ کانون الاوّل میں ظاہر کیا کرتے تھے''.

(A. J. WENSINCK)

* **کانی ابوبکر** : دور عثمانیہ میں قدیم دبستان ادب کا ایک قابل ذکر شاعر اور ایک صاحب طرز نثر نگار، ایشیائے کوچک میں توقاد Tokad کے مقام پر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا ۔ ابھی نوجوان ہی تھا کہ اس نے اپنے آبائی شہر میں ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کر لی ۔ وہ سلسلۂ مولویہ سے وابستہ تھا اور اسے توقاد کی خانقاہ مولویہ کے شیخ کی خدمت تفویض کی گئی تھی ۔ اس کی زندگی کا ایک اہم انقلاب انگیز واقعہ یہ ہے کہ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴-۱۷۵۵ء میں حکیم اوغلو علی پاشا کا توقاد سے گزر ہوا، جسے طربزون Trebizond سے قسطنطنیہ تیسری بار صدر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے لیے لایا گیا تھا ۔ کانی نے اس کی خدمت میں ایک قصیدۂ استقبالیہ اور ایک مادّۂ تاریخ پیش کیا، جس سے وہ سن رسیدہ سیاست دان اس قدر متأثر ہوا کہ اس کے شیخ طریقت سے اجازت لے کر کانی کو اسی وقت اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا اور دیوان شاہی میں ایک عہدہ عطا کر دیا ۔ اس طرح کانی کے سامنے اعلٰی سرکاری عہدے حاصل کرنے کا راستہ کھل گیا، لیکن جاہ طلبی کا مادّہ اس کی فطرت ہی میں نہیں تھا: اسے تو وہی بے نیازی کی اور ایک حد تک پابندیوں سے آزاد زندگی پسند تھی جو وہ اپنے آبائی شہر میں بسر کرتا رہا تھا ۔ وہ ایک سست ہمت شخص تھا اور اپنی طویل عمر کے آخری ایام میں کہیں جا کر اس نے اپنے طریقے کی سالکانہ زندگی کی طرف رجوع کیا تھا، چنانچہ اس نے اپنے سرپرست کی معزولی سے جو صرف دو ماہ تک عہدہ سنبھالنے کے بعد پیش آئی، یہ فائدہ اٹھایا کہ قسطنطنیہ کی ملازمت ترک کر دی ۔ اس کے بعد اس کی سرگرمیاں صرف صوبوں، یعنی سلستره (Silistria)، افلاق (Wallachia) اور بخارسٹ Bucharest، تک محدود رہیں ۔ وہ خاصے عرصے تک گورنر الیگزنڈر کے ہاں معتمد دیوان رہا ۔ سنایہ Sinaya کے عجائب گھر میں ایک تصویر ہے، جس میں یہ دونوں اکھٹے نظر آتے ہیں ۔ بالآخر جب یکن محمد پاشا، جو پیشتر ازیں کانی کا بہت گہرا دوست رہا تھا، صدارت عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوا (۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) تو اس نے کانی کو قسطنطنیہ بلا لیا، لیکن اس طلبی سے بدبختی کے سوا کانی کے ہاتھ کچھ نہ آیا ۔ کانی نے رسوم و آداب کا مطلقاً خیال نہ کیا اور صدر اعظم سے پرانے زمانے کی طرح، جب ان دونوں کے مرتبے میں کوئی فرق نہیں تھا، بے تکلفی سے پیش آتا رہا ۔ اس کے علاوہ اس نے بے پروائی سے کچھ ایسی باتیں بھی منہ سے نکال

دیں جنھیں پوشیدہ رکھنا ضروری تھا ۔ یکن پاشا نے اس کی ان حرکات سے برافروختہ ہو کر اس کے لیے سزاے موت کا حکم صادر کر دیا، جسے بڑی مشکل سے لمنوس Lemnos میں جلاوطنی کی سزا میں تبدیل کرایا گیا ۔ اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی، چنانچہ اب اسے غربت کے مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ اس نے ربیع الآخر ١٢٠٦ھ/جنوری ۔ فروری ١٧٩٢ء میں وفات پائی اور [قبرستان] ایوب میں دفن ہوا ۔ سروری اور سنبل زادہ نے اس کی وفات کی تاریخیں لکھیں ۔

کانی عثمانی ادب کے اس زمانے کی ایک اہم شخصیت ہے جب کلاسیکی طرز نگارش کے بعد رومانی دور شروع ہوا، جس کے دوران میں ایرانی اثرات ختم ہو گئے اور ان کی جگہ زیادہ تر جذبۂ قومیت نے لے لی ۔ کانی بحیثیت شاعر کچھ ایسا ممتاز نہیں، بلکہ اس میں عثمانی شعرا کی بنیادی خصوصیات، یعنی زبان کی سلاست اور صفائی کا بھی فقدان پایا جاتا ہے ۔ اس کے کلام میں بہت سی ناہمواریاں اور زبان کی درشتی پائی جاتی ہے، جس کا تعلق اس کے عام طرز عمل سے بہت گہرا ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر واقعے اور موقع پر فی البدیہہ شعر کہہ دیتا تھا ۔ یہاں یہ ذکر بھی کر دینا چاہیے کہ کانی نے خود نہ تو کبھی اپنے کلام کو جمع یا مرتب کیا اور نہ اپنے دیوان پر نظرثانی کی ۔ یہ محض رئیس الکتاب محمّد راشد افندی کی تحریک تھی کہ نوری نے اس کا وہ تمام کلام جو اس وقت دستیاب ہو سکا، جمع کر لیا اور دیوان شائع ہوگیا ۔ اس کے کلام کا ایک حصہ ضائع ہو چکا ہے ۔ اس نے ترکی کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔

اس کی منظومات میں متعدد حمدیہ نظمیں، نظیرے، تخمیسات، قصائد، تاریخی مادّے اور سیکڑوں غزلیات موجود ہیں ۔ جو چیز کانی کے کلام کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بذلہ سنجی، مزاح اور اس کا ظریفانہ اسلوب بیان ہے، ورنہ اس سے پہلے قدیم ترکی شعرا کے ہاں ظرافت کا فقدان نظر آتا ہے ۔

ایک نثرنگار کی حیثیت سے کانی کو اس کی منشئات کی بنا پر بہت بلند مرتبہ دینا چاہیے ۔ اس کے بارے میں ابوالضیا توفیق کی بہت اعلیٰ راے تھی : ''جہاں تک اس کے اسلوب نگارش کا تعلق ہے کسی قوم میں اس مرتبے کے نثر نگار پانچ یا چھے سے زیادہ نہیں ہوا کرتے'' ۔ کانی اپنے مکتوبات میں اپنی طبیعت کی شوخی و ظرافت کا بڑی آزادی سے مظاہرہ کرتا ہے اور نہایت عجیب و غریب شگفتہ آرائشی جملے لکھتا ہے ۔ اس کا مقابلہ [ایک مشہور فرانسیسی مصنّف] Rabelais [م ١٥٥٣ء] سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے کئی ظریفانہ اقوال اور حکایات محفوظ ہیں ۔ وہ اپنی خوش باش طبیعت اور ظرافت کی بدولت بے حد ہردلعزیز ہو گیا اور اس کے خطوط (جن میں سے صرف ١٢٠ موجود ہیں) اور منظومات پر سامعین اور قارئین اس طرح داد دینے لگے کہ موجودہ زمانے کے مذاق اور فکر کو پیش نظر رکھتے ہوے اس کا اندازہ پوری طرح لگانا محال ہے ۔ اس کی تصنیفات کو خاص طور پر اہمیت اس کے اسلوب بیان کی بدولت حاصل ہے کیونکہ وہ بسا اوقات ایسے عام پسند جملے استعمال کر جاتا ہے جو ادبی زبان میں نہیں ملتے اور ایسی باتیں کہ جاتا ہے جو غیر متوقع بھی ہوتی ہیں اور غیر معمولی بھی ۔

مآخذ : (١) احمد رفعت : لغات تاریخیہ و جغرافیہ، قسطنطنیہ، ١٣٠٠ھ، ٦ : ٧٠؛ (٢) نوری : منشئات عزیزیّہ، قسطنطنیہ، ١٣٠٣ھ، ص ٦٢ تا ٦٣؛ (٣) ابوالضیا توفیق : نمونۂ ادبیات عثمانیہ، قسطنطنیہ، ١٣٠٨ھ، ص ٣٣ تا ٦١؛

(۴) معلم ناجی، اُسامی، قسطنطینیه، ۱۳۰۸ھ، ص ۲۶۱ تا ۲۶۳؛ (۵) جودت : تاریخ، قسطنطینیه، ۱۳۰۹ھ، ۵ : ۲۳۴ تا ۲۳۵؛ (۶) سامی : قاموس الاعلام، قسطنطینیه، ۱۳۰۶ تا ۱۳۱۴ھ، ۵ : ۲۸۱۹؛ (۷) ثریا : سجل عثمانی، قسطنطینیه، ۱۳۱۵ھ، ۴ : ۷۴؛ (۸) شهاب الدین سلیمان : تاریخ ادبیات عثمانیه، قسطنطینیه ۱۳۲۸ھ، ص ۲۳۱ تا ۲۳۹؛ (۹) v. Hammer : *Gesch. d. Osman. Dichtkunst*، ۴ : ۳۶۶ تا ۳۶۷؛ (۱۰) Gibb : *A History of Ottoman Poetry*، ۴ : ۱۵۹ تا ۱۷۴.

(TH. MENZEL)

* **کاوین [کابین]** : مہر؛ رک به مہر و نکاح .

* **کاهن**: رک به الکُہّان .

* **الکاهنة** : اس کا نام (دَمْیَة یا دهیه) مشکوک ہے، کیونکہ کاهنه صرف ایک لقب ہے ۔ ابن خَلْدون کے بیان کے مطابق اس کا تعلق اَوْرَاس [رک بآن] کے ایک یہودی (؟) قبیلے جَرْوَه سے تھا ۔ بربروں کے ان شیوخ کا تعلق امی قبیلے سے تھا جو الابتر کی نسل سے تھے۔ جب حسّان بن النّعمان [رک بآن] نے بوزنطیوں پر فتح پائی تو وہ اَوْرَاس کی طرف بڑھا، جہاں کاهنه حکومت کرتی تھی ۔ کاهنه نے اسے مِسْکِیانَة (عَیْن بَیْضاء اور تِبِسّة کے درمیان—موجودہ ضلع قسنطینه میں) کے مقام پر اور بعض دوسرے مآخذ کی رو سے قابِس (Gabes) کے علاقے یا نِنی (Nini) کے نخلستان میں شکست فاش دی اور افریقیه کی حدود سے باہر نکال دیا ۔ چونکه خلیفه عبدالملک ان دنوں مشرقی ممالک میں اپنی جنگوں کی وجه سے مشکلات میں گرفتار تھا، اس لیے کمک بھیجنے میں دیر ہو گئی ۔ کہا جاتا ہے که اس زمانے میں کاهنه نے سارے ملک کو اپنے حلقۂ اقتدار میں شامل کر لیا اور عربوں کے نئے حملوں کو روکنے کے لیے کئی شہر تباہ کر دیے، جنگل کاٹ دیے اور ملک کو ویران کر ڈالا ۔ کہتے ہیں که اسی زمانے میں کاهنه نے ایک قیدی خالد بن یزید القَیْسی کو، جس کے ساتھ اسے رضاعی قرابت کا دعوٰی تھا، اپنا متبنّٰی بنا لیا، لیکن یه حسن سلوک اس متبنّٰی کو اس سے بے وفائی کرنے سے باز نه رکھ سکا ۔ ملک کو تاخت و تاراج کر دینے کے باعث رعایا کاهنه سے کشیده خاطر ہو گئی؛ چنانچه پانچ سال بعد جب حسّان بن النّعمان کمک لے کر واپس آیا تو طَبْرَقه کے مقام پر ایک خونریز جنگ (۸۲ یا ۸۳ھ/۷۰۱ یا ۷۰۳ء) میں کاهنه کو شکست ہوئی، اور وہ اَوْرَاس میں اس جگه ماری گئی جو بیرالکاهنه کے نام سے مشہور ہے ۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کاهنه کے مشورے سے اس کے دو بیٹے عربوں سے جا ملے تھے اور انہیں اسلامی فوج میں، جس نے بربروں کے خلاف جنگ جاری رکھی، عہدے بھی دے دیے گئے تھے ۔ حقیقت یه ہے که ہمیں وثوق سے اتنا بھی معلوم نہیں که کاهنه کوئی ملکه تھی یا فاطمه کی طرح، جو لله ۱۸۵۷ء میں فرانسیسیوں کے خلاف القبائل کی مدافعت کی روح و رواں لله فاطمه کی طرح اس کے بارے میں بھی جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، (مثلاً جان بوجھ کر شمالی افریقه کو تاخت و تاراج کرنا، قلعة الجم (Thysdrus کی مدور تماشاگاہ) میں اس کی مدافعانه جنگ، اور اس کی موت سے متعلق حالات و واقعات) وہ تقریباً سب افسانوی باتیں ہیں ۔ ایک بربر ماہر الانساب هانی بن بکور تو یہاں تک کہتا ہے که اس نے ۶۵ سال حکومت کی اور ۱۲۷ سال کی عمر پائی .

مآخذ : (۱) ابن خَلْدون : العِبَر، ۷ : ۸ ببعد، جزوی فرانسیسی ترجمه از de Slane : *Histoire des Berbéres*، ۱ : ۲۱۳ تا ۲۱۵؛ ۳ : ۱۹۳ ببعد؛ (۲) البَلاذُری : فتوح البُلْدان، طبع de Goeje، ص ۲۲۹؛ (۳) ابن عذاری :

البیان المغرب، طبع Dozy، ۱ : ۲۰ تا ۲۴؛ (۴) البکری : المسالک و الممالک، جزوی طبع از de Slane : *Descrip-tion de l'Afrique septentrionale*، ص ۷ ببعد، ۳۱؛ (۵) التجانی: الرحلة، مترجمهٔ روسو Rousseau، ص ۶۴ تا ۶۹؛ (۶) النویری، در *Histoire des Berbères*، ۱ : ۳۴۰ تا ۳۴۲ (ضمیمه ۲)؛ (۷) ابن النّاجی : معالم الایمان (تونس ۱۳۲۰ھ، ۴ جلد)، ۱ : ۵۶ تا ۶۱؛ (۸) محمود بن سعید مقدش السفاقصی : نزهة الانظار (تونس ۱۳۲۱ھ، ۲ جلد)، ۱ : ۶۷ تا ۸۰؛ (۹) ابن ابی دینار القیروانی : کتاب المؤنس، تونس ۱۲۸۶ھ، ص ۳۱ ببعد؛ (۱۰) مولی احمد : رحلة، مطبوعهٔ فاس، ص ۴۸ تا ۵۱ و مترجمهٔ Perbrugger : *Voyages dans. le sud de l' Algérie*، در *Explor. scient. de l' Algerie*، پیرس ۱۸۴۶ء، ۹ : ۲۳۴ تا ۲۴۱؛ (۱۱) الأرثلانی: نزهة الانظار، الجزائر ۱۳۲۶ھ، ص ۱۰۱ تا ۱۰۴؛ (۱۲) Mercier : *Histoire de l' Afrique septentrion-als*، ۱ : ۲۱۲ تا ۲۱۸؛ (۱۳) Fournel : *Les Berbers*، ۱ : ۲۲۴ تا ۲۲۸؛ (۱۴) Faure-Biguet : *Histoire de l' Afrique septentrionale*، مطبوعهٔ پیرس، ص ۲۵ تا ۲۷؛ (۱۵) Masqueray : *Traditions de l' Auras*، در *Bulletin de Correspondance Africaine*، *Oriental*، ۱۸۸۵ء (حصه ۱ و ۲)، ص ۸۰ تا ۸۳ (جہاں اسے جمعه کا نام دیا گیا ہے)؛ (۱۶) De Lartigues : *Monographie de l' Aurés*، قسنطینه ۱۹۰۴ء، ص ۱۸۲.

[RENE BASSET]

⊗ **کائتانی :** (Leone Caetani) اٹلی کا ایک مشہور اور ممتاز مستشرق، جسے اسلامی تاریخ کے مطالعے اور تصنیف و تالیف کے ساتھ شغف جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا ۔ وہ تیانو Teano کی ریاست کا رئیس تھا اور اپنی ریاست کی آمدنی کا خاصا حصہ اپنے علمی شوق کی تسکین میں صرف کرتا تھا ۔ اسی دھن میں اس نے اپنے محل میں ایک وسیع کتاب خانہ قائم کر رکھا تھا، جس میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بہت سے مخطوطات بھی تھے، جو اس نے مشرقی ملکوں میں اپنے خاص گماشتے بھیج کر حاصل کیے تھے .

کائتانی کی سب سے مشہور تصنیف *Annali de ll'Islam* ہے ۔ یہ کتاب عہد رسالت اور خلافت راشدہ کی مفصل تاریخ ہے اور جس تفصیل سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی دس ضخیم جلدیں ہیں، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہے ۔ اس تاریخ کی اشاعت میں بیس سال صرف ہوے، جو ۱۹۲۶ء میں تکمیل کو پہنچی ۔ پرنس کائتانی نے کئی بار مشرقی ملکوں کا سفر کیا اور وہاں کے تاریخی مقامات خصوصاً میدان ہاے جنگ کے فوٹو لیے، جو اس کی کتاب میں شامل ہیں.

راقم مقالہ نے پرنس کائتانی اور اس کی تصنیف کو اردو دان طبقے سے روشناس کرایا ۔ مصنف نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں ایک دیباچہ لکھ کر اس میں اپنے اغراض و مقاصد اور طرز تالیف کی وضاحت کی تھی ۔ مقالہ نگار نے اس دیباچے کا اردو ترجمہ کیا، جو ۱۹۲۸ء میں معارف (اعظم گڑھ) کے کئی شماروں میں بالاقساط شائع ہوتا رہا .

کائتانی کی دوسری اہم کتاب *Chronographia Islamica* ہے، جس میں ۱ھ سے لے کر ۱۳۲ھ تک کے واقعات اختصار کے ساتھ درج کیے گئے ہیں، گویا اس میں عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے علاوہ اموی عہد بھی شامل ہے ۔ ہر واقعے کے اندراج کے بعد اس کے مآخذ دے دیے گئے ہیں اور ان میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخوں کے حوالے بھی شامل ہیں ۔ ہر سال کے اختتام پر وفیات کی فہرست ہے، یعنی جن مشاہیر نے کسی خاص سال میں وفات پائی، ان کے اسما

کو حوالۂ کتاب کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی ضخامت ۱۷۱۶ صفحات ہے۔

پرنس کائتانی اٹلی کی پارلیمنٹ کا رکن تھا اور اپنی ریاست کے انتظام کے علاوہ سیاسی معاملات میں بھی حصہ لیتا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ ترک وطن کر کے کینیڈا چلا گیا اور وہیں ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔

پرنس کائتانی نے جو کتب خانہ جمع کیا تھا وہ ایک وقف کی صورت میں La Fondazione Caetani کے نام سے شہر روم میں اب تک محفوظ ہے۔

مآخذ: (۱) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۱: ۳۷۲ تا ۳۷۳؛ (۲) T. Fück: *Die Arabische Studien in Europa, Isp.*، لائپزگ ۱۹۵۵ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

⊗ **کَبائِر**: [ع]؛ کبیرۃ کی جمع؛ اس کی ضد صغیرۃ ہے جس کی جمع صغائر آتی ہے؛ لغوی معنی: بڑی چیز، بڑی بات [مفردات]؛ شرعی اصطلاح کے مطابق کبیرۃ اس (بڑے کام یا) بڑے گناہ کو کہتے ہیں جو حرام محض ہو اور شریعت نے اس کے مرتکب کے لیے نصِّ قطعی کے ذریعے دنیا و آخرت میں کوئی سزا تجویز کی ہو۔ علامہ دوّانی (شرح العقائد العضدیہ، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۶۶) کہتے ہیں: کبیرۃ کی تعریف میں علما کا اختلاف ہے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کبیرۃ ایسا کام ہے جس کے ارتکاب کی کوئی حد (سزا) مقرر کی گئی ہو؛ کچھ علما کی رائے میں کبیرہ وہ ہے، جس کے لیے کتاب و سنت کی نص کے مطابق حد یا تعزیر یا وعید مقرر ہو، یا یہ معلوم ہو جائے کہ اس کام کا فساد اس قسم کا ہے جس کے مطابق تینوں سزاؤں میں سے کوئی ایک دی جا سکتی ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ کبیرہ ہر وہ گناہ ہے، جس کے نتیجے کے طور پر دوزخ یا اللہ کا غضب یا اس کی طرف سے لعنت یا کسی اور عذاب کا تعین کیا گیا ہو (التفسیر المظہری، ج ۲، سورۃ النساء، بذیل آیۃ ۳۱)۔ ابن سیرین کے نزدیک اس کام کا ارتکاب، جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، کبیرہ ہے اور امام حسن بصری، سعید بن جبیر اور ضحاک وغیرہم کا کہنا ہے کہ ہر وہ کام کبیرہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں وعید کے ساتھ آتا ہے (ملاعلی القاری: شرح الفقہ الاکبر، ص ۶۸)۔

کبیرۃ کا لفظ قرآن مجید میں تین مقامات پر آتا ہے: (البقرۃ: ۲۱۹ و ۲۲۳؛ الکہف: ۴۹، مگر تینوں آیتوں میں کبیرۃ سے مراد "بڑی چیز" یا "بوجھل چیز" ہے؛ البتہ قرآن مجید میں برے "کاموں" یا "گناہوں" کے لیے (کبیرۃ کی جمع) کبائر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور وہ حسب ذیل تین مقامات ہیں: ۴ [النساء]: ۳۱؛ ۴۲ [الشوریٰ]: ۳۷؛ ۵۳ [النجم]: ۳۲۔

تفاسیر اور احادیث نبویہ میں مختلف اعمال سَیِّئَہ کا "کبائر" میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے فرمایا: "سات مہلک چیزوں سے بچو اور وہ یہ ہیں: شرک باللہ، جادو، بغیر حق کسی کا قتل، اکلِ سود، اکلِ مالِ یتیم، جہاد کے وقت میدان جنگ سے فرار، پاکباز مؤمن خواتین پر بدکاری کا الزام"۔ عبید بن عمیر کی روایت میں بشمول مسلمان والدین کی نافرمانی اور بیت اللہ کی ہتک، نو مہلکات کا ذکر ہے (ابو داؤد، کتاب الوصایا، حدیث ۲۸۷۴، ۲۸۷۵)۔ ایک اور روایت کے مطابق کسی نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا: "کیا کبائر کی تعداد سات ہے؟" آپ نے جواب دیا: "کبائر سات سو کے قریب ہیں، مگر یاد رکھو کہ توبہ و استغفار کی صورت میں کوئی گناہ کبیرہ باقی

نہیں رہتا اور اصرار کرنے سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا" ۔ شرح عقائد عضدیہ میں حسب ذیل امور کو کبائر کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے : قتلِ نفس بغیرالحق، زنا، لواطت، شراب نوشی، کسی کا مال (کم از کم ایک دینار) کا چھین لینا، قذف (زنا وغیرہ کی تہمت)، ہر ایسی مُسکِر چیز کا استعمال جس کا انجام شربِ خمر کی طرح ہو، جھوٹی گواہی، سود خوری، رمضان میں دن کے وقت (بلا عذر) روزہ توڑنا، جھوٹی قسم، قطعِ رحم، والدین کی نافرمانی، دشمن کے مقابلے میں پیٹھ دکھانا، یتیم کا مال کھانا، ناپ اور تول میں خیانت، بلا عذر نماز کا وقت سے پہلے یا وقت گزرنے کے بعد ادا کرنا، کسی مسلمان کو بغیر حق مار ڈالنا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے بارے میں جان بوجھ کر غلط بات کہنا، صحابہؓ کو گالی دینا، بلا عذر گواہی کا چھپانا، رشوت لینا، عورتوں اور مردوں میں فواحش کے لیے دلالی کا کام انجام دینا، حاکم کے پاس چغلی کھانا، زکوٰۃ نہ دینا، استطاعت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دینا، قرآن مجید کا علم حاصل کر کے بھلا دینا، کسی حیوان کو آگ میں زندہ جلانا، بلا سبب بیوی کا خاوند سے دور رہنا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی اور تدبیر (مکر) کے ذریعے اس سے اپنے آپ کو مأمون سمجھنا، اہل علم اور حاملین قرآن مجید کی اہانت، ظہار (بیوی کو ماں کہہ دینا) اور خنزیر کا گوشت کھانا ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ کبائر کے تین مراتب ہیں :

۱ ۔ اکبر الکبائر : یعنی شرک باللہ؛ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ الاشتراک باللہ، الامنِ مِن مکر اللہ، القنوط مِن رحمۃ اللہ اور الیاس مِن روح اللہ، اکبر الکبائر ہیں ۔

۲ ۔ وہ کبائر جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے؛ ان میں کسی مسلمان کے خون، مال اور عزت پر ناجائز طور پر ہاتھ ڈالنا شامل ہے؛ نیز قتلِ اولاد (اس سبب سے کہ وہ بھی رزق کھانے میں شریک ہو جائے گی)، ہمسائے کی بیوی سے بدکاری اور سبُّ الوالدین (کسی کے باپ یا ماں کو گالی دی جائے اور وہ جواباً گالی دینے والے کے ماں یا باپ کو گالی دے) اس کے تحت آتے ہیں ۔

۳ ۔ وہ کبائر جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، جیسے زنا، شراب خوری، لواطت، ڈاکہ، وغیرہ ۔

ارتکاب کبائر کے سلسلے میں علما کے درمیان یہ اہم اختلاف چلا آ رہا ہے کہ ان کا مرتکب شریعت کی نظر میں کیسا ہے ؟

خوارج کے نزدیک صغیرۃ و کبیرۃ دونوں کا مرتکب کافر ہے؛ اگر وہ مرنے سے پیشتر توبہ نہیں کر لیتا تو خلود فی النار کا مستحق ہوگا اور اللہ اسے معاف نہیں کرے گا ۔

معتزلہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل جاتا ہے، لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا ۔ واصل بن عطاء کا یہی مذہب تھا؛ وہ مرتکب کبیرہ کے لیے منزلۃ بین المنزلتین کا قائل تھا ۔

مرجئہ کا کہنا ہے کہ مؤمن کو بحالتِ ایمان کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا جیسا کہ کفر کے لیے بحالت کفر کوئی طاعت نفع بخش نہیں ہوتی ۔

ازارقہ [خوارج کا ایک گروہ] مرتکب کبیرہ کو مشرک کہتے ہیں اور زیدیہ کا قول ہے کہ وہ شخص اللہ کی نعمتوں کا منکر ہے ۔ امام حسن بصری نے ایسے شخص کو منافق قرار دیا ہے ۔

علمائے اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ بسبب بقائے تصدیق دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہوتا، شرح المواقف میں بیان کیا گیا ہے : اِنَّ مرتکبَ الکبیرۃ مِن اھلِ الصَّلاۃِ ای مِن

اهل القبلة مؤمن (جملۂ ثانی، ورق ۹۷ م)۔ عقائد نسفی (صفحہ ۸) میں ہے : والکبیرة تخرج المؤمن من الایمان ولا تدخله فی الکفر.

اہل السنت کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اگر کوئی گنہگار توبہ کے بغیر مر جائے تو وہ اللہ کی مشیت کے تابع اور اس کے رحم و کرم پر ہے ۔ اللہ چاہے تو اسے معاف کر دے اور جنت میں داخل کر دے اور چاہے تو اسے اس کے گناہوں کے مطابق عذاب دے .

امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بھی موجود ہے: "ہم کسی مسلمان کی تکفیر اس کے گناہوں کے سبب نہیں کرتے، اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہوں، بلکہ اس شرط سے کرتے ہیں کہ وہ اس ارتکاب گناہ کو حلال جانتا ہو، کیونکہ معصیت کو حلال سمجھنا بدلیل قطعی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی تکذیب کرنا ہے اور ایسا انسان کافر ہو جاتا ہے" (المغنیساوی: شرح الفقه الاکبر، ص ۲۷)۔ اس سلسلے میں ملا علی القاری نے مزید لکھا ہے کہ فرض اور واجب کا بلا عذر ترک کرنا، اگرچہ ایک مرتبہ ہی کیوں نہ ہو، گناہ کبیرہ ہے اور اسی طرح ترک سنت، ارتکاب مکروہ پر اصرار بھی کبائر میں شامل ہے (شرح الفقه الاکبر، ص ۶۸)؛ نیز دیکھیے شاہ ولی اللہ دہلوی : حجة الله البالغة .

مآخذ : (۱) الجرجانی : شرح المواقف، ج ۲، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور؛ (۲) امام ابوحنیفہ؛ الفقه الاکبر نیز اس کی شرح از؛ (۳) ملا علی القاری، دہلی؛ و (۴) ابومنصور الماتریدی، حیدرآباد دکن ۱۳۲۱ھ؛ اور (۵) ابوالمنتہٰی احمد بن محمد المغنیساوی، حیدرآباد دکن ۱۳۲۱ھ؛ (۶) الرازی : محصل افکار المتقدمین و المتأخرین من العلماء والحکماء و المتکلمین، قاهره (۷) الرازی : کتاب الأربعین، حیدر آباد دکن ۱۳۵۳ھ ؛ (۸) الدوّانی : شرح العقائد العضدیة، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور ؛ (۹) البغدادی، عبدالقاهر : اصول الدین، جلد اول، استانبول ۱۳۴۶ھ : (۱۰) الشهرستانی : الملل والنحل (الجزءالاول)، قاهره ۱۳۶۸ء؛ (۱۱) الشهرستانی: نهایة الاقدام فی علم الکلام (مع انگریزی ترجمه، از A. Guellaume، لنڈن ۱۹۳۴ء ؛ (۱۲) التفتازانی : شرح العقائد النسفیه، قاهره ۱۳۳۰ھ؛ (۱۳) ابن حزم : الفصل فی الملل والأهواء والنحل (الجزء الثالث) ؛ (۱۴) النّسفی ابوالبرکات : عمدة عقیدة اهل السنة والجماعة، لنڈن ۱۸۴۳ء (مع نجم الدین النسفی : عقائد)؛ (۱۵) E.E. Elder : *A Commentry of the Creed of Islam*؛ نیویارک ۱۹۵۰ء؛ (۱۶) شاہ ولی اللہ دہلوی : الخیر الکثیر، بجنور ۱۳۵۲ھ ؛ (۱۷) ابن منظور : لسان العرب ؛ (۱۸) محمد طاہر پٹنی: مجمع بحار الانوار، مطبع نول کشور، لکھنؤ؛ (۱۹) قاضی عبدالنبی : دستور العلماء (جزو ثالث)، بار اول، حیدر آباد دکن ؛ (۲۰) ابن الأثیر : النهایة فی غریب الحدیث، المطبعة الخیریة، قاهره ؛ (۲۱) E.W. Lane : *Arabic-English Lexicon*؛ (۲۲) الراغب الاصفهانی : مفردات القرآن، بذیل مادّہ (نیز دیکھیے اس کا اردو ترجمہ، از محمد عبداللہ الفلاح، لاہور ۱۳۸۳ھ)؛ (۲۳) الزمخشری : الکشّاف (الجزء الاول)، دارالکتاب العربی، بیروت ؛ (۲۴) ملاجیون جونپوری : التفسیرات الأحمدیة، بمبئی ۱۲۲۷ھ ؛ (۲۵) قاضی ثناء اللہ پانی پتی : التفسیر المظهری، ج ۲، جید برق پریس دہلی ؛ (۲۶) Hughes : *Dictionary of Islam*، لاہور ۱۹۶۴ء ؛ (۲۷) محمد فؤاد الباقی : مفتاح کنوزالسنّة، لاہور ۱۳۹۱ھ ؛ (۲۸) ابن حجر المکّی: الزواجر عن اقتراف الکبائر (تین جلدیں)، قاهره ۱۳۸۴ء .

(امین اللہ وثیر)

کَبْتاش : رک بہ استانبول . *

کبد : (لغات نویسوں کے قول کے مطابق* صحیح شکل صرف یہی ہے)، یا کَبْد، کِبْد، بمعنی جگر (کلیجا، کلیجی) .

۱ - جگر کے نام اور ان پر معنویاتی بحث : دوسرے لوگوں کی طرح مسلمان بھی بدن انسانی کے اندرونی اعضا کو پہچانتے اور انھیں جانوروں کے متماثل اعضا سے مطابقت دیتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مشاہدات کی بنا پر ان اعضا سے کوئی نہ کوئی جسمانی یا نفسی جسمی (Psychosomatic) فعل بھی منسوب کرتے اور اس کی تعبیر ہر شخص کی ذہنی ساخت کی رو سے کرتے تھے، جسے ہم صرف جزوی طور پر سمجھ سکتے ہیں .

خود زبان سے بھی ان ابتدائی مطابقتوں کی شہادت ملتی ہے، جیسا کہ E. Bargheer نے کہا ہے : "یہ ایسی اہم خصوصیتیں ہیں جو بسا اوقات لوگوں کی تصوراتی دنیا میں کسی عضو کو ایک نمایاں مقام دے دیتی ہیں؛ چنانچہ دل میں یہ خصوصیت اس کی دھڑکن یا متوازن حرکت ہے، پھیپھڑوں میں سانس لینا اور جگر میں اس کی مرکزیت ، دیگر اعضا کے مقابلے میں اس کا غیر معمولی حجم، اس کی قابل تغیر شکل اور اس کا خوردنی ہونا ہے" (*Handwörterbuch des deutschen Aberglaubens*، طبع von. E. Hoffmannkrayer، برلن ۱۹۲۷ تا ۱۹۴۲ء، ج ۵، عمود ۹۷۶، بذیل مادّۂ Leber) - عربی میں جگر کا کلاسیکی نام کَبِد ہے، لیکن عربی بولیوں میں اس کی متبادل شکلیں کَبْد اور کِبْد بھی، جو عام طور پر مستعمل ہیں، بہت قدیم زمانے سے دیکھنے میں آتی ہیں (*Wörterbuch der Klassischen Arabischen Sprache*، ویزباڈن ۱۹۷۰ء، ۱ : ۱۸) - دوسری سامی زبانوں کی طرح عربی میں بھی جگر کی طرف توجہ اس کے بڑے وزن کی وجہ سے مبذول ہوئی - جگر کے لیے جو اسم تمام سامی زبانوں میں مشترک ہے اس کا مادہ ک ب د یا ک ب ت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ب کی مناسبت سے اکادی ت کو مغربی سامی د میں تبدیل کر دیا گیا ہے (کَبَتّو، بعد ازآں کَبِتّو، شعر میں کَبْتَتو، جو خیال کیا جاتا ہے کہ اصلی یا ابتدائی شکل تھی (براکلمان : *Grundriss der vergleichenden Grammatik d. semit. Sprachen*، برلن ۱۹۰۸ - ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۵۲) - ہمیں اکادی میں کَبِدّو، کَبِدّو بھی ملتے ہیں، جو غالباً مغربی سامی سے مستعار ہیں - یہ واضح ہے کہ یہ اسم صفت "بھاری" سے مجازاً مشتق ہیں (اکادی: کَبتّو، مؤنث: کَبَتّو، کَبِتّو ؛ عبرانی : کَبید ؛ اوغر: کبد ؛ گیئز : کُبود وغیرہ)۔ یہی صورت متعلقہ فعل کی ہے، یعنی عربی : کابَدَ = جھیلنا، سہارنا (H. Holma : *Die Namen der Körperteil im Assyrisch-Babylonischen*، لائپزگ ۱۹۱۱ء، ص ۷۸ ؛ P. Fronzaroli: *Studi sul lessico comune semitico*، سلسلہ ۸، ج ۱۹، کراسہ ۵ تا ۶، ۱۹۶۴ء، ص ۳۲ ببعد، ۴۷، ۵۴) - جگر کا ذکر کرنے کے لیے اس استعارے کا استعمال ("سب سے وزنی اور سب سے موٹا برتن"، Galen : *De usu partium*، ۶ : ۱۷ = طبع C.G.Kühn، ۳ : ۴۹۵ و طبع G. Helmreich، ۱ : ۳۶۰، ص ۱۹ ببعد) ایک سامی جدّت ہے؛ اس کے مقابلے میں 'حامی - سامی' زبانوں میں اس کے لیے متعدد مختلف نام ہیں - جیسا کہ A. Cuny کا خیال ہے، یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ لفظ انڈو - یورپی زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے "*nostratique*" (*Recherches sur le vocalisme...en*، پیرس ۱۹۴۳ء، ص ۶۸ ببعد) - انڈو- یورپی زبانوں میں جو لفظ سب سے زیادہ مستعمل ہے (مأخوذ از مادّۂ یکورت) اس کا تعلق گو مڑے، گلٹی یا رسولی کے مفہوم سے ہے (J. Pokorny : *Indogermanisches Etymologisches Wörterbuch*، برن - میونخ ۱۹۴۸ - ۱۹۵۹ء، ۱ : ۵۰۴) - ہمارے موضوع بحث میں اس کی نمائندگی زیادہ تر فارسی لفظ "جگر" کرتا ہے (لاطینی : iecur ؛ یونانی ηπαρ،

وغیرہ) جسے ترکان عثمانی نے بھی اختیار کر لیا (اور سربی کروٹ زبانوں میں جانوروں کے جگر کے لیے) .

۳ جگر کے لیے ترکی مترادف کی سب سے زیادہ مروجہ شکل باغر ہے (جس کی شہادت ینی سای Yenisei کے قدیم Runiform کتبوں سے بھی ملتی ہے، دیکھیے V.G. Egorov : *Etimologiceskiy slovar' cuvasskog Yazika*، چبق ساری ۱۹۶۴ء، ص ۱۵۵، جس نے اس لفظ کی ترکی زبانوں میں سب شکلیں دی ہیں) اور غالباً اس کا تعلق گرہ، پلندے، بوری، جیب کے مفہوم سے ہے (دیکھیے ترکی اسم باغ اور فعل باغلامق؛ لیکن L. Bazin کا خیال ہے کہ اس تعلق میں بعض صوتی دشواریاں پیش آتی ہیں) .

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا الفاظ بہت شروع کے زمانے سے ایک "معیاری" یا "مرکزی" مفہوم کے مطابق پوری طرح مروج ہوچکے تھے (L. Bloomfield : *Language*، بار دوم، لنڈن ۱۹۳۵ء، ص ۱۴۹)، جس سے مراد وہ عضو تھا جسے ہم جگر کہتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ اتنے ہی قدیم زمانے سے معنویاتی طور پر ان کا تعلق ضمنی یا مجازی اقدار پر مشتمل مفاہیم سے رہا ہے، جسے ہم "انتقالات معنی" کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں .

معنوں کے اتصال کے باعث ان میں سے بعض "انتقالات" (S. Ullmann : *The Principles of semantics*، گلاسگو ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۰ ببعد) کے ذریعے زیر بحث الفاظ بدن کے ان حصوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگے جو جگر کے قریب ہیں؛ چنانچہ کلاسیکی عربی میں کبد سے مراد بدن کی ان سطحات کے علاوہ جو کم و بیش جگر کے نزدیک ہیں، سینہ بلکہ پیٹ بھی ہے، مثلاً کسی عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کَبِدٌ مُلْسَاءُ = اس کا جگر چکنا ہے، یعنی پیٹ نرم و نازک ہے (الاعشٰی : دیوان، طبع R. Geyar، لنڈن ۱۹۲۸ء، ص ۷۷، شعر ۱۵ الف = طرفہ : دیوان، در W. Ahlwardt : *The divans of the six ancient Arabic Poets*، لنڈن ۱۸۷۰ء، ص ۱۱ شعر ۶ - الف) وغیرہ؛ مزید حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörter buch der klassischen Arabischen Sprache*، ویزباڈن ۱۹۷۰ء، ۱ : ۱۸ تا ۲۰) - اسی طرح اویغور میں کہا جاتا ہے: "باغرغہ باصمق" = سینے یا دل سے لگا لینا؛ "باغری یوغان پیلوان" = ایک بہادر (یا ورزشی) آدمی، جس کا سینہ زبردست ہو (E. N. Nadzip : *Uygursko-russkiys slovar'*، ماسکو ۱۸۹۸ء، ص ۲۲۶) - علٰی ہٰذا آذری میں "باغرینہ باصمق" کے معنی ہوتے ہیں گلے لگانا بغل گیر ہونا، اپنے سینے سے چمٹا لینا (H. A. Azizbekov : *Azerbaydzanskoyrusskiy solvar'*، باکو ۱۹۶۵ء، ص ۴۷) .

فارسی میں مرکّب لفظ جگر بند، یعنی جگر مع متعلقات (جس کی شہادت مثلاً سعدی اور شمس تبریزی کے ہاں ملتی ہے) سے مراد ہمت و حوصلہ اور باعتبار مجموعی سینے کے اندرونی اعضا، یعنی پھیپھڑے، دل اور جگر ہوتی ہے - ترکی زبانوں نے اسی زمانے میں لفظ جگر کو اپنا لیا تھا جب سیف سرای نے مصر میں گلستان کا ترکی ترجمہ (۱۳۹۱ء) تیار کیا تھا، نیز دیکھیے É. Fazylov : *Starouzbek-skiy Yazik*، تاشقند ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۱ء، ۱ : ۳۷۰)، لیکن اسی مفہوم کے حامل ایک اور لفظ (باغر، وغیرہ) کی موجودگی، نیز غالباً جگر کے مذکورۂ بالا معنوں میں استعمال کی وجہ سے خود جگر کے معنوں کو وسعت دے کر ایک صدری عضو، یعنی پھیپھڑے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا حالانکہ اس کے لیے ایک ترکی لفظ (اوققہ، اوپقہ، اووقہ،

اوقبہ، وغیرہ) پہلے سے موجود تھا، جس کے مجازی معنی، یعنی غصہ، رنج، بے اطمینانی، مصیبت، کا ذکر قدیم زمانے میں بھی ملتا ہے (دیکھیے Egorov : *Étim Slovar'*، ص ۲۸۰ ببعد) اور جو اب مروّجہ عثمانی ترکی میں لاطینی لفظ اوفقہ Ofke کا تنہا مفہوم رہ گیا ہے اور جس کے ساتھ عوامی بولی کی اصلاح اویغان (= پھیپھڑا) بھی مستعمل ہے ؛ لہٰذا یہ ضروری ہو گیا کہ ''سیاہ جگر'' (آذری : گرہ جیار ؛ عثمانی ترکی : قرہ جگر ؛ لاطینی رسم الخط میں Kara ciger) — یعنی خود جگر — اور ''سفید جگر'' (آذری : آغ جیار ؛ عثمانی ترکی : آق جگر ؛ لاطینی رسم خط میں ak ciger)، یعنی پھیپھڑے کے مابین تمیز کرنے کے لیے کسی اسم صفت سے کام لیا جائے۔ سلطنت عثمانیہ کے حلقۂ اثر میں بولی جانے والی دوسری زبانوں نے بھی معنوں کے اس فرق کو قبول کر لیا، مثلاً بلغاری (جس میں صفت تمیزی سلاوی لفظ drob کے ساتھ لگائی جاتی تھی نہ کہ لفظ مستعار dziger ۱ = پھیپھڑے اور جگر) کے ساتھ؛ دیکھیے *Bal gariski etimonologicen Recnik*، صوفیا ۱۹۰۶ء، ۵ : ۳۶۲)، یا سربی کروٹ زبان (Crna Dzigerica = ''جگر''؛ Bijela Dzigerica = پھیپھڑا؛ دیکھیے Abdullah Skaljic : *Turcizmi u Srpskohrvatskom jeziku*، سراجیو ۱۹۶۵ء، ص ۲۴۰ ببعد)، بحالیکہ انڈو یورپی لفظ Jetra علم تشریح الابدان کے ایک اصطلاحی مفہوم کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ''سفید جگر'' کی اصطلاح (کبود بیض) عربی میں بھی، کم از کم بعض موقعوں پر، غالباً پھیپھڑوں کے لیے استعمال ہوتی تھی (ابن جزلہ : منہاج البیان، بذیل مادّۂ کبد، مخطوطۂ کتاب خانۂ ملّی، پیرس، عدد ۲۹۴۹ Ar.، ورق ۱۵۹ ب، وغیرہ)۔

اتصال کی بنا پر انتقال معنی کے عمل نے اس تغییر معانی (Semantic) کے میدان کو، جس پر لفظ جگر محتوی تھا، نہ صرف صدری اعضا تک وسعت دے دی بلکہ بدن کے سب اندرونی اعضا بھی اس میں شامل ہو گئے۔ مزید برآں بحیثیت مجموعی ان سب اعضا کا ذکر، ایک کم و بیش مبہم اور محدود طریقے سے لفظ ''جگر'' کے اسم جمع سے کیا جانے لگا ؛ چنانچہ الطبری کے فارسی ترجمے (چوتھی/دسویں صدی) میں لفظ ''جگران'' سے مراد آنتیں ہیں (G. Lazard : *La langue des plus anciens monuments de la prose persane*، پیرس ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۵)؛ تاہم ترکی میں خود لفظ باغر (یا ایک لاحقے کے ساتھ باغرسکا) اور اس کی مختلف اشکال) سے مراد ہے پیٹ، توند، نیز آنتیں (حوالوں کے لیے دیکھیے *Drevnetyurskiy slovar'*، لینن گراڈ ۱۹۶۹ء، ص ۷۷، ۷۸) ۔ اسی سے مثال کے طور پر اویغوری لفظ باغریماق ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں رینگنا، اپنے کو پیٹ کے بل گھسیٹنا ۔ حبشہ کی جدید زبانوں میں بھی ''گیز کبد''، یعنی جگر، کے مرادف قدیم حبشی لفظ، پیٹ، دل، اندرون، آنتوں، توند کے معنی لیے جانے لگے ہیں (تگرہ : کبد ؛ تگرینا : کبدی) اور امہری زبان میں ''ہود'' (از ''کبد''، دیکھیے براکلمان : *Gundriss*، ۱ : ۲۰۴) کے صرف یہی معنی رہ گئے ہیں؛ لہٰذا جگر کے لیے اس زبان میں ایک اور لفظ (Gubbät) استعمال کرنا پڑا۔

معنوں کے اس ہیر پھیر سے ان الفاظ کو کسی چیز کے درمیانی حصے، مرکز، اندرونی حصے (اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قلب) کے لیے استعمال ہونے کی توجیہ ہو جاتی ہے، مثلاً عربی میں کہتے ہیں : فی کَبِدِ جَبَلٍ (= کسی پہاڑ کے قلب میں) ؛ علی کَبِدِ الْبَحْرِ (= کسی سمندر کے قلب میں)، وغیرہ (حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörterbuch*، ص ۲۰) ۔

قدیم ترکی میں باغری (= کسی کمان کا جگر) کمان کے مرکزی خم کے لیے استعمال ہوتا ہے (محمود کاشغری : دیوان لغات الترک، استانبول ۱۳۳۳ تا ۱۳۳۵ھ، ۱ : ۳۰۱ ؛ C. Brockelmann : *Mittel turklscher Wörtschatz*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۸ء، ص ۲۸)۔ کَبِدُالْقَوس (F. W. Schwarzlose : *Die Waffen der alten Araber*، لائپزگ ۱۸۸۶ء، ص ۲۶۰، ۲۶۵ ببعد؛ A. Boudot-Lamottee : *Contrbuton à l'étu le de l' archerie musulmane*، دمشق ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۴، نیز دیکھیے اشاریہ، ص ۱۷۹ و لوحہ ۳) کی بھی یہی صورت ہے۔ تاتاری میں یورال باوری سے مراد ہے کوہستان یورال کا مرکز (*Tatar' sko-russkiy slovar'*، ماسکو ۱۹۶۶ء، ص ۵۱)۔ اسی طرح مثلاً فارسی میں ہے جگر گِل (= ''امعائے زمین، ''قبر'') ۔ مکان سے زمان کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہمیں فی کبدِ لیل'' (= رات کے وسط یا نصف میں) کی سی اصطلاحیں ملتی ہیں (ابن سعد : طبقات، ۳/۱ : ۲۰۵ س ۲۲)۔

ترکی میں ان عام معنوں کے اندر بسا اوقات آگے، پیش اور پہلو کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا تھا ۔ مثال کے طور پر اوزبک میں طوغ باغریدہ کے معنی ''پہاڑ کے پہلو پر'' کے ہوتے ہیں (A. K. Borovkov : *Uzbekso-russkiy slovar'*، ماسکو ۱۹۵۹ء، ص ۵۸) ۔ آلتائی کی شور بولی میں لفظ پاغرینده (= بجانب) میں اس کا مفہوم ایک حرف جار کا سا بھی ہو جاتا ہے (W. Radloff : *Versuch eines Wörterbuch der Türk-Dialacte*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۳ تا ۱۹۱۱ء، ج ۴، عمود ۱۱۳۴)۔

۲ ۔ جگر کا قدیم اور مقبول عام نفسی جسمی مفہوم (psycho physiology) : جگر کے لیے (عربی) لفظ کے اعضا اور بدن یا دنیا کے مختلف حصوں کو ظاہر کرنے کے لیے جو بھی ضمنی معنی بنتے گئے، ان سے قطع نظر، قبل نظریاتی دور ہی سے، ایک نہ ایک جسمانی یا نفسیاتی وظیفہ بھی اس عضو سے منسوب رہا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قلب کے ساتھ جگر کو بھی عام طور پر نفسیاتی زندگی کا مرکز (یا مرکزوں میں سے ایک) یا دوسرے الفاظ میں روح انسانی (یا کسی بھی روح) کا ایک سہارا سمجھا جاتا تھا (W. Wundt : *Völke rpsychologie*، بارسوم، لائپزگ ۱۹۲۰ء، ۴ : ۱۰۵ ببعد؛ A. Merx : *Le rôle du foie dans la littérature des peuples semitques*، در *Florilegium ... Melchior de Vogue*، پیرس ۱۹۰۹ء، ص ۴۲۷ تا ۴۴۴؛ M. Jastrow : *The liver as the seat of the soul* در *Studies in the History of Religion, presented to C. H. Toy*، نیویارک ۱۹۱۲ء، ص ۱۴۳ تا ۱۶۸؛ E. Clements : *Primitive Concepts of Disease*، یکے از مطبوعات جامعۂ کیلیفورنیا، در بارۂ آثار قدیمہ و نسایات امریکہ، ۲/۳۳ (۱۹۳۲ء) : ۲۳۲ ببعد؛ Bargheer : *Leber Eingeweide, Lebens-u. Seelenkräfte des Leibensinneren*، برلن و لائپزگ ۱۹۳۱ء، ص ۹۳؛ W. D. Wallis : *ERE*، ۱۰ : ۳۷۳ ببعد) ۔ چونکہ جگر کو یہ اہمیت حاصل تھی کہ وہ بعض ایسی صفات کا مسکن ہے جن میں ساحرانہ خصائل مضمر ہیں، اسی لیے غالباً سامی زبانوں میں اسے اکثر مؤنث مانا جاتا ہے ؛ چنانچہ یہ سریانی ہی میں نہیں بلکہ عام روایت کے برخلاف قدیم عبرانی میں بھی مؤنث ہے (G. R. Driver، در *JRAS*، ۱۹۴۸ء، ص ۱۷۵، حاشیہ ۲) اور سب سے زیادہ عربی میں؛ اگرچہ عربی میں یہ مذکر بھی ہو سکتا ہے اور نحوی عام طور پر دونوں جنسوں میں شمار کرتے ہیں (A. J. Wensinck : *Some Aspects of Gender in the*

Semitic Languages، ایمسٹرڈم ۱۹۲۷ء [Verh. Ak. Amst.، ج ۲۶/۳]، ص ۳۰، نیز ص ۳۶ ببعد؛ M. Feghali و A. Cuny : *Der genre grammatical en semitique*، پیرس ۱۹۲۴ء، ص ۵۵).

زیادہ تجزیاتی طریقے پر، اندرونی اعضا سے عام طور پر ایک ایسا متحرک عمل منسوب کیا جاتا ہے جس سے احساسات، جذبات اور خواہشیں پیدا ہوتی ہیں (یہ ایک ایسا تصور ہے جسے یکسر غلط نہیں کہا جا سکتا)؛ لہٰذا میسوپوٹامیا کے لوگوں اور شاید ایک حد تک عبرانیوں کے نزدیک بھی، جگر نہ صرف خوشی کا مسکن تھا (جب یہ صحت و تندرستی کی حالت میں "منور" ہو جاتا ہے) بلکہ رنج و غم (جب یہ "بیمار"، یا دکھتا ہوا ہو) غصّے (جب یہ جل جائے)، سکون (جب یہ خود پرسکون ہو) اور آخر میں قلب کے ساتھ ساتھ خواہش کا بھی (دیکھیے E. Dhorme : *L' emploi métaphorique des noms des parties du corps en hébreu et en akkadien* پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۲۸ ببعد؛ Merx : *Le role du foie*، ص ۴۳۶ ببعد، ۴۳۹ ببعد) ۔ عربوں کے نزدیک دل سے منسوب ہونے والے غموں، یعنی آلام عشق سے جگر زخمی ہو جاتا ہے ۔ شرمیلے عاشق یا اسی طرح کا رنج اٹھانے والے کسی شخص کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے (صدع، فطر، فلق)، ٹوٹ جاتا ہے (کبد مرضوضہ، الحریری : مقامات، طبع Silvestre de Sacy، بار دوم، پیرس ۱۸۴۷ تا ۱۸۵۳ء، ص ۵۷)، گھل جاتا ہے، پیاسا، بوجھل اور سوختہ ہو جاتا ہے ۔ کسی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "عشق کا رنج و الم اسے کھائے جا رہا ہے" ۔ پتلا اور نازک جگر ایک نرم طبیعت اور حساس دل کی علامت ہے ۔ نیک آدمی کا جسم سیاہ ہو سکتا ہے، لیکن اس کا جگر سفید ہوتا ہے (ابن جبیر، ص ۲۴۰)، یعنی روح پاک و صاف ہوتی ہے (یہ ایک بہت عام استعارہ ہے، جو زمبیا Zambia کے ندمبو باشندوں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے (دیکھیے V. W. Turner : *The Drums of Affliction*، اوکسفرڈ ۱۹۶۸ء، ص ۴۸، ۲۸۳؛ نیز Bargheer : *Leber*، ص ۹۷۹ ؛ وہی مصنف: *Eingeweide*، ص ۹۵ ببعد) ۔ جگر کھانا یا اس پر ضرب لگانا سے مراد بہت رنج دینا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جگر کو جسم کا ایک خاص طور پر بیش قیمت حصہ سمجھا جاتا ہے اور محبوب لوگوں کا مسکن جگر میں مانا جاتا ہے یا انھیں اس کے ٹکڑوں سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے ۔ بچہ جگر کے گہرے خون (مہجہ) کی طرح ہے ۔ کسی عزیز دوست یا محترم انسان کی جگہ جگر اور غشائے جگر کے مابین ہوتی ہے۔ زیادہ عام طور پر جو لوگ کسی کو عزیز ہوں وہ جگر کے ٹکڑے (قطعات) ہیں (حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörterbuch*، ص ۱۹ ببعد؛ A. Merx : *Le rôle du foie*، ص ۴۲۹ تا ۴۳۳) ۔ یہ آخرالذکر تعبیر ابھی تک رائج ہے، مثلاً تونس کے گاؤں تکرونہ میں (W. Marçais : *Textes arabes de Takrouna*، پیرس ۱۹۲۵ء، ۱ : ۸۰، ۸۱، ۲۷۲، ۲۹۲، حاشیہ ۴۲، جہاں قدیم متون سے ماخوذ معلومات دی گئی ہیں اور جن میں چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کا ایک مذارب Mozarab وثاق بھی شامل ہے، جو عیسائیوں کے مابین ہوا تھا) ۔ اس گاؤں میں لفظ جگر سے مراد محض کوئی محبوب ہستی ہوتی ہے یا بالخصوص کوئی بچہ : "یاکبدی" = میرے محبوب (W. Marçais : کتاب مذکور، پیرس ۱۹۶۰ء، ۲/۷ : ۳۳۵۴ تا ۳۳۵۶) ۔ قسنطینہ کے علاقے میں بچوں کو کباد (اکباد) یعنی اپنے ماں باپ کے جگر کہا جاتا ہے (M. S. Belguedj: *La médecine traditionelle dans le Constantinois*، سٹراسبرگ ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۱)؛ [دیکھیے الحماسۃ : آنما اولادنافی بیننا

اکبادنا تمشی علی الارض] .

بالکل اسی طرح کی تعبیریں فارسی ادب میں بھی پائی جاتی ہیں، جنھیں Merx عربی سے براہ راست ماخوذ سمجھتا ہے (مثال کے طور پر ان تعبیروں کے لیے دیکھیے Merx : *Le role du foie*، ص ۳۴۴ تا ۳۴۵؛ فرہنگ زبان تاجیکی، ماسکو ۱۹۶۹ء، ص ۷۷۹؛ نیز متفرق کتب لغات) ۔ باپ کے لیے اس کا بیٹا اس کے خون جگر کی طرح ہے، اس کی مثال فردوسی : شاہنامہ (طبع Mohl، ۱: ۲۵۶) میں بھی موجود ہے۔ اسی طرح پیارے اور لاڈلے بچے کے لیے جگر پارہ اور جگر گوشہ کے الفاظ آج بھی عام طور پر رائج ہیں .

یہی تصور بعض مذہبی رسوم کی تہ میں بھی مضمر ہے، مثلاً کسی بچے کا نام رکھنے کی تقریب پر باقاعدہ جگر کا کھانا ۔ مراکش میں اس موقع پر ایک بھیڑ قربان کی جاتی ہے اور اس کا جگر خاندان کے افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں بچے کے لیے الفت و محبت پیدا ہو جائے (J. Jouin : *Hespéris*، ۴۴ (۱۹۵۷ء) : ۳۰۸؛ Legey : *Essai de folklore moracain*، پیرس ۱۹۲۶ء، ص ۹۵؛ E. Westermarck : *Ritual and Belief in Morocco*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۲ : ۳۹۰) ۔ مراکش میں جگر کا تعلق ازدواجی محبت سے بھی سمجھا جاتا ہے؛ بعض قبائل میں دولہا اور دلہن اپنے ایک وقت کے ساتھ کھانے میں اس بھیڑ کا جگر کھاتے ہیں جسے ان کی شادی کے موقع پر ذبح کیا گیا ہو (E. Westermarck : *Marriage ceremonies in Morocco*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ۱۰۱؛ یورپ میں اسی قسم کی مثالوں کے لیے دیکھیے Bargheer : *Leber*، ص ۹۷۸ ببعد؛ وہی مصنف : *Eingeweide*، ص ۲۱۶) .

علم الابدان کے ان نظریات میں جو عوام میں رائج ہیں، جگر کو ان [مائعات] کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے جنھیں انسان پیتا ہے یا اپنے بدن سے خارج کرتا ہے ۔ یہ خیال، جسے تیرھویں صدی عیسوی میں Hildegerd، باشندۂ Bingen، نے بہت واضح طور پر بیان کیا تھا (*Causae et curae*، ص ۹۸، ۱۱۰) اور جس کا اظہار اکثر رائج الوقت جرمن محاوروں میں ہوتا ہے (Bargheer : *Leber*، ص ۹۸۴؛ وہی مصنف : *Eingeweide*، ص ۳۸۷)، اسلامی دنیا میں بھی پایا جاتا تھا؛ اس کی شہادت رسائل اخوان الصفا (۲ : ۱۶۲) میں ملتی ہے، جہاں جگر کا فعل مائی غذا پر اثرانداز ہونا بتایا گیا ہے ("بیت الشّراب") .

۳ ۔ سائنسی علم اور عالمانہ نظریات : مسلمان مصنّفین نے علم و فکر کی روشنی میں جگر سے متعلق جو مطالعات کیے ہیں وہ ان اقسام پر مشتمل ہیں : اس عضو کی جسمانی ساخت کا بیان؛ اس کا جسمی نفسی عمل (جو فلسفیوں کے لیے بھی ایسا ہی دلچسپ ہے جیسا کہ ماہرین علم الابدان اور طبیبوں کے لیے)؛ اس کی بیماریوں کی نوعیت، ان کے اسباب اور علاج؛ دواسازی میں جانوروں کے جگر کا استعمال .

طب کے عام رسائل میں بالالتزام جگر کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ملتی ہے کیونکہ جالینوس کے علم الابدان (Physiology) میں، جسے مسلم سائنس دانوں نے اختیار کر لیا تھا، اس عضو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ مثال کے طور پر Rufus، باشندۂ Ephesus، اور Philagrius کے تصنیف کردہ یونانی رسائل کی طرز میں قُسطا بن لُوقا اور محمد بن زکریا الرازی نے جگر کے متعلق مخصوص رسالے مرتب کیے تھے (F. Sezgin : *Geschichte des arabischen schrifttums*، لائیڈن ۱۹۷۰ء، ۳ : ۶۸، ۱۵۶، ۲۷۳، ۲۹۲)، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ رسالے ان کی عام طبّی تصانیف کے باب ہوں .

جہاں تک جگر کی جسمانی ساخت کا تعلق ہے،

مسلم مصنّفین نے، جنھیں بیشتر یونانی مصنفین کی طرح چیر پھاڑ کرنے کی ممانعت تھی، جالینوس کے ان بیانات سے کام چلایا ہے جو اس نے جگر کے بارے میں دیے ہیں - خود جالینوس نے Herophilos، باشندۂ Chalcedon (تیسری صدی قبل مسیح)، کا تتبع کیا تھا، جس نے اسکندریہ میں مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرنے کے علاوہ جگر کا مطالعہ کیا تھا، لیکن جس نے بظاہر غیر صحت مند انسانی جگروں اور حیوانی جگروں کے مشاہدات کو بھی تندرست جگر کے مطالعے میں شامل کر دیا تھا - بندروں کی چیر پھاڑ سے اس معاملے میں Herophilos پر جالینوس کے اعتماد کی تصدیق ہو گئی ہے (دیکھیے Ch. Daremberg : *Oeuvres anatomiques, physiologiques et médicales de Galien*، پیرس ۱۸۵۴ تا ۱۸۵۶ء، ۱: ۲۹۳، حاشیہ ۱؛ Max Simon : *Die Anatomie des Galen*، لائپزگ ۱۹۰۶ء، ۲: xxxivببعد)۔ اس کی پیروی کرتے ہوے مسلمان طبیبوں نے یہ بتایا کہ جگر کے بعض اوقات دو یا تین کونے (اطراف)، یا زائد حصے (زوائد) ہوتے ہیں اور زیادہ تر چار یا پانچ، جو معدے کے گردا گرد ہوتے ہیں۔ جگر کے بارے میں اس قسم کے بیانات محمّد بن زکریا الرازی : منصوری اور علی بن عباس : ملکی میں پائے جاتے ہیں (دیکھیے طبع P. de Koning: *Trois Traités d'anatomie arabe* ..... لائیڈن ۱۹۰۳ء، ص ۶۸ تا ۷۱، ۳۷۴ تا ۳۷۹)، جس میں عربی متن کے بالمقابل فرانسیسی ترجمہ درج ہے - اسی طرح ابن سینا : قانون، کتاب ۳، فن ۱۴، باب اول، کے فرانسیسی ترجمے میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے (وہی کتاب، ص ۷۰۶ تا ۷۱۵ و روم ۱۵۹۳ء، ص ۴۵۵ - ۴۵۶ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵۶۴ء، ص ۷۴۰ تا ۷۴۲)، جس میں یونانی مصنفین کے متوازی متون بھی شامل ہیں۔

جگر کے جسمی نفسی فعل سے متعلق عربوں کے خیالات ابتداءً اخلاط (humours) کے اس جسمانی نظام سے مأخوذ ہیں جو جالینوس نے قدیم ترکتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا - یہ وہ نظام تھا جو عربوں کے مفتوحہ ممالک اور مغربی یورپ میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا (دیکھیے اس معاملے میں Luis Garcia Ballester کا ایک نہایت عمدہ اور تازہ بیان، جو P. Lain Entralgo : *Historia Universal de la Medicina*، برشلونہ ۱۹۷۲ء، ۲: ۲۰۹ تا ۲۶۸، میں دیا ہے؛ نیز دیکھیے وہی مصنف : *Galeno en la sociedad y en la ciencia de su tiempo*، میڈرڈ ۱۹۷۲ و سہل تلخیص، از G. Sarton : *Galen of Pergamon*، لارنس [کینساس] ۱۹۵۴ء؛ تولید و تقسیم خون کے نقشے کے لیے دیکھیے *Historia Universal*، ص ۲۴۴ و A. C. Crombie : *Augustine to Galileo. A. D. 400-1695*، لنڈن، ۱۹۵۲ء، ۱: ۱۳۲)۔ اس نظام میں جگر کو اولیں اہمیت حاصل ہے: ''سب اعضا اسی کی مدد سے کام کرتے ہیں، لیکن یہ اپنا کام بغیر کسی کی مدد کے کرتا ہے'' (ابن سینا : ارجوزۃ فی الطب، شعر ۴۱۷، طبع و مترجمۂ H. Jahier و A. Noureddine، پیرس ۱۹۵۶ء، ص ۴۰) - خون اس غذا کے تصفیے اور اجتماع کے ذریعے، جو پہلے سے معدے میں ہضم ہو کر کِیلوس (Chyle) یا کِیموس (Chyme) کی شکل میں تبدیل ہوچکی ہو، جگر ہی میں بنتا ہے (کِیلُوس اور کِیمُوس کو بعض اوقات کَیلوس اور کَیمُوس بھی لکھتے ہیں اور یہ دونوں لفظ اسی طرح باہم وارد ہوتے ہیں جیسے یونانی Χυλος اور Χυμος؛ دیکھیے الخوارزمی : مفاتیح العلوم، طبع G. van Vloten، لائیڈن ۱۸۹۵ء، ص ۱۸۱ و قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء، ص ۱۰۷)۔ ہاضمے کا ایک اور ابتدائی عمل تنضیج (Coction) ممکن ہے

ماسارِیْق یا مسارِیْق (mesenteric veins؛ یونانی: φλεβες μεσραιχαι؛ لاطینی: mesaraicae) میں ہوچکا ہو، جن میں جگر کی خاصیت موجود ہوتی ہے اور جو کیلوس کو جزوی طور پر خون میں تبدیل کر دیتی ہیں (ابن سینا: قانون، ج ۳، فن ۱۴، مقالہ ۱، شروع میں؛ جالینوس کو اس امر میں جو شبہات تھے ان کے لیے دیکھیے Mani، ۱: ۶۸، جن کی وجہ سے قرون وسطی اور دور احیائے علوم میں مناقشات پیدا ہوتے رہے) - تنضیج ہضم جگر کے ابتدائی اثر کے تحت پہلے ہی واقع ہو چکی تھی، جو حرارت کا منبع ہے اور جس کی اطراف کے بارے میں خیال تھا کہ وہ انگلیوں کی طرح معدے کو گھیرے ہوئے ہیں .

کیلوس، جو پہلے ہی ایک حد تک تبدیل ہو چکتا ہے، جگر تک العِرق الاَسطوانی (vena porta؛ یونانی: πυλη φλεψ ηεπ) کے ذریعے پہنچتا ہے (Simon: *Sieben Bücher*...، ۳: ۱۴۶؛ اسے بعد میں الباب بھی کہنے لگے تھے)، جس میں ماساریق جاکر گرتی ہیں - وہاں وہ خون صالح میں تبدیل ہوجاتا ہے، جو بدن کی غذا کے لیے موزوں ہوتا ہے (انیسویں صدی عیسوی تک یہ کہاوت مستند مانی جاتی تھی : sanguificatio est chyli in sanguinem mutatio = "تولید خون کیلوس (chyle) کے خون میں تبدیل ہونے کا نام ہے"، دیکھیے Mani، ۱: ۵۹) - اس خون کا ایک حصہ جگر کا جزو بن جاتا ہے، جسے عَلَق (= منجمد خون) کہا جا سکتا ہے (ابن سینا: قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۳، فصل ۲؛ وہی کتاب، ج ۳، فن ۱۴، مقالہ ۱) اور جگر کی یہ ترکیب کم از کم قپادوقیہ Cappadocia کے Aretaios کے زمانے (دوسری صدی؛ Mani، ۱: ۵۸، نیز ص ۶۴) سے بیان کی جاتی رہی ہے - صحیح خون بننے کے عضو کی حیثیت سے جگر کو وہ مقام سمجھا جا سکتا ہے جہاں چاروں اخلاط (homours) پیدا ہوتے ہیں (منشاء الاخلاط؛ ابن سینا: اُرجوزۃ، شعر ۱۶۴؛ دیکھیے قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۴، فصل ۲) - ان چار میں سے دو فوراً ہی پیدا ہو جاتی ہیں، یعنی ایک تو وہ بھاری تلچھٹ جن پر السِمّ السَّوداء (کالا پِتّا: Atrabile؛ یونانی: χολη μελαινα؛ لاطینی: Atra bilis) مشتمل ہوتا ہے اور دوسری دقیق، یعنی ہلکے اجزا یا ایک قسم کا جھاگ، جو المرّۃ الصّفراء (زرد پِتّا: یونانی: χολμΕαν θη؛ لاطینی Cholera) کہلاتا ہے - ان دونوں کو زیادہ تر دو ظرف (وعاء) کھینچتے ہیں، جو کم و بیش گردنوں کی طرح (بمنزلۃ العنق، در جالینوس) ہوتے ہیں اور تلی اور پتے دونوں سے جگر کو ملاتے ہیں (الرازی: منصوری، در Koning: *Troités*، ص ۶۷ ببعد؛ علی بن العباس، ملکی، در کتاب مذکور، ص ۱۷۷، ۳۷۸ ببعد؛ ابن سینا: قانون، در کتاب مذکور، ص ۶۰۷، جس کے بالمقابل متوازی یونانی متون ہیں؛ سب سے پہلے جالینوس: *De usu partium*، ۴: ۴، جس پر ایک نہایت مفید شرح کے لیے دیکھیے Deremberg : *Oeuvres.....de Galien*، ۱: ۲۸۲، حاشیہ ۱).

خون، جس میں ابھی دیگر عناصر کی آلائش موجود ہوتی ہے، جگر سے شروع ہو کر رگوں کے نظام کے ذریعے تقسیم ہوتا ہے (یہ صحیح معنوں میں دوران خون نہیں ہوتا بلکہ مد و جزر ہوتا ہے، جس کے ساتھ آہستہ آہستہ تجدید خون بھی ہوتی رہتی ہے) - سب رگیں (veins؛ عَورِدَۃ) یا العُروق السَّواکن جگر ہی سے شروع ہوتی ہیں جب کہ دل وہ مقام ہے جہاں سے العُروق المتحرکہ (arteries) کے نظام کا آغاز ہوتا ہے - رگیں العِرق الاَسطوانی (vena porta) سے ادھر ادھر پھیلتی ہیں، جو جوف جگر سے چلتی ہے اور اسی طرح العرق الاجوف (vena cava) سے، جو جگر کے

محدّب پہلو سے شروع ہوتی ہے (قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۵، جملہ ۵) .

جن نظریات کی رو سے مختلف سطحات پر پائے جانے والے عناصر کائنات کے مابین تعلق بیان قائم کیا جاتا ہے، ان میں زرد پتّے کو اور اس کے ساتھ اس آتشیں عنصر کو جس کا وہاں غلبہ ہے، نیز مزاج (χρασις) کو جگر کے ساتھ ایک خاص رشتے میں منسلک کرتے ہیں؛ لیکن ایک مختلف نظریہ جگر کا تعلق خون سے، جس میں ہوا کا غلبہ ہوتا ہے، اور اس طرح قدرتی طور پر دموی (Sanguine) مزاج سے قائم کرتا ہے (دیکھیے شکل، در M. Ullmann : *Die Medizin im Islam*، لائیڈن و کولون ۱۹۷۰ء، ص ۹۹، نیز R. Herrlinger کی وہ رنگین شکل جس میں بقراط کی تصنیف کے زمانے سے لے کر ارتقا دکھایا گیا ہے اور جو E. Schöner : *Das Viererschema in der antiken Humoral-pathologie*، ویزباڈن ۱۹۶۴ء، کے آخر میں درج ہے؛ موجودہ زمانے کی مروّجہ شکل کے لیے، جو مقبول عام مجلّات سے ماخوذ ہے، دیکھیے T. Canaan : *Aberglaube und Volksmedizin im Lande der Bibel*، ہامبورگ ۱۹۱۳ء، ص ۳۳) .

جالینوس نے روحانی تعلیم کے اصولوں کو اخلاط کے نظریے سے جس طرح منسلک کیا تھا، مسلمان اطبا نے بھی قدرتی طور پر اس کا تتبع کیا ہے، جس کی ابتدا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ بعض ارواح (spirits؛ یونانی: πνευματα)، یعنی غیر مرئی ابخرات، جسم میں کارفرما ہوتے ہیں اور خیال ہے کہ انھیں سے اعضاے رئیسہ کے کام کی توجیہ ہوسکتی ہے ۔ مسلم طب کی رو سے ان میں سے ایک، یعنی طبعی روح (الروح الطبیعی یا الطبیعیہ؛ یونانی : πνευματαφυτικον) کا مقام جگر ہے ۔ یہاں جالینوس کی، جسے کچھ شبہات تھے اور جو اس معاملے میں متذبذب تھا، اس حد تک پیروی نہیں کی گئی جتنی کہ اسکندریہ اور شام کے اطبا کی، جنھوں نے ایک سادہ اور آسان پیرائے میں اس کے نظریات کو منظم کر دیا تھا ۔ اس "روح" کو اسی سطح پر رکھا جاتا ہے جس پر روح حیوانی اور روح انسانی کو، جن کا مقام علی الترتیب دل اور دماغ ہے (قدیم بیان، از حُنَین بن اسحٰق : المَدْخَل فی الطبّ؛ Temkin : *On Galen's Gesnerus Pharmacology* (*Aarau*)، ۸ (۱۹۵۱ء) : ۱۸۰ تا ۱۸۹) ۔ یہ خون کے ساتھ رگوں کے ذریعے تقسیم ہوتی ہے .

ان میں سے ہر ایک روح، جالینوس کے نظریے ہی سے، ایک بڑی قوۃ (Faculty) یا قوٰی (یونانی؛ δυναμεις؛ لاطینی: virtutes) کے ایک گروہ سے مطابقت رکھتی ہے اور ان کے افعال سے جسمانی اور نفسیاتی مظاہر منسوب کیے جاتے ہیں؛ چنانچہ اطبّا کا دعوٰی ہے کہ "طبعی" قوۃ یا قوٰی کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : ایک وہ جن کا فعل یہ ہے کہ کسی فرد کو محفوظ رکھیں اور اس کی شخصیت قائم کریں۔ یہ قوۃ غذا کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کا مقام جگر ہے؛ دوسری قوۃ وہ ہے جو نوع کی حفاظت کرتی ہے اور جو اعضاے تناسل میں رہتی ہے ۔ ارسطو کی پیروی کرتے ہوے ابن سینا اور بہت سے اور لوگ اس نظریے سے کسی حد تک اختلاف کرتے ہیں اور دل کے قوٰی ہی کو اصلی بنیاد اور بڑا سرچشمہ قرار دیتے ہیں (دیکھیے Mani، ۲:۳۱) ۔ قوۃ تغذیہ دل سے جگر کی طرف پھیلتی ہے (ابن سینا : شفاء، طبیعیات، فن ۶، مقالہ ۵، فصل ۸، طبع J. Bakos: *Psyeholgie d' Ibn Sīnā...*، پراگ ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۵؛ قانون ج ۱، فن ۱، تعلیم ۶) ۔ زیادہ صحیح معنوں میں خالص پیروان ارسطو نے جالینوس سے اس لیے اختلاف کیا کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ غذا یا تغذیے کا اصول دل میں رہتا ہے نہ کہ جگر

میں (کلیات، ج ۲، باب ۹، نیز دیکھیے J. C. Bürgel : *Averroes "contra Galenum"*، در *NG W, Gott.*، ج ۱، ۱۹۶۷ء، غدد ۹، ص ۲۹۲ ببعد) - قوٰی کی مختلف فہرستیں دی جاتی ہیں اور ان کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ یکساں طور پر دوسرے اعضا پر اثرانداز ہوتے ہیں.

ہم یہاں مسلم اطبّا کے علم اسباب امراض یا علم معالجات سے بحث نہیں کریں گے - ان کی ایک واضح اور سیدھی سادی بحث ایک قدیم ترین کتاب، یعنی علی بن سہل الطبری : فردوس الحکمۃ (طبع محمد زبیر صدیقی، برلن ۱۹۲۸ء، ص ۴۰ ببعد، ۲۱۸ ببعد) میں مل سکتی ہے اور ایک بہت مفصل بیان، جسے کلاسیکی حیثیت حاصل ہے، ابن سینا : القانون (فن ۴، کتاب ۳، روم ۱۵۹۳ء، ص ۴۵۵ تا ۴۷۹ و تہران ۱۲۹۵ھ، ص ۱۷۹ تا ۲۰۴ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵۶۴ء، ص ۴۰۷ تا ۴۸۱) میں موجود ہے، اس کا پہلا مقالہ کبد (دیکھیے اوپر) کی ساخت سے متعلق ہے - تشریح الابدان کی کتابوں میں جگر کے ماؤف ہو جانے کی حالت میں اسے داغنے کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھیے P. Huard و M. D. Grmek : *Le premier manuscrit chirurgical turc*، پیرس ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۲۱، شکل ۲۷، ۳۱؛ زمانۂ حال میں اسے داغنے کے سلسلے میں دیکھیے M. S. Belguedj : *La médecine tradition alle...* ص ۱۴۸).

القانون میں جگر کے بارے میں متعدد منتشر معلومات بھی دی گئی ہیں، جو اس کے لاطینی ترجمے (وینس ۱۵۶۴ء) میں نہایت احتیاط سے مرتب کی گئی ہیں، اور اشاریے کی بدولت بآسانی مل سکتی ہیں - کتاب ۲ میں مفردات کے بارے میں ایک طویل رسالے (روم ۱۵۹۳ء، ۱ : ۲۴۹ تا ۳۴۷؛ نیز ترجمہ وینس ۱۵۶۴ء، ۱ : ۱۲۴ تا ۲۸۰ء، جہاں یہ لاطینی حروف ہجا کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے) اور کتاب ۵ کے باب ادویہ میں ان جڑی بوٹیوں اور غذاؤں، نیز مفرد اور مرکب دواؤں پر کئی حواشی موجود ہیں، جن کے بارے میں معلوم ہے کہ ان کا جگر پر کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے - ان مرکب دواؤں کی فہرست کا خلاصہ کتاب ۵، جملہ ۱، مقالہ ۱۲، میں موجود ہے (روم ۱۵۹۳ء، ۲ : ۲۴۳ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵۶۴ء، ۲ : ۳۰۵ - ۳۰۶) اور ان دواؤں کو ان بیماریوں کے مطابق مرتب کیا گیا ہے جن میں انھیں استعمال کیا جاتا ہے .

القانون، کتاب ۲، میں دواؤں سے متعلق ایک باب میں حیوانوں کے جگر سے بحث کی گئی ہے (طبع مذکور، ۱ : ۱۹۶ و ترجمۂ مذکور، ۱ : ۲۹۹) ابن سینا کے اکتشافات بھی ان چیزوں میں شامل ہیں جنھیں غذائی نقطۂ نظر سے مزید تفصیل کے ساتھ ابن جزلہ کے معروف رسالۂ اغذیہ منہاج البیان میں بیان کیا گیا ہے (مخطوطہ، در کتاب خانۂ ملی، پیرس، عدد Ar ۲۹۴۹، ورق ۱۵۹-ب، عدد ۲۹۵۰، ورق ۲۷۹-الف، عدد ۲۹۵۲، ورق ۲۳۱- الف و ب) - جگر کھانے کا ایک عام نقصان یہ ہے کہ ہاضمے کے فعل کے دوران میں اس سے ایسا گاڑھا خون پیدا ہوتا ہے جو شریانوں میں بہت سستی سے حرکت کرتا ہے اس کا مداوا یہ ہے کہ اسے سومور شراب یا تیل کے ساتھ کھایا جائے - چوپایوں کے جگر سے بالعموم اجتناب کرنا چاہیے - موٹی بطخ یا مرغی کا جگر سب سے اچھا ہوتا ہے - پلی ہوئی بڑی بطخ کا جگر بھی بہت عمدہ ہوتا ہے، بالخصوص اگر اسے گاڑھے دودھ کے ساتھ کھایا جائے - اس کے ساتھ نمک اور تیل شامل کر لینا چاہیے تاکہ معدے پر بوجھ نہ پڑے - بھیڑ کا تلا ہوا جگر اسہال کے لیے فائدہ مند ہے - بکری

(خصوصاً بکرے) کا جگر مرگی کی جانچ کے لیے کارآمد ہے کیونکہ اس سے دورہ پڑ جاتا ہے ۔ اسے کھانا یا اس کی دھونی دینا آنکھ کی صفائی کے لیے بہت مفید ہے ۔ آنکھ کے پردے کی خرابیوں کے لیے بھی یہ فائدہ مند ہے (اسی طرح کے ایک علاج کے لیے، جو آج کل حضر موت میں مستعمل ہے، دیکھیے R. B. Serjeant، در *BSOAS*، ج ۱۸، ۱۹۵۶ء، ص ۷) ۔ تیتر کا خشک اور چورا کیا ہوا جگر بھی، جس کا خمیرہ بنا لیا جائے، مرگی کے لیے مفید ہے ۔ اسی طرح گدھے کا بھنا ہوا جگر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اسے خالی پیٹ کھایا جائے ۔ بھیڑیے کا جگر بھی جگر کی شکایتوں کے لیے مؤثر ہوتا ہے ۔ وَزَغہ (ایک قسم کی بڑی چھپکلی، نیز مینڈک کا جگر دانت کے درد میں کمی کرتا ہے ۔ دیوانے کتے کے جگر سے سگ گزیدہ کو شفا ہو جاتی ہے، بالخصوص اگر یہ اسی کتے کا ہو جس نے اسے کاٹا ہو ۔ یہ علاج، جس کا پلینوس (Pliny) نے بھی ذکر کیا ہے (۲۹ : ۳۲) اور جو یورپ میں انیسویں صدی تک عام طور پر رائج تھا (دیکھیے Bargheer : *Eingeweide*، ورق ۲۸۳) غالباً بیسویں صدی کے شروع میں یروشلم میں بھی معلوم تھا، کیونکہ اس کا ذکر S. Y. Agnon کے ناول *Tmōl Shilshōm*، ۴: ۱۸، (فرانسیسی ترجمہ : *Le Chien Balak*، پیرس ۱۹۷۱ء، ص ۵۶۵ ببعد) میں آیا ہے ۔

۴ ۔ جادو، مذہب اور داستانوں میں : مقبول عام علم نفسیات و الابدان کے پہلو بہ پہلو، جس میں علم نفسیات اور علم الابدان کی طرح جسم میں جگر کے فعل سے بحث کی گئی ہے اور علم سائنسی تشخیص الامراض، علم الاغذیہ اور علم الادویہ کی روشنی میں، جن سے (اصولاً) امراض کے علاج مأخوذ ہیں، جگر کی بطور غذا یا دوا قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے، بنیادی طور پر بعض علامتی اور ساحرانہ عقائد کے ابتدائی عناصر بھی موجود رہے ہیں، جن کی نشو و نما ان کے عملی استعمال کے ذریعے ہوتی ہے ۔ بعض اوقات یہ سائنسی رسائل میں بھی نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی وہاں ان کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے ۔

جالینوس کے تتبع میں ابن سینا، اگرچہ کسی قدر شبہے کے ساتھ، کہتا ہے کہ کسی جانور کے جگر کا حجم اس کی حرص و آز اور اس کے شرمیلے پن کے مطابق ہوتا ہے (دیکھیے P. de Koning: کتاب مذکور، ص ۷۰۸، ۷۱۱) ۔ مثل بالمثل کا ساحرانہ اصول استعمال کرتے ہوے، یہ سمجھا جاتا تھا کہ بھیڑ کا جگر، کھانے سے انسان کے جگر کو تقویت ملتی ہے (داود الانطاکی : تذکرہ، قاہرہ ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء، ۱ : ۲۰۷) ۔

جگر کے متعلق علما کے ہاں یہ بھی تصور ملتا ہے کہ جگر (کہا جا سکتا ہے کہ بروے علم جنین منجمد خون سے بنتا ہے ۔ اسے یا تو لفظی معنوں میں لیا جاتا ہے یا اسے ایک عوامی تصور سے وابستہ کر دیا جاتا ہے، چنانچہ ایک حدیث ملتی ہے، جس میں خون کھانے کی عام تحریم سے جگر اور تلی کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے : "ہمارے لیے دو خون (جگر اور تلی) حلال ہیں" (دیکھیے ابن ماجہ، ۲۹ : ۳۱ ؛ احمد بن حنبل، ۲ : ۹۷) ۔

جگر کی خرابیوں کی صورت میں تعویذ استعمال کیے جاتے ہیں؛ چنانچہ علم الکیمیا کے ایک مجموعے ذخائر الاسکندر میں، جسے یونانی الاصل خیال کیا جاتا ہے، ایک تعویذ کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو جگر کی شکل کے ایک سرخ پتھر کا بنا ہوا تھا اور جس پر پہاڑی بکرے کی تصویر اور ایک طلسماتی کتبہ نقش تھا ۔ یہ درد جگر کے لیے ایک مفید علاج ہے J. Ruska : *Tabula Smaragdina*، ہائیڈل برگ ۱۹۲۶ء، ص ۹۸ ببعد) ۔ عملی علاج پر

کتابوں میں بہت سے ایسے نسخے شامل ہیں جن میں تجرباتی مشاہدے، ساحرانہ استخراج (مثلاً بھیڑیے کے تیل میں پسے ہوئے جگر کا استعمال) نیم حکیمانہ علاج (اونٹ کا پیشاب) اور دھلے ہوئے تعویذ، وغیرہ کا امتزاج ہے (مثال کے طور پر دیکھیے نام نہاد جلال الدین السیوطی، یعنی محمد الصنوبری، م ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء: الرحمۃ فی الطب والحکمۃ، قاہرہ ۱۳۵۷ھ، ص ۱۰۶، باب ۱۰۲) مراکش میں ناگ پھنی کے جگر کی شکل میں کیے ہوئے ٹکڑے کسی مرابط خانقاہ کی بیرونی دیواروں پر لٹکا دیے جاتے ہیں اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ خشک ہو کر بیماروں کو شفا بخشتے ہیں (E. Westermarck: *Ritual and belief in Morocco*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۱: ۲۰۲) مراکش میں ایک اور دستور یہ ہے کہ کسی چھت پر بھیڑ کے جگر اور گردے کو بیمار آدمی کے جوتے کے تلے کی شکل میں کاٹ کر اور ان پر کئی بار چاقو سے کچوکے لگا کر اور ناگ پھنی کے ٹکڑے میں پرو کر خشک کیا جاتا ہے (A.R de Lens: *Pratiques des harems marocains*)، پیرس ۱۹۲۵ء، ص ۱۲) - وسطی عرب کے بدوی ناشتے کے وقت دارچینی کھاتے ہیں جسے قرف الکبود = جگر کے چھلکے) بھی کہتے ہیں اور یہ جگر کی شکایتوں کا علاج سمجھی جاتی ہے (J.-J. Hess: *Von den Beduinen des Innern Arabiens*، زیورخ و لائپزگ ۱۹۳۸ء، ص ۱۴۸ ببعد).

جگر کے ذریعے کہانت کا عمل ("کبدیت"، hepatoscopy)، جو قدیم میسوپوٹامیا اور ایتروریا Etrruria میں بہت اہمیت رکھتا تھا، لیکن جسے تیسری صدی ھی میں عرب کی ملکہ زنوبیا نے ترک کر دیا تھا (Zosimus، ۱: ۵۹)، عربوں کے ہاں رائج نہ تھا (دیکھیے T. Fohd: *La divination arabe*، لائیڈن ۱۹۶۶ء، ص ۳۹۷، ۵۲۷)، تاہم کہانت کے طریقوں کی ایک عام فہرست میں ابن خلدون (مقدمہ، ۱: ۱۹۱، ۱۹۴، طبع Quatremère، ۱: ۳۶۹، ۳۷۱) کے علاوہ اس کا ذکر ایک شخص ربی لیوی Rabbi Levi نے بھی کیا ہے، جس کا زمانہ غیر یقینی ہے - اس نے بابل کے بادشاہ کے عمل "کبدیت" کو، جو Ezekid، ۲۱: ۲۶، میں مذکور ہے، عربوں کے ایک ایسے طریقے سے تشبیہ دی ہے جس میں بھیڑ کو ذبح کر کے اس کے جگر کا مطالعہ کیا جاتا ہے "Midrash Rabba to Eccles تا Eccles، ۱۲: ۷ وغیرہ، در *Monumenta Talmudica*، ج ۵: *Geschichte* لائپزگ ۱۹۱۴ء، ص ۴۸، فصل ۸۴).

عوامی کہانیوں میں جگر ایک ادنیٰ کردار ادا کرتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر ایک دوا کے طور پر - ترکی کہانیوں میں ایک دیوانی شہزادی کا واحد علاج کسی شہزادے کا جگر بتایا گیا ہے (W. Eberhard و P. N. Boratv: *Typen Türkischer Volksmärchen* ویزباڈن ۱۹۵۳ء، ص ۳۰۲) - ایک جوان لڑکی کسی جانور کا جگر ایک بوسے کے عوض فروخت کرتی ہے (کتاب مذکور، ص ۲۲۴) اور ایک مردم خور انسانی جگر کھاتا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۷۲) - جادوئی پرندے کا دل ایک عالمگیر موضوع ہے (A. Aarne و S. Tompson: *The Types of the Folktate*، بار دوم، ہلسنکی ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۸، نوع ۵۶۷) - اس سلسلے کی ایک روایت میں دل کی جگہ جگر مذکور ہے - اس کی جگہ بعض اوقات گردون، پوٹے، یا پھر دل کا ذکر ہوتا ہے (Eberhard و Boratav: *Typen*...، ص ۱۹۶ تا ۱۹۸) - اداکال Adakale کی ایک کہانی میں ایک کنجوس کا ذکر ہے جو کفایت کے خیال سے جگر کھاتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کہانی زمانۂ حال کی تصنیف ہے (کتاب مذکور، ص ۸۸؛ نیز

دیکھیے نیچے) .

کسی جسمانی عضو کے ذریعے شفا حاصل ہونے اور اس کے ساتھ ہی عجیب و غریب ہستیوں کی غیر معمولی طاقتوں کا موضوع شاہنامہ کے اس بیان کی تہ میں ملتا ہے جس میں کیکاؤس اور ان ایرانیوں کے علاج کا ذکر ہے جنھیں مازندران پر حملے کے دوران میں سفید دیو نے جادو سے اندھا کر دیا تھا (رک بہ دیو) ۔ اس سفید دیو کے جگر کے خون سے، جسے رستم نے شکست دینے کے بعد اس کے سینے سے کھینچ کر نکال دیا تھا، ان لوگوں کی بینائی عود کر آئی تھی (طبع J. Mohl، پیرس ۱۸۳۸ تا ۱۸۷۶، کیکاوس، شعر ۶۵۲ ببعد و طبع E. E. Bertels، ماسکو ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۹، مازندران، شعر ۶۱۳، ببعد و مترجمۂ J. Mohl، پیرس ۱۸۷۶، ص ۴۲۸ ببعد) ۔ اس موقع پر اندھے پن کے لیے جگر کی نفع بخش خاصیت تاؤ (Taoist) کے ساحرانہ علم حیوانات و نباتات کے ایک اصول سے بہت قریب آگئی ہے (J. C. Coyajee، در *Journal and Proceedings of the Asiatic Society of Bengal*، سلسلۂ جدید، ج ۲۴، ۱۹۲۸ء، ص ۱۸۷ ببعد)، لیکن جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، بکری کے جگر کا آنکھ کی شکایتوں کے لیے استعمال ابن سینا کی سائنسی طب میں نظر آتا ہے اور اسی طرح توبت Tobit کی کتاب میں مچھلی کا جگر، دل اور پتّا جن بھوت کو نکال باہر کرنے میں مدد دیتے ہیں (Tobit، ۶: ۵، ۸: ۲) ۔ اسی وجہ سے بلا شبہہ جگر کو عوامی امراض چشم میں اکثر استعمال کیا جاتا تھا (Eingeweide: Bargheer، ص ۲۸۴ ببعد) .

جسم میں جگر کی اوّلیں اہمیت سے بلا شبہہ ساحرانہ استخراج کے ذریعے متعدد طور طریقوں کی توجیہ کی جا سکتی ہے ۔ کسی دشمن کا جگر چبانے یا کم از کم اس پر دانت لگانے سے بظاہر فنا کر دینے یا بڑی سے بڑی لعنت بھیجنے کا مفہوم نکلتا ہے ۔ جنگ احد کے موقع پر ہندہ کی یہی حرکت، یعنی (حضرت) حمزہؓ کے جگر کو دانتوں سے چبانا (ابن ہشام، ص ۵۸۱) امیر معاویہ کے تحقیری لقب ابن آکلۃ الاکباد (= جگر کھانے والی کا بیٹا) کا باعث تھی (المسعودی: مروج، ۴: ۳۳۹ و فرانسیسی ترجمہ از Pellat، پیرا ۱۷۴۲، جعلی (؟) المسعودی: کتاب اثبات الوصیۃ الامام علی، جس کا حوالہ Ch. Pellat: *Le Shiisme imamite*، پیرس ۱۹۷۰ء، ص ۸۵، میں ملتا ہے) ۔ جزیرہ نماے سینا کے بدویوں کا عقیدہ ہے کہ دروز مسلمانوں کا جگر کھاتے ہیں (W. P. Zenner، در *Middle Eastern Studies*، ج ۸، عدد ۳، اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۱۱) ۔ اس کے متوازی مثالوں کے لیے دیکھیے Bargheer، Leber ص ۹۷۷؛ وہی مصنف: *Eingeweide*، ص ۹۳، ۲۱۶؛ W.D. Wallis، در *ERE*: ۱۰: ۳۷۳، ببعد .

عید الاضحی کی قربانی کے موقع پر ذبح کردہ جانور کا جگر پہلے کھانا ضروری ہے، جو المغرب کے ایک بخوبی مصدقہ دستور کی پیروی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تائید بعض فقہا نے بھی کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بھی ہوتی ہے (E.Doutté: *Magie et religion dans l' Afrique du Nord*، الجزائر ۱۹۰۹ء، ص ۳۷۳؛ J. Desparment: *Coutumes, institutions, croyances der indigénes Algèrte*، الجزائر ۱۹۳۹ء، ۱: ۲۷۵؛ E. Westermarck: *Ritual and Belief in Morocco*، لنڈن، ۱۹۲۹ء، ۱: ۲۳۴ ببعد، ۲: ۱۲۰ ببعد؛ J. Chelhod: *Le sacrifice chez les Arabes*، پیرس ۱۹۵۵ء، ص ۱۱۳ ببعد؛ J. Jouin: *Hesperis*، (۱۹۵۷ء)، ۴۴: ۳۲۰؛ A. M. Goichon: *La vie feminine an Mzab*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۶۴) .

مراکش کے بعض قبائل میں دولھا اپنے بن بیاھے دوستوں کو تحفۃً ایک بیل دیتا ھے ۔ اس کا جگر، جسے سب سے پہلے کھانا ضروری ھوتا ھے، باعث برکت سمجھا جاتا ھے ۔ اسے ان سب لوگوں میں تقسیم کرنا ھوتا ھے جو حاضر ھوں، لیکن عورتوں میں نہیں (E. Westermarck: *Marriage Ceremanies in Morocco*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۶) ۔

۵ ۔ جانوروں کا جگر بطور خوراک: جگر سے، جسے اکثر بیکار گوشت اور اوجھڑی کی ذیل میں شمار کیا جاتا ھے، نفرت کی جاتی تھی اور اسے مفلس و قلاش لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا؛ چنانچہ جنوبی لیبیا میں ایک کہاوت ھے: ''مثل النوار علی الکبد''، یعنی مفلس لوگ کسی چیز پر اس طرح تیزی سے ھاتھ مارتے ھیں، جس طرح نوار (= خانہ بدوش) جگر پر (F. J. Abela: *Proverbes populaires, adages et locutions proverbiales du Liban-Sud*، زیرطبع)، لیکن بعض اور علاقوں میں جگر اور دل کو بہت لذیذ غذا سمجھا جاتا ھے، جیسے کہ حضر موت میں (F. Stark: *The Southern Gates of Arabia* ۱۹۴۵ء، ص ۷۸) ۔ عدن میں آج کل بیکار گوشت سمالی لینڈ سے درآمد کیا جاتا ھے، جہاں (بقول یوسف طالب) لوگ اسے نہیں کھاتے ۔ کچا جگر بھی بعض اوقات ایک عمدہ غذا سمجھا جاتا ھے، جیسے لبنان اور اردن میں (A. Jaussen: *Coutumes des Arabes au pays de Moab*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۶۵)۔ صحرا میں جو جانور شکار میں مارا جاتا ھے، اس کا پیٹ جلدی سے چاک کر لیا جاتا ھے اور جگر، دل اور پھیپھڑے دہکتے ھوے کوئلوں پر رکھ دیے جاتے ھیں اور فوراً یا دوسرے دن کھا ئے جاتے ھیں (M. Gast: *Alimentation des populations de l' Ahagger*، پیرس ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۶) ۔

قرون وسطیٰ میں عرب کی منڈیوں میں ھمیشہ کبودی (جگر فروش) موجود ھوتے تھے، جو لہسن کے ساتھ پکایا ھوا یا سیخوں پر لگا کر بھنا ھوا جگر ان لوگوں کے ھاتھ بیچتے تھے جو بازار میں کھانا کھاتے تھے ۔ رسائل حِسْبہ میں بکری یا گاے بھینس کے جگر کو بھیڑ کے جگر کے ساتھ ملانے کی ممانعت کی گئی ھے ۔ ان میں بہت تفصیل سے ان اجزا کی کیفیت بیان کی گئی ھے جو ملانے چاھییں (''ابن الاُخُوّۃ : معالم القربۃ، طبع R. Levy، لنڈن ۱۹۳۸ء و عربی متن، ص ۹۵ ببعد) ۔ اس قسم کی غذا میں اکثر ملاوٹ کی جاتی تھی ۔ رسالۂ کیمیاء الطبائخ کو، جس میں ان لوگوں کو برا بھلا کہا گیا ھے ''جو کہنے کو تو جگر بیچتے ھیں، لیکن دراصل وہ جگر نہیں ھوتا،'' فلسفی یعقوب الکندی (تیسری صدی ھجری/نویں صدی عیسوی) سے منسوب کیا جاتا ھے (الشّیزری : نہایۃ الرتبہ، در ابن الاخوۃ : کتاب مذکور، ص ۱۰۸، حاشیہ ۸ ؛ ابن بَسّام : نہایۃ الرتبہ، در مشرق، ۱۹۰۷ء، ۳۳ : ۱۰۸۱) ۔ دوسری طرف خشک یا بھنے ھوے اور کوبیدہ جگر کی کھرچن کو نقلی مشک کی طرح استعمال کیا جاتا تھا (سقطی : *Un manuel hispanique de hisba*، طبع G. S. Colin و E. Levi-Provençal، پیرس ۱۹۳۱ء، ۱ : ۳۶ و ترجمہ از P. Chalmeta-Gendron : الکتاب فی آداب الحِسْبَۃ، میڈرڈ ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۶ = الاندلس، ۱۹۶۸ء، ۳۳ : ۱۹۳) اور ھسپانیہ اور مراکش کا بلاجہ (ایک قسم کا سموسہ، جو گوشت اور چھیچھڑوں سے تیار کیا جاتا ھے) میں خراب شدہ جگر نیز کچھ روٹیوں اور گرم مسالوں وغیرہ، کی ملاوٹ بھی کر دی جاتی ھے (کتاب مذکور، متن : ص ۳۹ س ۱۳ و ترجمہ : ص ۱۸۰) ۔

قرون وسطی کی کھانا پکانے سے متعلق کتابوں میں جس طرح کے پرتکلف کھانوں کا ذکر ہوتا ہے ان میں جگر کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے ۔ اس قسم کے کثیر التعداد مشرقی رسائل میں سے صرف الوُصلة میں جگر پکانے کی ترکیبیں دی گئی ہیں ۔ ایک ترکیب کی رو سے ابلے ہوئے جگر کو جھلّی (caul) میں لپیٹ کر سیخوں پر بھونا جاتا ہے (شرائط کُرجیّہ کے طریقے پر، جو مرغابی کے ان بیکار اعضا سے تیار کیا جاتا ہے جنھیں پکانے سے پہلے الگ کر دیتے ہیں اور ان میں جگر بھی شامل ہوتا ہے)؛ دوسری ترکیب کی رو سے جگر کو ابال کر اس میں سالم یا کوبیدہ گرم مسالا بھر دیتے ہیں (اَلْوُصْلَة، مخطوطہ A، ورق ۹۵-الف و ب؛ نیز دیکھیے Rodinson: *Recherches...*، ص ۱۳۵) ۔ علاوہ ازیں جگر کا ذکر، "مصنوعی دماغ" کے ضمن میں دنبے کی چکتی (اَلِیَہ) کے ساتھ ملا کر قیمہ کرنے کے طور پر بھی آیا ہے (اَلْوُصْلَة، دیکھیے Rodinson: کتاب مذکور، ص ۱۵۸) اور تل کے تیل میں مرغی کے اندرونی حصوں یا بھیڑ کے گوشت کے ٹکڑوں کے ہمراہ اتنے تلے ہوئے جگر کا بھی کہ اس کا رنگ سیاہ ہو جائے اور اس سے ایک قسم کی چٹنی بن جائے جو مختلف کھانوں میں استعمال ہوتی ہے (اَلْوُصْلَة؛ دیکھیے Rodnsion: کتاب مذکور، ص ۱۳۳ حاشیہ، ص ۱۵۶) ۔ شمس الدین محمّد ابن الحسن البغدادی کی بغدادی کھانوں کی کتاب (ساتویں/تیرھویں صدی) میں جگر پکانے کی کوئی حقیقی ترکیب نہیں دی گئی اور نہ اسی زمانے کی اندلس اور المغرب کے کھانوں کی اس کتاب میں جسے A. Huici Miranda نے طبع و ترجمہ کیا ہے ۔

لبنان میں آج کل بکری یا گائے کا جگر پکانے کی ترکیبیں ملتی ہیں، جنھیں عام طور پر سیخوں پر چڑھا کر انگیٹھی میں سینک لیا جاتا ہے ۔ انھیں "معلق" کہتے ہیں، یعنی صحیح معنوں میں "بدن کے اوپر کے حصے کے اعضا، دل، جگر وغیرہ" (M. K. Khayat و *Food from the Arab* : M. C Keating، بیروت ۱۹۶۱ء، ص ۳۲ ببعد؛ *World* : P. Bazantay، *Enquête sur l'artisanat a Antioche*، بیروت ۱۹۳۶ء، ص ۴۷؛ سرکے میں تلے ہوئے جگر کے ایک نسخے کے لیے دیکھیے *A Book of Middle Eastern Food* : Claudia Roden لنڈن ۱۹۶۸ء، ص ۱۸۰)۔ ہلکی آگ پر تلے ہوئے جگر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گرم یا ٹھنڈے ہونے کے بعد چٹپٹی چیز کے طور پر کسی اشتہا افزا مشروب کے ساتھ کھانے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں (Roden، ص ۳۳) ۔ المغرب میں جگر اور دل کے کباب، جو کسی زمانے میں غربا کا کھانا تھا، زمانۂ حال میں ایک وضعدار کھانا بن گیا ہے ۔ ان ٹکڑوں کو جھلی میں لپیٹ دینے کی وجہ سے "ملفوف کہتے ہیں" (M. Beaussie : *Dictionaire pratique arabe.—francais*، بار دوم، الجزائر ۱۹۳۱ء، ص ۹۰۴ ب؛ M. Gast : *Alimentation des populations de l' Ahaggar*، پیرس ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۴، ۱۳۵، حاشیہ ۲) اور مراکش میں "بولفاف" (L. Brunot : *Textes arabes de Rabat*، پیرس ۱۹۵۲ء، ۲ : ۴۴۷؛ Z. Guinaudeau : *Fès ve par sa cuisine*، رباط ۱۹۵۷ء، ص ۳۹) ۔ جب جگر کے ٹکڑوں کے بیچ میں بکری کی چربی کے قتلے رکھ دیے جاتے ہیں تو اس کھانے کو مراکش میں "کواح" (= اوجھڑی، جگر، دل وغیرہ) کہتے ہیں (Z. Guinaudeau، : کتاب مذکور، ص ۴۱؛ نیز H. Mercier : *Dictionnair arabe-francais*، رباط ۱۹۵۱ء، ص ۱۰۱) ۔ انگیٹھی پر سینکے ہوئے اس کھانے کا خاص باورچی "کویحی" کہلاتا ہے (کتاب مذکور) ۔

مصر میں مختلف قسم کی مرغیوں کو اکثر ان میں جگر اور پوٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

ملا کر اور ان میں کوبیدہ کچا گیہوں یا گوشت کا قیمہ بھر کر کھایا جاتا ہے (C. Wissa Wassef : *Pratiques rituelles et alimentaires des-Coptes*، قاہرہ ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۱).

ایران میں بھیڑ یا مرغی کا بیکار گوشت کئی کھانوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن جگر کا ذکر صرف کھانا پکانے کی ایک جامع کتاب میں آیا ہے، جسے غالباً شاہ کے باورچی نے مرتب کیا تھا اور جو ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں طبع ہوئی - یہ ذکر کبابوں اور ایک قسم کے سالن کے ضمن میں، جسے حسرۃالملوک (= بادشاہوں کی تمنا) کہتے ہیں، ملتا ہے (علی اکبر بن مہدی کاشانی : سفرۂ اطعمہ، مجموعۂ مخطوطات P. Ikowski، طبع و مترجمۂ م - قوام نجاد، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ، پیرس ۱۹۶۷ء، ص ۲۶، ۲۷؛ پہلی ترکیب کچھ بعد کے زمانے میں Josophine Richard الملقب بہ نشاط الدولۃ : طباخی نشاط، تہران، بلا تاریخ، ص ۲۲ و بدر الملوک بامداد : راہنمای طباخی، بار ششم، تہران، بلا تاریخ، ص ۳۶، میں بھی ملتا ہے).

ترکیہ میں زمانۂ حال تک جگر نہیں کھایا جاتا تھا اور قصاب اسے کتوں اور بلیوں کو ڈال دیتے تھے، تاہم جگر اور پھیپڑوں (جنھیں طاقم یعنی پورا کہتے ہیں) اور اسی طرح دل، پھیپڑوں وغیرہ اور اوجھڑی کے کھانے کا دستور حال ہی میں کسی قدر ہو گیا ہے اور انھیں پکانے میں چلتے پھرتے البانوی سوداگروں کو، جنھیں سَکَتْچی (اوجھڑی بیچنے والے) کہتے ہیں، خاص مہارت حاصل ہے (یہ بیان P. Boratav کا ہے؛ دیکھیے P. N. Boratav و W. Eberhard : *Typen türkischer Volksmarchen*، ویزباڈن ۱۹۵۳ء، ص ۸۸)- پلاؤ پکانے کی ایسی ترکیبیں جن میں جگر استعمال ہوتا ہے، آج کل کی کھانا پکانے کی کتابوں میں ملتی ہیں (فوزلو پلاؤ کے لیے دیکھیے I. Orga : *Turkish cooking*، لنڈن ۱۹۵۸ء، ص ۱۲۵؛ بطخ یا مرغی کے جگر والے ایچ پلاؤ کے لیے C. Roden: کتاب مذکور، ص ۲۴۸)- یہ ترکی کے ایک نسلیاتی جائزے کے دوران میں برسہ میں فراہم کی گئی تھیں (H. Z. Kosay اور A. Ulkucan انادولو یمکلری و ترک متفقی، انقرہ ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۱؛ نیز دیکھیے جگر کے تکے کباب کے لیے، جنھیں یوغورت میں لپیٹ دیا جاتا ہے، I. Orga : *Cooking with yoghurt*، لنڈن ۱۹۵۶ء، ص ۴۰).

اوزبکستان میں بھی "جگر کباب" تیار کیے جاتے ہیں اور بعض دفعہ، جیسے کہ سوویٹ آذربیجان میں بھی ہوتا ہے، جگر کے ٹکڑوں کے بیچ بیچ میں دنبے کی چکتی کے ٹکڑے بھی رکھ دیے جاتے ہیں (دنبہ کباب)؛ جگر کو انگیٹھی پر بھون کر اس میں کچھ بھر بھی دیتے ہیں (قوورلغان جگر) (K. Mahmudov : *Uzbekshie bljuda*، تاشقند ۱۹۶۲ء، ص ۹۸، ۱۰۲؛ N. K. Alhazov : *Azerbajdzanska) a kulinariya*، باکو ۱۹۶۳ء، ص ۴۳).

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور ہیں؛ نیز دیکھیے Nikolaus Mani : *Die historischen Grundlagen der Leberforschung*، ۲ جلدیں، Basle ۱۹۵۹ تا ۱۹۶۷ء.

(M. RODINSON)

کَبَرد : قفقاز کا ایک مسلمان قبیلہ - روسی * زبان میں انھیں کَبَردنتسی Kabardintsi اور ترکی میں کَبَرتایلر کہتے ہیں؛ ایک اور نام قازق Käsäg ہے - کبردوں کا ذکر سب سے پہلے heuerthei کے نام سے Barbaro کے ہاں ملتا ہے، جس نے ۱۴۳۶ء میں قفقاز کی سیاحت کی تھی - اس کا اشتقاق ابھی تک غیر یقینی ہے -

کبردی زبان اَدیغہ (چرکس) لسانی گروہ میں سے ہے، جسے "ادیغۂ بلند" بھی کہا جاتا ہے.

۱۹۲۶ء کی سوویت مردم شماری کے مطابق کبردوں کی تعداد نسلی اعتبار سے ۱۳۹۹۲۵ اور لسانی اعتبار سے ۱۳۸۹۲۵ تھی - ۱۹۳۹ء کی مردم شماری کی رو سے کبردوں کی تعداد ۱۶۴۰۰۰ تھی .

کبرد دریاے ترک کے بالائی حصے اور اس کے بعض معاونوں کے طاس میں آباد اور دو گروھوں میں منقسم ھیں: ایک گروہ، جو کبردۂ عظیم کے قبائل پر مشتمل ھے، دریاے ترک کے مغرب میں دریاے ترک اور دریاے ملکہ کے مابین آباد ھے؛ دوسرا، جو کبردۂ صغیر کہلاتا ھے دریاے ترک کے مشرق میں دریاے سنجہ اور ترک کے درمیان آباد ھے .

کبرد اپنے اصلی وطن سے، جو زیادہ مغرب کی جانب تھا، تیرھویں صدی عیسوی میں اپنے موجودہ علاقے میں اس وقت آئے جب الان مغول کے حملوں کی وجہ سے کمزور ھو چکے تھے - آلتون اردو کے زوال کے بعد سے انھوں نے قفقاز کی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا - سولھویں صدی عیسوی میں کبرد حکمرانوں کے ماسکو کے فرمانرواؤں سے دوستانہ تعلقات قائم تھے؛ چنانچہ ایوان Ivan چہارم کی دوسری بیوی میری Marie بنت تمروک Temrük ایک کبرد شہزادی تھی - سترھویں صدی میں کبردوں نے قالموقوں کے خلاف قفقازی باشندوں کے وفاق کی قیادت کی - چونکہ انھوں نے وسطی قفقاز میں بہت اھم کردار ادا کیا تھا اور وہ درۂ دریال Daryal کے قریب آباد تھے، اس لیے انیسویں صدی میں وھی سب سے پہلے روسی اقتدار کے ماتحت آئے اور اسے انھوں نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے قبول کر لیا - روسی فتح کے زمانے میں بعض کبرد بالائی کوبان Kuban اور زیلن چک Zelenchuk کے درمیان جا بسے اور مہاجر یا پناہ گیر کبرد کہلانے لگے - ۱۸۶۴ء کے بعد مہاجر گروہ کے کچھ کبرد ھجرت کر کے سلطنت عثمانیہ میں آ گئے .

سولھویں صدی کے نصف آخر میں قریم (کریمیا) کے تاتاریوں نے کبردوں میں عیسائیت کے مقابلے میں اھلسنت کے حنفی مذھب کی ترویج کی اور سترھویں صدی کے آخر تک وہ سب کے سب مسلمان ھو گئے .

کبردوں کی معیشت کا انحصار روایتی طور پر گھوڑوں کی پرورش، زراعت، باغبانی، شہد کی مکھیوں کی پرورش اور گھریلو صنعتوں پر تھا - روایتی کبردی معاشرے کا ڈھانچا بڑا پیچیدہ سا تھا اور گیارہ طبقوں پر مشتمل تھا، جنھیں دو بڑی شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا : طبقۂ امرا یا آزاد گروہ اور ''پشتلی''، یعنی غیر آزاد گروہ - معاشرے کی صف اوّل میں شہزادے تھے اور والی، یعنی کبردوں کا سربراہ، بھی انھیں میں سے ھوتا تھا - ان کے بعد امرا اورک یا اورخ کا درجہ آتا تھا اور یہ ان حقوق و فرائض کی بنا پر جو انھیں شہزادوں سے وابستہ کیے ھوے تھے، چار طبقوں میں منقسم تھے - امرا کے بعد آزاد مزارعین تفو خوتل تھے- غیر آزاد گروہ حسب ذیل پر مشتمل تھا : آزاد (Azat، یعنی آزاد شدہ کسان، جو ایک حد تک اپنے سابق آقاؤں کی خدمت گزاری کے پابند تھے) ؛ اوگ Og (وابستۂ زمین مزارعین Serfs)؛ لوکا ناپت Loganaput (اوگ اور غلاموں کے مابین) اور اونات Unaut (غلام) .

انیسویں صدی میں K.Atazkun نے ایک ادبی زبان تخلیق کرنے کی کوشش کی اور ۱۸۶۵ء میں اس نے سریلی Cyrillie رسم الخط پر مبنی کبردی ابجد شائع کی - بایں ھمہ کبردی زبان کو ۱۹۲۴ء سے پہلے ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل نہیں ھوئی - کبرد عظیم کی بولی کو

ھی اس ادبی زبان کی بنیاد قرار دیاگیا، چنانچہ یہ زبان خودمختارسوویت اشتراکیۂ کبرد و بالکار(Kabardo-Balkar A.S.S.R.) اور خود مختار علاقۂ قرہ چای چرکس(Karacay-Cerkes A. R.) میں سرکاری طور پر مستعمل ھے ۔کبردی زبان میں پہلا اخبار قرہ خلق کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع ھوا ۔ *Letopis' Periodiceskikh izdanij S.S.S.R* کے بیان کے مطابق ۱۹۶۰ء میں دو کبردی اخبار اور دو رسالے شائع ھوتے تھے ۔

کبردوں کی پہلی بار اپنے خود مختار علاقے میں تنظیم یکم ستمبر ۱۹۲۱ء کو عمل میں آئی ۔ ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو انھیں قومی ضلع بالکار میں شامل کر دیا گیا، جو ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو کبردو بالکارخود مختار خود مختار علاقہ بن گیا ۔ ۱۹۴۴ء میں سوویت جمہوریۂ اشتراکیۂ کبرد کا اعلان ھوا، جو ۹ فروری ۱۹۵۷ء کو سوویت جمہوریۂ اشتراکیۂ کبرد و بالکار میں تبدیل ھو گئی ۔ اس جمہوریہ کا علاقہ ۱۲۴۰۰ مربع کیلومیٹر پر مشتمل ھے ۔ ۱۹۵۹ء میں اس جمہوریہ کی آبادی ۴۲۰۱۱۵ تھی، جس میں ۴۵ فی صد کبرد، ۸۱ فی صد بالکار، ۳۸٫۷ فی صد روسی اور باقی قفقاز کے دیگر گروہ تھے۔

مآخذ : (۱) B. Geiger، T. Halasi-Kun، *Peoples and languages of the Caucasus* ھیگ ۱۹۵۸ء؛ (۲) A. Kuipers و K. Menges : *Istoriya kabardino Balkarskoya A. S. S. R.* ماسکو ۱۹۶۷ء؛ (۳) *Kabardiskaya A.S.S.R.* Nalchik ۱۹۴۶ : (۴) B. Kalmikov : *Ocerki revolutsionnogo dvizeniya v.Kabarde* Nolchik ۱۹۴۶ء؛ (۵) A.Kuipers : *Intro-duction to Morpheme and phoneme in kabardian* ھیگ ۱۹۶۰ء؛ (۶) Sh. B. Nogmov : *Istoriya Adigeys-kogo Naroda Sostavlennaya po predaniyam Sbornik* (۷) ؛ ۱۹۵۲ Nalchik، بار پنجم، *Kabardintsev. Slatey po Istorii Kabardy* ص ۱ تا ۲، Nalchik ۱۹۵۷ء؛ نیز رک بہ آبازہ ؛ چرکس ؛ القبق .

(HÜLYA SALIHOGLU)

الکِبْرِیْت : (گندھک) : القزوینی اسے * سیماب، مختلف قسم کے تارکول، نفت اور خاکستری عنبر کے ساتھ روغنی چیزوں میں شمار کرتا ھے ۔ دوسرے مصنفین اسے اثیروں، اڑ جانے والی اشیا، زرنیخ کی دو قسموں (ھڑتال اور مینڈھل)، نوشادر اور پارے میں شامل کرتے ھیں ۔

عربوں اور ان سے بھی پہلے ارسطو[؟] نے گندھک کی تین مختلف قسمیں قرار دی تھیں : عمدہ قسم کی سرخ گندھک (الجید الجوھر)، خالص زرد گندھک اور سفید گندھک ۔ مؤخرالذکر سے گندھک کی وہ قسم مراد ھے جو عرف عام میں ''Bath-Sulphur'' کہلاتی ھے ۔ اس میں سے گندھک ملی ھائیڈروجن کی سی بو آتی ھے ۔ سرخ گندھک کے متعلق، جو غالباً بالکل فرضی چیز ھے، کہا جاتا ھے کہ یہ مغرب میں سمندر کے قریب پائی جاتی ھے اور بہت کمیاب ھے ۔ اسی وجہ سے جو شخص خوبیوں میں بے مثل ھو اسے استعارۃً ''کبریت احمر'' کہتے ھیں ۔ ''گردگوگرد'' یا آنولاسار گندھک، فیرس سلفائیڈ کو بھون کر تیار کی جاتی ھے ۔ گندھک سے آتش بازی، بھک سے اڑنے والی چیزوں کی تیاری اور دھاتوں کو رنگ دینے کا کام لیا جاتا ھے ۔ بعض دھاتوں مثلاً سیسے اور چاندی کو گندھک سیاہ کر دیتی ھے ۔ کبریتی چاندی نقرئی ظروف پر سیاہ رنگ کی میناکاری (Niello Inlaying) میں استعمال کی جاتی ھے ۔ سیماب بھی پہلے سیاہ ھو جاتا ھے، لیکن گرم کرنے پر سرخ (شنگرف) بن جاتا ھے ۔ گندھک دواؤں میں بھی بہت کام آتی ھے (دیکھیے ابن البیطار، القزوینی وغیرہ) .

طبعی حالت میں گندھک تین شکلوں میں پائی

جاتی ہے اور عربوں کو ان تینوں کا علم تھا :-

۱ - جپسم اور کھریا کے طبقات وغیرہ میں گندھک کے ڈلے پائے جاتے ہیں - دریاے اردن کے علاقے میں الغور، یعنی بحیرۂ مردار وغیرہ کے پست علاقوں سے یہ اسی شکل میں برآمد کی جاتی تھی (المقدّسی، ص ۱۸۴) - ایران، بلوچستان اور صقلیہ میں بھی یہ اسی شکل میں پائی جاتی تھی ؛

۲ - فعال اور غیرفعال آتش فشاں پہاڑوں، مثلاً کوہِ ایٹنا Etna اور کوہِ دماوند وغیرہ میں بھی یہ پائی جاتی ہے .

۳ - یہ گندھک کے چشموں سے بھی حاصل ہوتی ہے، مثلاً خوزستان کے علاقے میں دورق الفرس کے مقام پر گندھک کے گرم چشمے موجود ہیں، جہاں سے زرد گندھک دستیاب ہوتی ہے (Guy Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ۱۹۰۵ء، ص ۲۴۲ - مشرقی علاقوں میں گندھک کی موجودگی کے متعلق معلومات کے لیے دیکھیے C. Hintze : *Handbuch der Mineralogie*، حصہ ۱، ۱۹۰۴ء، ص ۸۰، ۸۷؛ B. Dammer و O. Tietze : *Die nutzbaren Mineralien*، حصہ ۱، ۱۹۱۳ء، ص ۹۳؛ O. Stutzer : *Die wichtigsten Lagerstätten der "Nichht-Erze"*، ۱۹۱۱ء، ۱ : ۲۵۱).

کیمیا گروں کے ہاں گندھک کے بہت سے صفاتی نام رائج ہو گئے تھے (دیکھیے J. Ruska و E. Wiedemann : *Beitr.*, lvii ؛ *Alchemistische Decknamen*، در *S. B. P. M. S.*، ۵۶ (۱۹۲۴ء): ۱۷ تا ۳۶) - یہ زرد، سرخ یا سفید عروس یا موم کے ناموں سے موسوم تھی - رنگ اور خواص کی وجہ سے اسے "الروح الصابغ" بھی کہتے تھے - جلتی ہوئی گندھک کی گلوگیر بو کے باعث اس کا نام الخنّاق پڑ گیا تھا - اسے قید الآبق (نکل بھاگنے والے کی زنجیر)، یعنی سیماب کی زنجیر بھی کہتے تھے، کیونکہ وہ گندھک کے ساتھ کیمیائی طور پر مل کر ٹھوس شنگرف بن جاتا ہے - اس کے بعض اور نام شمس الدین الدمشقی (کتاب مذکور) نے لکھے ہیں، مثلاً اعراف الدیکہ (مرغ کی کلغی)، طائر البحر (سمندری پرندہ)، حبّ الرّمانہ (دانۂ انار، انار دانہ) الیاقوت الدائب (یاقوت مائع) وغیرہ؛ دیکھیے M. Berthelot : *La chimie au Moyenage*، ج ۲؛ الطغرائی، در کتاب الجوھر النضیر فی صناعۃ الاکسیر (مخطوطہ، عدد ۱۸۳۶۱، در Ahlwardts: فہرست کتاب خانۂ برلن .

ماہرین علوم طبیعیہ کی راے میں گندھک پانی، ہوا اور مٹی کے اجزا (Atoms) سے پیدا ہوتی ہے - یہ اجزا آمیزش پر تیز حرارت کے زیر اثر باہم پیوست ہو جاتے اور تیل کی سی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جو سرد ہو کر ٹھوس بن جاتے ہیں .

کیمیاگروں کی یہ راے ہے کہ گندھک اور سیماب کا بہت سی مختلف اشیا، بالخصوص دھاتوں کی بناوٹ میں، بہت اہم حصہ ہے، لیکن یہاں گندھک اور سیماب کے الفاظ صرف عام اصطلاحات کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں اور ان کا معمولی گندھک یا سیماب سے کوئی تعلق نہیں ہے .

مآخذ : (۱) القزوینی : کتاب عجائب المخلوقات، طبع وسٹنفلڈ، ص ۲۴۳؛ (۲) J. Ruska : *Das Stein buch aus der Kosmographie etc.*, در *Jahresbericht der Oberrealsschule Heidelberg 1895/96*، ص ۴۲؛ (۳) ابن البیطار : جامع المفردات، جس میں الکبریت کے زیر عنوان اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے؛ (۴) شمس الدین الدمشقی . نخبۃ الدھر فی عجائب البرّ والبحر، ص ۵۸ و مترجمۂ Mehren، ص ۶۲ ببعد؛ (۵) J. Ruska : *Das Steinbuch des Aristoteles*، ص ۱۰۱، ہائیڈلبرگ ۱۹۱۲ء؛ (۶) E. Wiedemann : *Beiträge*، ۱ :

Beiträge zur Geschichte der Chemie, در *SBPMS*، ۳۴ (۱۹۰۲ء): ۵۵ تا ۵۸؛ (۷) وهی مصنف: *Beiträge zur geschichte der chemie, ebenda*، ۳۴: ۲۴ (۱۹۱۱ء)؛ (۸) E. von Lippmann: *Entstehung und Ausbreitung der Alchemie*، برلن ۱۹۱۹ء؛ نیز مادّۃ الکیمیا کے زیر عنوان دیگر تصانیف.

(E. WIEDEMANN)

* **کَبَکْچی اوغلو مصطفٰی:** اس بغاوت کا قائد جس کے نتیجے میں سلطان سلیم ثالث کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ وہ دراصل شمال مغربی آناطولی کے ایک شہر قَسْطَمُونی کا باشندہ تھا۔ باسفورس کے کنارے پر واقع قلعۂ روم ایلی کاواک کے یاماقوں (یعنی فاضل ینی چریوں) نے، جنھوں نے ۱۷ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ/۲۵ مئی ۱۸۰۷ء کو صدر اعظم کے قائم مقام کوسہ موسٰی پاشا اور شیخ الاسلام عطاءاللہ افندی کی انگیخت پر بغاوت کردی تھی، اسے اپنا قائد منتخب کیا تھا۔ اس نے بغاوت کا کام منظم طریقے پر انجام دیا، نظام جدید [رکِ بان] کے بڑے بڑے منتظموں کو قتل کر دیا اور سلطان مصطفٰی رابع [رکِ بان] کی تخت نشینی (۲۱ ربیع الاول/۲۹ مئی) کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے بغاوت برپا کرنے والوں کے مقاصد پورے کیے۔ اسے روم ایلی کی جانب باسفورس پر واقع قلعوں کا کماندار مقرر کر کے ''تورنہ جی باشی'' کا منصب دے دیا گیا۔ پہلے شیخ الاسلام کی معاونت سے، بعد ازاں محمود طیّار پاشا کی، جسے شعبان/اکتوبر میں قائم مقام نامزد کر دیا گیا تھا، اور پھر دوبارہ شیخ الاسلام کی معاونت سے وہ امور سلطنت پر اثر انداز ہوتا رہا۔ اسے پینار حصار کے ''اعیان'' علی آغا نے ۱۹ جمادی الاولٰی ۱۲۲۳ھ/۱۳ جولائی ۱۸۰۸ء کو روم ایلی پینار میں قتل کر دیا گیا۔ وہاں علی آغا کو مصطفٰی پاشا بیرقدار [رک بان] نے اس زمانے میں ایک دستۂ فوج دے کر بھیجا تھا جب وہ خود استانبول کی طرف سلطان سلیم ثالث [رکِ بان] کو تخت پر بحال کرنے کی غرض سے بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ کبکچی اوغلو مصطفٰی ناخواندہ تھا، تاہم اس نے بغاوت کی قیادت میں نمایاں صلاحیت کا ثبوت دیا، لیکن اس کے خلاف یہ اعتراض حق بجانب ہے کہ اس نے اس اصلاحی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی، جس پر سلطان سلیم ثالث کے عہد میں عمل ہو رہا تھا۔

مآخذ: (۱) سجلِّ عثمانی، ۴: ۵۹۴ ببعد؛ (۲) *Révolution de*: A.D. Juchereau de Saint-Denis *Coastantinople en 1807 et 1808*، پیرس ۱۸۱۹ء، ۲: ۱۱۳ تا ۱۷۱؛ (۳) عاصم: تاریخ، مطبوعۂ استانبول، ج ۲، بمواضع کثیرہ؛ (۴) احمد جودت: تاریخ، استانبول ۱۳۰۹ھ، ۸: ۱۵۷ تا ۲۹۷؛ (۵) مصطفٰی نوری: نتائج الوقوعات، استانبول ۱۲۹۴ تا ۱۳۲۷ھ، ۴: ۴۸ تا ۵۵؛ (۶) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: مشہور روم ایلی اعیان لرندن علمدار مصطفٰی پاشا، استانبول ۱۹۴۲ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) وهی مصنف: کبکچی مصطفٰی عصیانینه دائر یا یزلمش برتاریخچه، در *Belleten*، ج ۶ (۱۹۴۲): ۲۵۳ تا ۲۶۷؛ (۸) وهی مصنف: کبکچی وقعه عصینه دائر بر مکتوب، در *Belletin*، ۲۹ (۱۹۶۵): ۵۹۹ تا ۶۰۴؛ (۹) Zinkeisen، ۷: ۴۶۳ تا ۴۷۱، ۵۵۲ تا ۵۵۷؛ (۱۰) N.Jorga: *Geschichte des Osmanischen Reiches*، گوتھا ۱۹۱۰ء، ج ۵، بمدد اشاریہ؛ (۱۱) A. F. Miller: *Mustafa Pasha Bayraktar*، ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۴۷ء؛ (۱۲) S. I. Shaw: *Between old and new: the Ottoman Empire under Salim III (1789-1807)*، کیمبرج (میسا چوسٹس) ۱۹۷۱ء؛ (۱۳) H.D.Andreasyan (ترجمہ): جارج اوغلوقیانگ روزنامہ سی، ۱۸۰۶ تا ۱۸۱۰، عصیانلری، ۳: سلیم رابع مصطفٰی ثانی و علمدار مصطفٰی پاشا، استانبول ۱۹۷۲ء؛ (۱۴) احمد رفیق: کبکچی مصطفٰی، استانبول ۱۳۳۱ھ.

(E. KURAN)

* **کُبو** : [جمہوریۂ انڈونیشیا کے صوبۂ مغربی کالی منتان کا ایک ضلع]، جو دریاے کپواس Kapuas کے ڈیلٹا کے جنوبی حصے میں واقع ہے ۔ ولندیزی دور حکومت میں اسے حکومت خود مختاری حاصل تھی اور انتظامی لحاظ سے یہ بورنیو کے مغربی حصے کی ریزیڈنسی (Westerafdeeling von Boaneo) کی قسمت پونتیانک Pontianak [رک بآں] کے ماتحت تھا ۔ شمال میں کپواس کا طویل و عریض دریا اسے ریاست پونتیانک سے جدا کرتا ہے، مشرق میں تیان Tayan اور سمپانگ Simpang کے اضلاع ہیں اور جنوب اور مغرب میں بحیرۂ چین ۔ ریاست کبو کی بنیاد ۱۷۸۰ء کے لگ بھگ ایک عرب سید عیدروس العیدروس نے رکھی تھی، جو دریاے ترنتانگ Terentang کے دہانے کے قریب اپنے چند عرب، بوگنی Bugniese اور ملائی پیروؤں کے ہمراہ مقیم ہوگیا تھا (اس سے تھوڑی ہی مدت بعد ایک اور مہم جو عرب شریف عبدالرحمن القادری نے، جو اس کا برادر نسبتی تھا، ریاست پونتیانک کی بنیاد رکھی)۔ ریاست کبو اور اس کے صدر مقام کا نام ایک خندق (ملائی : کبو) سے منسوب ہے، جو بحری لٹیروں کے حملوں سے بچنے کے لیے کھودی گئی تھی ۔ العیدروس نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر حفاظت آنا قبول کیا اور کمپنی نے اسے توان (Tuwan = حاکم) کے خطاب کے ساتھ یہاں کا حکمران تسلیم کر لیا ۔ زمین کے اعتبار سے اس ضلع کی اہمیت بہت کم ہے ۔ بیشتر علاقہ جنگلوں سے پٹی ہوئی دلدلوں پر مشتمل ہے، جنھیں کہیں کہیں (زیادہ تر شمال مغربی ضلع امباونگ Ambawang میں) پانی نکال کر خشک کردیا گیا ہے ۔ یہ اراضی نہایت قدیم طرز کی کاشتکاری اور ناریل پیدا کرنے ہی کے لیے موزوں ہے ۔ آبادی زیادہ نہیں اور جو ہے وہ بکھری ہوئی ہے۔ یہاں تقریباً سب کے سب تارکین وطن ہی آباد ہیں ۔ مخلوط النسل عربوں اور قلیل التعداد چینیوں کو چھوڑ کر باقی آبادی زیادہ تر بوگنیوں پر مشتمل ہے ۔ ڈیاک Dayaks تعداد میں بہت ہی کم ہیں ۔ اکثریت اسلام کی پیرو ہے ۔ ریاست کے حکمران کا صدر مقام ایک معمولی سی بستی تھی اور وہ تین وکیلوں کی مدد سے حکومت کرتا تھا ۔ یہ وکیل اس کے اپنے خاندان کے رکن ہوتے تھے، جنھیں گزر اوقات کے لیے کچھ زمین دے دی جاتی تھی ۔ [۱۹۵۰ء میں جب ولندیزیوں کا وفاقی نظام ختم کر دیا گیا اور اس کے بجاے وحدانی طرز حکومت کا نفاذ ہوا تو بورنیو کی ریاستیں بھی جمہوریۂ انڈونیشیا کی متحدہ مملکت میں شامل ہوگئیں ۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ انڈونیشیا؛ پونتیانک] .

مآخذ : P. J. Veth (۱) : *Borneo's Wester-afdeeling* ۲ جلد، Zaltbommel ۱۸۵۴-۱۸۵۶ء؛ (۲) H. von Dewall : *Matan, Simpang, Soekadana, de karimata-eilanden en Koeboe*، در *TBGKW*، ج ۱۱/۱ (۱۸۶۲ء)؛ (۳) J. J. K. Enthoven : *Bijdrgen tot de geographie van Borneo's Westerafdeeling*، لائیڈن ۱۹۰۳ء ۲ : ۸۶۹؛ (۴) *Encyclopaedie van Neder-landsch Indie* بار دوم، ۲ (۱۹۱۸ء) : ۳۵۷ (بذیل مادّۂ KOEBOE)؛ [(۵) شاھد حسین رزاقی : انڈونیشیا، لاھور ۱۹۶۳ء؛ مزید مآخذ کے لیے رک بہ انڈونیشیا].

(W. H. Rassers [و ادارہ])

* **کبیر** ۔ پندرھویں صدی کا ایک ہندوستانی صوفی، جس کے بارے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے دعوٰی کیا کہ وہ ان کے مذہب کا پیرو تھا ۔ اس سے ہندی دوھوں کی ایک کثیر تعداد منسوب کی جاتی ہے، لیکن ان کا مستند ہونا مشتبہ ہے ۔ اسی طرح اس کے حالات زندگی کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اصل

حقیقت افسانوی روایات کے نیچے دب کر رہ گئی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مسلمان جلاہے کا بیٹا یا متبنّٰی تھا اور ویشنو مت کے ایک مصلح رامانند کا چیلا بن گیا تھا ۔ وہ بنارس میں رامانند کے چرنوں میں بیٹھتا اور ان مذہبی اور فلسفیانہ مباحث میں حصہ لیتا رہا، جن میں اس کا گرو برھمنوں اور صوفیوں کے ساتھ حصہ لیا کرتا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بافندگی اس کی گزر اوقات کا ذریعہ تھی ۔ اس نے شادی بھی کی تھی اور اس کے بچے بھی ہوئے ۔ وہ جہاں یوگیوں کی پیشہ ورانہ رہبانیت کو حقارت سے دیکھتا تھا وہاں کٹر مذہبی لوگوں کے عقائد و ضوابط سے بھی بے پروا تھا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ۔ اس نے اپنے صوفیانہ عقیدے کے مطابق توحید الٰہی کے گیت گائے، جس کے باعث اسے جبر و تشدد کا ہدف بھی بننا پڑا ۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۵ء میں، جب اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی، اسے بنارس سے نکال دیا گیا ۔ اس نے بالآخر ۱۵۱۵ء میں مگھر (ضلع بستی) میں وفات پائی ۔ مشہور ہے کہ اس کی میّت کی آخری رسوم ادا کرنے کے سلسلے میں اس کے ہندو اور مسلمان چیلوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا کیونکہ ہندو اسے جلانا اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے ۔ جب انھوں نے وہ کپڑا اٹھایا جس سے لاش ڈھکی ہوئی تھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میت کے بجائے پھولوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے ۔ ان میں سے نصف پھول ہندوؤں نے بنارس میں نذر آتش کر دیے اور باقی نصف مسلمانوں نے مگھر میں سپرد خاک کیے، جہاں ان کی خانقاہ مسلمان کبیر پنتھیوں کے زیر نگرانی آج تک موجود ہے ۔ کبیر کے معاصرین کی طرح عصر حاضر کے علما میں بھی یہ اختلاف رائے موجود ہے کہ وہ ان دو متخالف مذہبوں میں سے کس کا پیرو تھا ۔ ایچ ۔ ایچ ۔ ولسن H. H. Wilson (ص ۶۹، ۷۴) اور آر ۔ جی ۔ بھنڈارکر (ص ۶۹) اسے ہندو مانتے ہیں، اور جی ۔ ایچ ۔ ویسٹ کوٹ G. H. Westcott (ص ۲۹ ببعد) مسلمان ۔ گریرسن G. H. Grierson کا نظریہ (*JRAS*، ۱۹۰۷ء، ص ۳۲۵، ۴۹۲) کہ اس نے اپنے خیالات عیسائی ماخذ سے حاصل کیے تھے، ایک بے بنیاد خوش فہمی ہے اور اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے کلام کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اسے کسی منظم مذہب سے منسلک ہونے کی کوئی خواہش نہیں تھی:

[''اپنے بچار اسواری کیجیے
سہج کے پائڈے پاو جب دیجیے
جن کبیر ایسا اسوارا
بید کتیب دوہوں تھے نیارا

(کبیر گرنتھاولی، بتصحیح شیام سندر داس، بار چہارم، سمت ۲۰۰۸/۱۹۵۱ء، ص۹۶)]، یعنی مجھ بچارے کو اپنی زین بنانے دو اور عشق الٰہی کی رکاب میں پاؤں رکھنے دو ۔ کبیر کہتا ہے کہ اچھے سوار وہی ہیں جو ویدوں اور قرآن مجید سے دور رہتے ہیں''۔ ایسے ہی اس نے اپنے کسی مذہبی یا فلسفیانہ نظام کو تشکیل دینے کی بھی کوشش نہیں کی ۔ بایں ہمہ اس نے کسی خاص اوتار سے تعلق قائم کیے بغیر اپنے زمانے کی ویشنو دھرم کی تعلیمات کو عام کیا اور آزادانہ طور پر خدا کو رام، ہری، علی، یا اللہ کے نام سے پکارا ۔ اس نے ہندو دھرم کے ظواہر، مثلاً جنیو، ذات پات کی تمیز اور مندروں میں پوجا پاٹ کی رسوم کو رد کر دیا؛ اسی طرح اسلامی اسناد و تاسیسات (مثلاً قرآن مجید، ختنہ، حج، ملّا، قاضی، وغیرہ) کے بارے میں اس نے جو اشارے کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اسے انھیں تسلیم کرنے سے انکار تھا ۔ اس کے نزدیک خدا ایک ایسی حقیقت

ہے جو ہر جگہ موجود ہے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ روح انسانی کی جداگانہ انفرادیت کا قائل تھا، جسے وصال الٰہی کسی علم یا رسمی عبادت کے ذریعے سے نہیں، بلکہ عشق کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے ۔ اس نے سادہ مثالوں اور روز مرہ کی زندگی سے گہرے تعلق کی مدد سے اپنے عقائد ایسی شکل میں پیش کیے کہ ان پڑھ لوگوں نے، جن پر اس کے پیروؤں کی اکثریت مشتمل نظر آتی ہے، انھیں بلا تامل قبول کر لیا۔

مآخذ : (۱) دبستان مذاہب، کلکتہ، ۱۸۰۹ء، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸ و مترجمۂ Shea و Troyer، پیرس ۱۸۴۳ء، ۲ : ۱۸۶ تا ۱۹۱؛ (۲) H. H. Wilson : *Essays on the Religion of the Hindus*، ۵۸ ببعد (لنڈن ۱۸۶۲ء، ۱ : ۶۸ ببعد)؛ (۳) *Gli scritti de Padre Marco Della Tomba*، طبع Gubernatis (Firenze ۱۸۷۸ء)، ص ۱۹۱ ببعد، ۲۰۵ ببعد؛ (۴) E. Trumpp : *Bermerkungen über den indischen Reformator Kabir* در *Atti del iv. Congresso internat. deg li Orientalisti* Firenze ۱۸۸۰ تا ۱۸۸۱ء، ۲ : ۱۵۹ ببعد؛ (۵) کبیر چرتر طبع پنڈت والجی بچر، سورت ۱۸۸۱ء؛ (۶) G. H. Westcott : *Kabir and the Kabir Panth*، کانپور ۱۹۰۷ء؛ (۷) M. A. Macauliffe : *The Sikh Religion*، (اوکسفرڈ ۱۹۰۹ء، ۶ : ۱۲۲ ببعد؛ (۸) *One Hundred Poems of Kabir*، مترجمۂ رابندر ناتھ ٹیگور بہ اعانت Evelyn Underhill، لنڈن ۱۹۱۴ء (۹) رام چندر بوس *Hindu Heterodoxy*، کلکتہ، ۱۸۸۷ء، باب ۱۰؛ (۱۰) Sir. R. G. Bhandarkar : *Vaisnavism, Saivism, and Minor religious Systems*، در Strassburg *Encyclopaedia of Indo-Aryan Research*، ۱۹۱۳ء، ۳/۶ : ۶۷ تا ۷۳؛ (۱۱) *The Bijak of Kabir*، مترجمۂ پادری احمد شاہ، ہمیر پور ۱۹۱۷ء؛ (۱۲) G N. Farquhar : *An Outline of the Religious Literature of India*، اوکسفرڈ ۱۹۲۰ء، ص ۳۳۱ تا ۳۳۵؛ [(۱۳) پنڈت منوہر لال زتشی : کبیر صاحب، الٰہ آباد، ۱۹۳۰ء، جس کے آخر میں رجوع کرنے کے لیے کتابوں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے] ۔ کبیر سے منسوب تصنیفات کا کوئی تنقیدی نسخہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ ان کی فہرست کے لیے دیکھیے Westcott : کتاب مذکور، ص ۷۳، ۷۳، ۱۶۹ تا ۱۷۲ ۔

(T. W. ARNOLD)

الکبیر : باری تعالٰی کا ایک نام، رک بہ * اللہ ؛ الاسماء الحسنٰی .

کبیر پنتھی : (ہندی میں پنتھ کے معنی ہیں * طریقہ، مذہبی فرقہ) ۔ کبیر کی تعلیم کی اس خصوصیت کے باوجود کہ وہ فرقہ بندی کے خلاف تھی، آج کل اس کے پیروؤں کا ایک مخصوص فرقہ ملتا ہے، جس کی غالب اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے ۔ کبیر پنتھیوں کی تنظیم کے بارے میں بہترین بیان Westcott : *Kabir and Kabir Panth*، کانپور ۱۹۰۷ء، باب ۵، ۶، میں ملتا ہے ۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد صوبجات متوسطہ میں ۱۹۹۷۵۹ اور صوبجات متحدہ میں ۹۶۰۵ تھی ۔ دوسرے صوبوں میں وہ یا تو ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں تو بہت کم .

مآخذ : (۱) W. Crooke : *Tribes and Castes of the North-Western Provinces and Oudh*، کلکتہ ۱۸۹۶ء، ۳ : ۷۳ تا ۷۷ ؛ (۲) R. V. Russell : *Tribes and Castes of the Central Provinces of India*، لنڈن ۱۹۱۶ء، ۱ : ۲۳۲ ببعد؛ (۳) *Gazetteer of the United Provinces*، الٰہ آباد ۱۹۰۷ء، ۳۲ : ۲۲۵، ۲۲۶؛ (۴) *Central Provinces Gazetteer : Bilaspur District*، الٰہ آباد ۱۹۱۰ء، ص ۷۸ تا ۸۰ .

(I. W. ARNOLD)

کتاب . (ع؛ جمع : کُتُب) عربوں نے لکھے *

کا فن اپنے سامی النسل شمالی پڑوسیوں سے سیکھا اور انھیں سے کتاب اور کتابت سے متعلق اصطلاحیں اخذ کیں ۔ ان کی ابتدائی عبارتوں میں ہر تحریر شدہ چیز ''کتاب'' کہلاتی تھی ۔ یہ ضروری نہ تھا کہ وہ واقعی ''کتاب'' ہی ہو اور سچ تو یہ ہے کہ خط اور مراسلے تک کو محض ''کتاب'' ہی کہتے ہیں ۔ چونکہ ہمارے سامنے قرآن مجید سے پہلے کی کوئی کتاب نہیں اور پتھروں پر کندہ بعض تحریروں کے علاوہ اگر کوئی اور چیز باقی ہے تو پرانے زمانے کے شعرا کی چند نظمیں ہیں جن کے ساتھ ہم ان قصوں (رک بہ قصّہ) کا اضافہ کر سکتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظمیں کن مواقع پر کہی گئی تھیں، لہٰذا ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے کتابوں کا وجود تھا یا نہیں ۔ قرآن مجید میں لفظ ''کتاب'' اکثر جگہ مختلف معانی میں آیا ہے، لیکن اپنے نمایاں ترین مفہوم میں ''کتاب'' عبارت ہے اس مقدس نوشتے سے جو وحی الٰہی پر مشتمل ہو اور اللہ نے اپنے بندوں کے لیے اسے نازل کیا ہو؛ لہٰذا اُن تین مذاہب کے پیرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے کے نصاریٰ، یہود اور مجوسی ''اہل الکتاب'' کہلائے [مجوسی اہل کتاب نہیں، البتہ ان کی عورتوں سے نکاح کے علاوہ باقی امور میں ان سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنے کا حکم حضرت عمر فاروقؓ نے دیا تھا] ۔ نصاریٰ کی کتاب سے مراد ''انجیل'' یعنی عہد نامۂ جدید اور یہود کی کتاب سے مراد غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ''اسفار الخمسۃ (Pentateuch)''، نیز مزامیر ہیں ۔ مجوسیوں کی کسی کتاب کا ذکر نہیں، البتہ قرآن مجید میں ایک اور ''کتاب'' [یعنی ''لوح محفوظ''] کا ذکر ملتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی تقدیر لکھ دی ہے اور کوئی شخص اپنی زندگی میں جو بھی اچھے برے کام کرتا ہے وہ برابر اس میں لکھ دیے جاتے ہیں تاکہ بطور شہادت پیش ہو سکیں اور قیامت کے دن اسی کے مطابق جزا اور سزا ملے ۔

بہر حال سب سے ارفع و اعلیٰ کتاب [= الکتاب] قرآن مجید ہے ۔ یہ وحی من جانب اللہ ہے، جو تمام ایسی تحریفات سے مبرّا و منزہ ہے جو بد نیتی یا انسانی سہو و نسیان کا نتیجہ ہوں ۔ خود اس کا اپنا دعوی ہے کہ دنیا میں کوئی کتاب اس کی ہمسری نہیں کر سکتی اور نہ آئندہ کر سکے گی، اس لیے کہ وہ اللہ کا سچا کلام ہے ۔ چونکہ ''الکتاب'' اللہ کا کلام ہے اس لیے قرآن مجید میں یہ لفظ ''حکم خداوندی'' کے مفہوم میں بھی آیا ہے، یا اس سے مراد وہ ''نقش'' بھی ہے جو اللہ آدمی کے دل پر لگا دیتا ہے ۔ پھر چونکہ جو چیز لکھ دی جائے وہ باقی رہتی ہے، اس لیے اللہ نے اپنی طرف سے یہ ''لکھ دیا''، یعنی اپنے اوپر واجب کرلیا کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا ۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتاب کے معنی ایک معمولی خط یا اس پیغام کے بھی ہیں جو کسی دور افتادہ شخص کو لکھا جائے ۔

اگر ہم عہد جاہلیت کے عرب شعرا کے کلام میں اس لفظ کے معنی تلاش کریں، تو مذکورۂ بالا تمام معنی میں اس لفظ کا مستعمل ہونا پایا جاتا ہے، لیکن اگر وحی الٰہی کے معنوں میں اس کا استعمال کہیں نظر آئے تو پھر ہمیں اسے شک کی نگاہ سے دیکھنا ہوگا ۔ عَدِی بن زید ایک نصرانی شاعر تھا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کچھ ہی پہلے گزرا ہے ۔ اس کے متعلق اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ اس نے فعل ''کتب'' تنقید کے معنوں میں استعمال کیا ہے (جَمْهَرَةُ الاَشْعارِ النَّصرانيّة، طبع شیخو Cheikho، ص ۱۹۲ ببعد)، لیکن ہو سکتا ہے کہ بعد کے زمانے کے کسی

جعلساز نے یہ نظم اس سے منسوب کر دی ہو ۔ بہر حال اعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن مجید میں جن معنوں کا اظہار کیا گیا ہے ان کے بارے میں اگر ایسے قدیم شواہد ملیں تو لازمی طور پر وہ جھوٹے ہی ہوں گے ۔ پرانی نظموں میں غیر زبانوں کے رسم الخط میں لکھی ہوئی تحریروں کے حوالے زیادہ کثرت سے ملتے ہیں اور اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ قدیم شعرا کم از کم ایسی قلمی کتابوں کی ظاہری شکل و صورت سے بخوبی آشنا تھے جنھیں مطلاّ و مذہب سرورقوں سے مزّین کیا گیا ہو ۔ شاعر طفیل الغَنَوی (۵/۱۰ : ۳) نے اپنے ایک شعر میں ''پروانۂ راھداری'' کو ''کتاب'' لکھا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ کتاب کے معنوں میں بحیثیت ایک ادبی تالیف یا تخلیق کے ملتا ہے اور اگرچہ مجھے یقین ہے کہ بعض منظومات ابتدائی زمانے ہی میں ضبط تحریر میں آ چکی تھیں، تاہم کوئی تصنیف یا تالیف اس وقت تک کاغذ یا رَقّ (Parchment) پر نہیں لکھی گئی جب تک کہ قرآن مجید کے ضبط تحریر میں آنے کے بعد کچھ مدت نہیں گزر چکی تھی ۔ اسی طرح یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ عربی میں کون سی تالیف یا تصنیف پہلی مرتبہ کتاب کی شکل میں لکھی گئی ۔ جامعین احادیث نبویہ عرصۂ دراز تک حدیث کی زبانی روایت پر مصر رہے ۔ غالباً یہی صورت حضرت ابن عبّاسؓ کی تفسیر قرآن کی رہی ۔ یہ تفسیر خاصی مبسوط ہو گی کیونکہ البَغوی نے معالِم التّنزیل میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب انھیں تین مختلف واسطوں سے ملی تھی ۔ مغازی یا سیرت نبوی کے متعلق کتابیں بھی بہت شروع زمانے میں تحریری شکل میں آ گئی تھیں۔ چونکہ تمام قدیم تصانیف و تالیفات آج ناپید ہیں اور ان کے صرف اقتباسات باقی ہیں، اس لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ واقعی وہ ''کتابیں'' تھیں ۔ بہر حال ایک بات یقینی ہے کہ شاعر لَبِید کے دیوان کے چند قلمی نسخے پہلی صدی ہجری میں موجود تھے، جس کی شہادت الفرزدق کے ایک شعر سے ملتی ہے (نقائض، طبع Bevan، ۱ : ۲۰۱ س ۶) ۔ اس شعر میں الفرزدق نے بیان کیا ہے کہ اس کے پاس لبید کے اشعار کی پوری کتاب ہے ۔ اس کے بعد ممالک اسلامیہ میں نہایت سرگرمی سے کتابیں لکھی جانے لگیں ۔ اس کی تصدیق مختلف تذکروں سے ہوتی ہے جن میں ہزارہا ایسی کتابوں کے نام ملتے ہیں جو ضائع ہو چکی ہیں ۔ آخر میں یہ ذکر کر دینا مناسب ہو گا کہ ایک اور کتاب کو بھی محض ''الکتاب'' کہلوانے کا امتیاز حاصل ہوا اور وہ ہے سیبَوَیہ البصری کی قواعد نحو پر عظیم تالیف ۔ اوائل اسلام کی یہی وہ نہایت مبسوط تالیف ہے جو ہم تک پہنچی ہے ۔

عربی لغویوں نے کوشش کی ہے کہ عربی زبان میں اس مادّے کے دیگر مشتقات سے، جو مختلف معانی رکھتے ہیں، اس لفظ کے مفہوم کا استخراج کریں ۔ ان معانی کے متعلق لغت کی کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک ایسا لفظ جو فن کتابت کے ساتھ شمال سے آیا ہو اس کا کوئی اشتقاق وہاں تلاش کرنا لا حاصل ہو گا ۔

(F. KRENKOW)

کتاب الأسْطُقُص : (Tabula Samaragdina)*

ہرمیس تریسمجیست Hermes Trismegistos سے منسوب کیمیا گری کی تعلیمات ۔ اگرچہ یورپ اس کتاب کے ترجمے سے بارھویں صدی عیسوی کے وسط سے واقف تھا، لیکن اصل کتاب کی دستیابی آج تک علم الکیمیا کی تاریخ کا لاینحل مسئلہ رہا ہے [دیکھیے ابن القفطی: تاریخ الحکماء،

ص ۱۲۹، "کتاب الاُسطُقُصّات (= الاُسطُقُسات) نقل حنین"، در حالات جالینوس] ۔ بیکن کی تصانیف کی اشاعت (۱۹۲۰ء) میں R. Steele نے ثابت کیا ہے کہ *Tabula* کا متن نام نہاد ارسطا طالیس کی تصنیف سرالاسرار کے عربی اور لاطینی ترجمے میں محفوظ ہے ۔ ۱۹۲۳ء میں E. J. Holmyard نے جابر بن حیان کی کتاب الاسطقص الثانی کی صورت میں ایک قدیم تر متن کا پتا چلایا ہے ۔ J. Ruska نے بھی ثابت کیا ہے کہ کتاب کے بعض ژولیدہ مقامات کا مأخذ سرّالخلیقہ کا خاتمہ ہے، جو Hermes کی تالیف ہے اور بلینوس کو ہرمس کی قبر سے ملی تھی ۔ شاید اس کے مطالعے سے *Tabula* کی تاریخ کے بعض مقامات پر Hugo Sartelliensis کے زمانے سے عصر حاضر تک روشنی پڑ سکے ۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جابر بن حیان بلینوس (Appollonius) کی کتاب سے پہلے سے متعارف تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ کتاب باطنی حلقوں کی پیداوار ہے ۔

مآخذ: R. Steele: *Opera hactenus inedita Rogeri Baconi*، اوکسفرڈ ۱۹۲۰ء، ج ۵؛ (۲) E. J. Holmyard: *The Emerald Table*، در *Nature*، ۱۹۲۳ء، ۲: ۵۲۵؛ (۳) J. Ruska: *Tabula Smaragdina*، ہائڈلبرگ ۱۹۲۶ء؛ (۴) M. Plessner: *Neue Materialien zur Geschichte der Tabula Smaragdina*، در *ISL*، ۱۹۲۷ء، ص ۷۷ ببعد؛ (۵) J. Ruska: *Die siebzig Bücher des Ǧabir ibn Ḥajjan*، در *Studien zur Gesch. d. Chemie, Festschrift für E. O. V. Lippmann*، برلن ۱۹۶۷ء، ص ۴۴؛ (۶) ابن ابی اصیبعة: عیون الانباء، ص ۱۵۵]۔

(J. RUSKA)

* **کتابُ اللہ**: رک بہ قرآن ۔

* **کتاب الجِلوَہ**: فرقۂ یزیدیّہ [رک بآں] کی دو مقدس کتابوں میں سے ایک کتاب؛ اس میں اور مُصحَف راش میں ان کے مذہب کی بنیادی چیزیں دی گئی ہیں ۔ چونکہ یزیدیوں کی مذہبی زبان کردی ہے اور ان کی جن دعاؤں کا ہمیں علم ہے وہ سب بھی کردی زبان میں ہیں (مثلاً سب سے بڑی یعنی صبح کی دعا، اصطباغ اور ختنے کے وقت پڑھے جانے والے کلمات، مجلس سنجاق میں کیے جانے والا اعلان؛ مُصحَف راش کے مشکوک الصحة بیانات کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود خدا بھی کردی زبان بولتا ہے) ۔ عجیب بات ہے کہ یزیدیوں کی دونوں مقدس کتابیں، جن کا وجود مدتوں سے معلوم ہے اور جن کے اصل نسخے یورپیوں کے قبضے میں آ چکے ہیں، عربی میں ہیں، یعنی (۱) کتاب الجلوۃ (کِتیبِ جَلْوۃ) یا "کتاب الوحی" (شرف الدّین نے ان مخطوطات کی بنا پر جو اس کی دسترس میں تھے اس لفظ کو جُلْو لکھا ہے، مگر یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے)؛ (۲) مصحَف راش (= "سیاہ کتاب") : ظاہر ہے یہاں سیاہ سے مراد کوئی مقدس چیز ہے، مثلاً یہ کہ خدا "سیاہ پہاڑ" پر اترتا ہے (مُصحَف، عدد ۱۶)۔ نام کی یہ تشریح کہ ممنوعہ کلمات کی نسبت چونکہ کہا جاتا ہے کہ انھیں سیاہ موم سے ڈھانک دیتے ہیں، اس لیے اس کتاب کا یہ نام ہوا، غلط ہے، کیونکہ یہاں قرآن مجید کا ذکر یزیدیوں کی مقدس کتاب کے متبادل کے طور پر کیا گیا ہے ۔

پادری انستاس ماری (Father Anstase Marie) البغدادی پہلا شخص ہے جو ۱۹۰۴ تا ۱۹۰۶ء میں سِنجار کے ناظر کتب کو رشوت دے کر ان دو مقدس کتابوں کے مزعومہ اصل نسخوں کے چرپے لینے میں کامیاب ہوا جو رقّ پر لکھے ہوئے ہیں ۔ یہ کتابیں مخفی رسم الخط میں اس قدیم کردی میں لکھی گئی ہیں جو ارمنی زبان کی

یاد تازہ کرتی ہے ۔ اس مخفی رسم الخط میں لکھے ہوئے متن سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسے جس اصل نسخے سے نقل کیا گیا وہ عربی میں تھا ۔ بایں‌ہمہ جعل سازی کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً اس لیے کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یورپی فضلا کو یزیدی مذہب میں دلچسپی ہے تو موصل میں کئی دھوکے باز نئے متون دریافت کرنے کی کوشش میں رہنے لگے ۔ منگانا Mingana نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیرالکوش (Alkosh) کے ایک سابق نسطوری راہب شماس ایریمیا شامر Shammas Eremia Shamir (م ۱۹۰۶ء) نے، جو استقفیۂ کرکوک کا باشندہ تھا، ان تمام متون کی جعلسازی کی تھی جنھیں Chabot، Giamil، Isya Joseph اور Browne نے شائع کیا تھا: تاہم معلوم ہوتا ہے کہ Maxim Bittner نے اس موضوع پر اپنے تحقیقی مقالے *Die heiligen Bücher der Yeziden oder Teufelsan-* *better*، مع *Nachtrag*، در *Denkschriften d. Wiener Ak. d. Wiss*، میں تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کرکے اس کردی متن کو مستند ثابت کر دیا ہے ۔ اس متن میں کردی زبان کی ایک حقیقی متروک شکل ملتی ہے، جو اب بولی نہیں جاتی اور جس کا مُکری Mukri بولی سے، جو سنجاق سلیمانیہ کے بیبہ Bebe کردوں کی زبان ہے، قریبی تعلق ہے؛ لہٰذا کسی مشرقی جعل ساز کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اپنے محدود ذرائع سے اسے از سر نو ترتیب دے سکے ۔ ان کتابوں کی زبان وہ نہیں ہے جو یزیدی آج کل بولتے ہیں ۔

بہر حال یہ سوال ابھی حل طلب ہے کہ آیا کردی نسخہ اپنی قدیم زبان کے باوجود عربی نسخے سے در حقیقت قدیم تر ہے، یا جیسا کہ بعض لسانی خصوصیات غمازی کرتی ہیں (مثلاً ضلع جگت کا استعمال جو کردی زبان میں نا قابل فہم ہے) محض عربی سے دوبارہ کردی زبان میں ترجمہ ہے، جو قدیم زمانے میں کیا گیا ۔

ہو سکتا ہے کہ در اصل کتاب الجَلوہ کردی زبان میں لکھی گئی ہو کیونکہ کئی مقامات پر عربی متن کے مقابلے میں کردی متن کی عبارت زیادہ واضح اور مربوط ہے ۔ اس کے برعکس مصحف راش کا عربی متن کردی متن سے بہتر ہے ۔ بقول شرف الدّین کتاب الجلوہ اپنی موجودہ شکل میں کسی عرب کی لکھی ہوئی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس کی زبان جدید ہے؛ بہت سی تعبیرات ایسی ہیں جنھیں کلاسیکی عربی میں استعمال ہی نہیں کیا جاتا تھا، یا ان کا استعمال بہت بعد کے زمانے میں ہونے لگا تھا ۔ کئی ایک مقامات پر جملوں کی ساخت بھی غیر عربی ہے ۔ مصحف راش کی عربی اس سے بھی زیادہ جدید ہے کیونکہ اس میں عثمانی ترکی کے اثرات ناقابل انکار طور پر پائے جاتے ہیں ۔

اب تک ہمیں ان دو مقدس کتابوں کے کم از کم چار نسخوں کا علم ہے : ان میں سے ایک ۱۸۹۵ء میں O. Parry کی ملکیت تھا؛ دوسرا نسخہ Isya Joseph کے پاس ہے، جسے *Amer. Journ. of Sem. Lang.*، ج ۲۵، میں شائع کیا گیا تھا ؛ اس کے علاوہ اس کے پاس اس کتاب کے دو اور نسخے بھی ہیں ۔ یہ دو نسخے Father Anastase Marie نے حاصل کیے تھے جن میں سے ایک کو سنجاری نسخہ کہا جاتا ہے، جسے ۱۸۹۹ء میں ایک یزیدی مرتد کے لیے کسی سنجاری یزیدی نے نقل کیا تھا، بحالیکہ دوسرا خود انستاس نے ایک موصلی کے اصل نسخے سے ۱۹۰۴ء میں نقل کیا تھا ۔

کتیب جَلوہ، جس کی اصل بقول Joseph ۱۸۹۲ء میں بھی ملا حیدر کے مکان، واقع

باعدّیہ، میں تھی اور جسے سال میں دو بار شیخ عدی کے مزار پر لے جایا جاتا تھا، بہت مختصر ہے ۔ کتابی صورت میں اس کے آٹھ صفحے بنتے ہیں اور اس کی ۱۰۹ سطریں ہیں ۔ اسے اس مذہب کے مشہور بانی شیخ عَدِی [رکّ بان] (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء یا ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے یہ کتاب شیخ فخر الدّین کو املا کرائی تھی ۔

چونکہ کتاب الجلوہ کا ذکر الردّ علی الرّافضة والیزیدیة المخالفین للملّة الاسلامیّة المحمّدیه میں نہیں آیا، جسے ابن جمیل (ابو فراس عبید اللہ) جیسے باخبر مصنّف نے، جو رستاق فرات کا رہنے والا تھا، ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں تصنیف کیا تھا اور نہ المقریزی ہی نے اس کا کوئی ذکر ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں شیخ عَدِی کے مزار کی تباہی اور اس کی ہڈیوں کو جلانے کی کیفیت لکھتے وقت کیا ہے؛ لہٰذا شرف الدّین اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کتاب کی تاریخ تالیف ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء یا ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء سے پہلے متعین نہیں کی جا سکتی ۔ چونکہ اولیا چلبی نے بھی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا، اس لیے اس کتاب کی تاریخ تالیف کو اور پیچھے، یعنی ۱۶۵۵ء تک، لانا ہوگا.

بہرحال مذکورۂ بالا حقائق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یزیدیوں کو اس کتاب کا راز مخفی رکھنے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے ۔ باوجود ان فوائد کے جو انہیں اہل الکتاب کی حیثیت سے حاصل ہو سکتے تھے انہوں نے اپنی مقدس کتابوں کے وجود سے انکار کرنے کو ترجیح دی ۔ [اسلام میں ہر صاحب کتاب قوم کو اہل کتاب نہیں کہا گیا ۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں اہل الکتاب کہا گیا ہے اس سے مراد خصوصاً یہودی اور عیسائی ہی ہیں] ۔

صرف شیخ میران اسمٰعیل بِک عَبْدی بِک اوغلو نازلی رحانی یزید کی مسائل آموز (Catechism) کتاب میں، جو اس نے روسی یزیدیوں کے لیے لکھی تھی، "شاندار جلوہ" (Gyliazim) کا حوالہ یزیدی روایت کے ایک مأخذ کی حیثیت سے دیا گیا ہے ۔

کِتیبِ جَلوہ کے محتویات، جن کی ہیئت اور متن دونوں اس کے بلند مقاصد کے مطابق ہیں، مندرجۂ ذیل ہیں: ملک طاؤس نے، جو تمام کائنات سے پہلے موجود تھا، عبطاؤس (= عبد طاؤس = شیخ عدی) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ اس کے برگزیدہ بندوں یعنی یزیدیوں کو زبانی طور پر اور بعد ازاں کتیب جلوہ کے ذریعے ہدایت دے، جسے پڑھنے کی کسی غیر یزیدی کو اجازت نہیں (دیباچہ) ۔ اس کے بعد وہ صیغۂ متکلم میں اپنے ازلی اور ابدی ہونے، تمام دیگر خالقوں اور دیوتاؤں (نہ کہ مخلوقات، جیسا کہ عربی متن میں ہے) پر قدرت مطلق رکھنے اور اپنے حاضر و ناظر اور رزّاق ہونے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام دیگر کتب مقدسہ غلط ہیں؛ خیر و شر واضح طور پر قابل ادراک ہیں؛ دنیا پر اسی کی فرمانروائی ہے اور اس کے نا قابل فہم حکم کی رو سے ہر دور میں ایک بڑا آدمی ہماری ہدایت کے لیے دنیا میں بھیجا جاتا ہے (باب اوّل) ۔ اس کے بعد وہ اپنے جزا و سزا دینے کے اختیار کا ذکر کرتا ہے، جس سے نا اہل لوگوں کو بھی فوائد سے محروم نہیں کیا جاتا ۔ پھر ایک سچے یزیدی کی موت اور تناسخ ارواح کا ذکر کرتا ہے (باب ۲) ۔ وہ کہتا ہے کہ صرف اسی کو مخلوقات اور کائنات کو فنا کرنے کی قدرت حاصل ہے (باب ۳) ۔ وہ لوگوں کو ان اجنبی تعلیمات کے بارے میں خبردار کرتا ہے جو اس کی اپنی تعلیمات کی نقیض ہیں؛ علاوہ ازیں وہ تین ایسی چیزوں کے خلاف بھی تنبیہ کرتا ہے جن

کا نام نہیں دیا گیا؛ نیز اپنے متبعین کے لیے اپنی پرقوت حفاظت و نگہداشت کا وعدہ کرتا ہے، بشرطیکہ وہ متحد رہیں (باب ۴) - وہ ان سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اس کے مذہب اور اس کے خادموں کے احکام کی اطاعت کریں (باب ۵) .

مصحف راش زیادہ جامع اور یزیدی کردی زبان میں ہے - اصل کتاب طومار کی شکل میں ہے اور مخفی رسم الخط میں لکھی گئی ہے اور اس میں ۱۵۲ سطریں ہیں - یہ کتیب جلوہ کے مقابلے میں زیادہ دنیادارانہ، پیش پا افتادہ اور اس سے کم مربوط ہے، تضادات سے پر ہے اور یکایک ختم ہو جاتی ہے - روایت کے مطابق اس کتاب کو شیخ عدی کی وفات (تقریباً ۴۷۳ھ/۱۳۴۲ء) کے دو سو سال بعد عظیم المرتبت بزرگ حسن البصریؒ [رک بآں] نے تالیف کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں اصل کتاب سملی Semali کے قریب، جو دریاے دجلہ پر ہے، قصر عز الدین میں کہا یا [کذا، کہیا] علی کے گھر میں تھی؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کتیب جلوہ کی طرح یہ کتاب بھی سنجار میں ہے .

نظریۂ خلق عالم : مصحف راش میں تخلیق عالم کا ذکر تین متضاد نسخوں میں، ابواب میں تقسیم کیے بغیر، پراگندہ اور ملتبس طریقے سے کیا گیا ہے - اس کہانی کے مطابق، جو تخلیق عالم کے متعلق تسبۃً زیادہ اصلی معلوم ہوتی ہے، خدا نے خلق عالم کو تنہا مکمل کیا - اس نے ایک سفید موتی بنا کر اسے ایک پرندے اَنْقَر (بہت سے مخطوطات میں اَنْغَر) کی پشت پر رکھ دیا، جسے اس نے پیدا کیا تھا اور اسی پر چالیس ہزار سال تک تخت نشین رہا - اس کے بعد اس نے سات خدائی فرشتے پیدا کیے، جنھیں صوفی شیوخ کا مرادف قرار دیا جاتا ہے .

خدا نے یک شنبے کو عَزْرائیل (ازازیل، زَزائیل)، یعنی ملک طاؤس کو پیدا کیا، جو ہرشے سے برتر ہے؛ دو شنبے کو ملک دَرْدائیل شیخ حسن (البصری) کو۔ [ان کے نام کا] یزیدی تلفظ شیخو سن (Shekhüsin) ہے، جیسا کہ یزیدیوں کی سب سے بڑی دعا سے ثابت ہے (سیْجَدِن شیْخِیْسِن، یعنی سجّاد الدین شیخ حسن؛ ایک مزعومہ شیخ سِنّ کا چاند دیوتا سن سے مقابلہ کر کے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان کے لیے دیکھیے ماسینیوں Massignon : *Essai sur les origines du lexique technique* ، پیرس ۱۹۲۲ء، ص ۱۷۸-الف، لیکن یہ بالکل غلط ہیں) ؛ سہ شنبے کو خدا نے ملک اِسْرافائیل (اسرافیل)، یعنی شیخ شمس (الدّین) کو پیدا کیا؛ چہار شنبے کو ملک میکائیل، یعنی شیخ ابوبکر کو؛ پنج شنبے کو ملک جِبْرائیل، یعنی سجّادین (سجا دین، سجّادالدّین) کو؛ جمعے کو ملک شَمْنائیل (شَتْمائیل، سَمَنْسائیل)، یعنی ناصر الدّین کو اور شنبے کو ملک طُورائیل (نورائیل)، یعنی فخر الدّین کو .

اس کے بعد اس نے سات آسمانوں، زمین، سورج اور چاند کو پیدا کیا اور پھر آخرالذکر خدائی فرشتے فخر الدّین نے تخلیق کا باقی کام اپنے ذمّے لے کر انسانوں اور حیوانوں کو پیدا کیا .

اب خدا فرشتوں کو لے کر موتی میں سے باہر نکلا اور ایک زور دار چیخ سے اس نے اس کے چار ٹکڑے کر دیے - اس موتی میں سے پانی کے بہنے سے جو سمندر بنا اس پر خدا اپنے پیدا کیے ہوے ایک جہاز میں تیس ہزار سال تک چلتا رہا۔ جبرائیل نے، جو ایک پرندے کی شکل میں پیدا کیا گیا تھا، اس موتی کے ٹکڑوں سے سورج، چاند اور ستارے، پہاڑ، پودے، پھلدار درخت اور آسمان بنائے .

اس تصور کے ساتھ ساتھ سات خداؤں کا ایک قدرے مختلف تصور بھی ہے جو بذریعۂ صدور پیدا ہوے اور بعینہٖ اسی طرح نور الٰہی کا نور ہیں جس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے، اور ان میں سب سے بڑے معبود خدا کا ذکر محض اپنے امثال میں اولین کی حیثیت سے کیا گیا ہے .

وہ بیانات جو فرقۂ عزرائیل (ملک طاؤس) یعنی یزیدیوں کے متعلق دیے گئے ہیں جن کی طرف خدا نے شام سے لالیش کی جانب شیخ عدی کو مبعوث کیا، ناقص ہیں اور اس طرح وہ بیانات بھی جو بنی نوع انسان کے آبا و اجداد یعنی آدم اور حوّاء کے بیٹوں شہر بن سَفَر کی اولاد کے متعلق ہیں - جب تیس ہزار نئے تخلیق شدہ فرشتے چالیس ہزار سال تک اللہ کی عبادت کر چکے، تو اللہ نے جبرائیل کی عملی اعانت سے آدم کو عناصر اربعہ سے پیدا کیا اور اسے جنت میں جگہ دے کر حکم دیا کہ گندم کے سوا دنیا کے تمام پھل کھا سکتا ہے (ایک یزیدی روایت کے مطابق یہ ممانعت انگوروں کے بارے میں تھی) .

جب ایک سو سال کے بعد ملک طاؤس نے خدا کو یاد دلایا کہ آدم کی نسل میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا تو خدا نے اسے وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دی جسے وہ مناسب سمجھے - ملک طاؤس نے آدم کو ممنوعہ گندم کے کھانے پر اکسایا - اس پر ملک طاؤس نے آدم کو جس کے جسم میں اس وقت تک بول و براز کی کوئی راہ نہ تھی جنت سے نکال دیا - آدم کو بہت تکلیف محسوس ہوئی تاآنکہ خدا نے ایک پرندے کو بھیج کر اس کے جسم میں سوراخ کروا دیا - اس کے اور سو سال بعد خدا نے جبرائیل کو بھیج کر آدم کی بائیں بغل کے زیریں حصے سے حوّاء کو پیدا کیا .

مصحف راش میں خلق عالم کے متعلق ایک دوسری کہانی یوں دی ہے کہ خدا نے جو اپنے پیدا کردہ جہاز پر سمندر کے اوپر سیر کر رہا تھا، ایک موتی پیدا کیا، لیکن چالیس سال بعد اسے توڑ دیا - اس کی دردناک چیخ سے پہاڑ پیدا ہوے، شور سے پہاڑیاں، اور بخارات سے آسمان پیدا ہوے - اس کے بعد خدا نے اپنے نور سے بذریعۂ صدور چھے اور دیوتا پیدا کیے - پھر ان چھے دیوتاؤں نے اپنی اپنی باری پر کچھ نہ کچھ پیدا کیا : پہلے دیوتا نے آسمان خلق کیے، دوسرا سورج بن گیا، تیسرا چاند، چوتھے نے آفاق پیدا کیے، پانچویں نے ستارۂ صبح اور چھٹے نے کرۂ ہوا پیدا کیا .

اس سے آگے مصحف میں یزیدیوں کی بہت ہی ابتدائی تاریخ کے متعلق کچھ پراگندہ و مخلوط بیانات ہیں جن میں سے محض چند باتیں قابل توجہ ہیں : جب ملک طاؤس نے حواء کو آدم کی مصاحبت میں دے دیا تو وہ زمین پر اتر کر یزیدیوں کی طرف آیا جو محض آدم کی نسل میں سے تھے اور اس لیے باقی انسانوں اور ان کے درمیان کوئی مشترک بات نہ تھی - اس نے ان کے اور آشوریوں کے لیے جو قدیم ترین زمانے سے موجود تھے، مندرجۂ ذیل حکمران مقرر کیے : نَسْرُوح (نَسروخ، آشوری: Nisroch) = ناصر الدّین، جَمْبُوش (کاموش Kamos) = ملک فخر الدّین اور اِرتیمُش (ارتیموس Artemis) = ملک شمس الدّین - ان کے بعد شابور (شاپور) اوّل اور ثانی نے ایک سو پچاس سال حکومت کی - ان کی تمام نامور شخصیتیں بالخصوص یزیدی شہزادوں کا خاندان اسی کی نسل سے ہوا - یزیدیوں کے چار حکمران ہوے ہیں جن کے نام بالصراحۃ نہیں دیے گئے - ان کے ایک بادشاہ آحاب نے حکم دیا کہ انھیں ان کے اپنے نام دیے جائیں (جس کی تصریح نہیں کی گئی) - اِلٰہ آحاب

(یعنی بَعْل زبوب) کو اب پیر بوب کہتے ہیں - دیگر یزیدی حکمرانوں میں یہ لوگ تھے: بخت نصّر (Nebucchadnezzar) بابل میں، اَخَشْ ویروش (Akhashperosh) ایران میں، اور اغْرِن قالوس (Aghrikalus) قسطنطنیہ میں .

اس کے علاوہ مصحف میں بعض نواہی بھی مذکور ہیں - حرام اشیاے خوردنی میں کاھو یا سلاد (یزیدی زبان میں کاھو، عربی = خَسْ) شامل ہے - اس کے کھانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ اس کا نام نَبِیّہ خاسیہ سے مشابہ تھا، اس کے علاوہ لوبیا، مچھلی (ماسی = ماھی، پغمبر یونان = [حضرت] یونس[۳] کی وجہ سے)، ہرن (آسِک) بھی ممنوع ہیں - شیخ اور اس کے مریدوں کے لیے مرغیوں (کلاشیر Käläshir) کا گوشت اور کدو (Külükä) کا کھانا حرام تھا .

صابیوں کی طرح یزیدیوں کے ہاں بھی گہرا نیلا رنگ ممنوع تھا - مندرجۂ ذیل باتیں بھی واضح طور پر ممنوع ہیں : کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، بیٹھ کر کپڑے پہننا، بیت الخلا کا استعمال اور غسل خانے میں نہانا (غسل خانے اور بیت الخلا کو ارواح خبیثہ کا مسکن خیال کیا جاتا ہے) - مندرجۂ ذیل الفاظ کا بولنا بھی منع ہے : شیطان ("ان کے خدا کا نام") قیطان (پھندا)، شَطّ (ندی)، شرّ (بدی)، ملعون، لعنۃ اور نَعْل .

اگرچہ اس کا مصحف میں کہیں ذکر نہیں لیکن روایتی طور پر وہ لفظ جو شین سے شروع ہوتے ہیں ان کا بولنا بھی منع ہے، نیز سرطان (کیکڑا)، حِیْطان (باڑھیں)، بستان (سبزیوں کا باغ) بَطّ، نَطّ (کودنا) وغیرہ، پڑھنا اور لکھنا، ڈاڑھی مونڈنا اور مونچھوں کا صفایا کر دینا بھی منع ہے اس طرح دوسروں کی کنگھی اور استرا استعمال کرنا، مقدس جنگلوں سے لکڑی لینا، اولادالزّنا کا کا پرورش کرنا اور قلقل کرنے والے برتنوں سے پانی پینا منع ہے .

مآخذ : دیکھیے مآخذ متعلقہ مادّۂ یزیدی و (۱) اسمٰعیل بیگ چول : الیزیدیّہ قدیماً و حدیثاً . . . (قدیم اور موجودہ یزیدی) طبع Dr. Konstantin Zuraik، بیروت کی امریکی یونیورسٹی، سلسلۂ شرق، عدد ۶، بیروت ۱۹۳۴ء اس پر دیکھیے (۲) R. Strothmann در *Isl.*، ج ۲۲، ۱۹۳۵ء ص ۳۲۳ تا ۳۲۴ .

(TH. MENZEL)

کِتاب خانہ : کتاب خانہ، بمعنی لائبریری ایک * فارسی لفظ ہے جس کا عربی مترادف لفظ مکتبہ بھی استعمال ہوتا ہے - اس کا اطلاق ان عام کتاب خانوں پر ہوتا ہے جو متعلمین کے فائدے کے لیے سلاطین نے یا عام افراد نے قائم کرکے وقف کیے - بعض اوقات یہ کتاب خانے کسی خاص فرقے یا کسی خاص علم کے مطالعے کے لیے مخصوص ہوتے تھے - عہد فتوحات کے بعد جب لوگوں میں علم و ادب کا ذوق و شوق پیدا ہوا اور کتابوں کی تصنیف و تالیف میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا تو ادبی ذوق رکھنے والے اصحاب نے کتابیں جمع کر کے بڑے اچھے اچھے ذاتی کتاب خانے قائم کر لیے اور کوئی ماہر لسانیات ابو عَمْرو الشّیبانی کی مثال سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مصنفین کا یہ دستور تھا کہ وہ حوالے کے لیے اپنی تصنیفات کی نقول اپنے شہر یا محلّے کی مسجد میں رکھوا دیتے تھے - جہاں تک عام کتب خانوں کا تعلق ہے، اس قسم کے قدیم ترین کتاب خانے کا ذکر ہمیں خالد بن یزید بن معاویہ رض کے حال میں ملتا ہے، جس نے اپنی زندگی یونانی علوم، بالخصوص کیمیا اور طبّ کی تحصیل کے لیے وقف کر دی تھی - ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس نے اس قسم کی کتابیں ترجمہ کرائیں اور جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کے

آغاز عہد میں ایک وبا پھیلی تو حکم دیا کہ تمام کتابیں کتاب خانے (خزانہ) سے باہر نکال لی جائیں، تاکہ عام لوگوں کی ان تک رسائی ہو سکے - بہر حال بڑے پیمانے پر سب سے پہلا عام کتاب خانہ دارالحکمۃ تھا جسے عباسی خلیفہ المأمون نے بغداد میں قائم کیا - اس کتاب خانے کو حتی الامکان جامع بنانے کے لیے اس نے کئی قیمتی یونانی مخطوطات بوزنطی سلطنت میں سے خریدے اور عربی میں ان کے ترجمے ایسے علما سے کرائے جو اس کام کی صلاحیت رکھتے تھے - اس کتاب خانے میں ان تمام علوم کی کتابیں جمع کر دی گئی تھیں جنھیں عربوں نے فروغ دیا تھا - یہ کتاب خانہ بدستور ترقی کرتا رہا تا آنکہ ۶۵۶ھ میں مغلوں نے بغداد کو فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی - مصر کے فاطمی خلفا نے قاہرہ میں جو کتاب خانہ قائم کیا تھا وہ بھی ایسا ہی اہم تھا - اس میں بے اندازہ علمی خزینے جمع تھے اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ - ۱۰۴۴ء میں وزیر ابوالقاسم علی بن احمد الجَرْجَرائی نے یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور ان کی نئے سرے سے جلدیں باندھی جائیں - اس کام کی نگرانی کے لیے اس نے ابو خَلَف القضاعی اور ابن خَلَف الورّاق کو مقرر کیا - یہ کتاب خانہ آخری فاطمی خلیفہ العاضد کی وفات تک بجنسہٖ محفوظ رہا، اس کی بیشتر کتابیں قاضی الفاضل [رک بآں] نے خرید لیں اور اپنے قائم کردہ فاضلیۃ مدرسے کے کتاب خانے میں جمع کرا دیں، لیکن تھوڑی ہی مدّت بعد یہ بے پروائی کا شکار ہو گئیں، چنانچہ القلقشندی کے زمانے تک ان میں سے بیشتر کتابیں غائب ہو چکی تھیں - کہا جاتا ہے کہ اس کتاب خانے میں ۶۵۰۰ کتابیں صرف علوم عقلیہ، مثلاً ریاضی، علم ہیئت وغیرہ پر ہی تھیں - اس کے خزائن میں تانبے کا ایک کرہ تھا جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسے بطلیموس [رک بآں] نے تیار کیا تھا اور اس پر ایک تحریر کندہ تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اسے خالد بن یزید بن مُعاویہؓ نے حاصل کیا تھا - تیسرا بڑا کتاب خانہ قرطبہ کے اموی خلفا کا تھا - اس کی کتابیں بھی پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں المرابطون کی فتح اندلس کے بعد منتشر ہو گئیں - چھوٹے کتاب خانوں میں سے ایک تو سلطان مسعود غزنوی نے قائم کیا تھا جس کے بیشتر خزائن آگے چل کر بخارا میں منتقل ہو گئے - ہمیں اکثر ایسے قیمتی نجی کتاب خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو علما کو استعمال کے لیے دے دیے جاتے تھے - مثلاً الصُولی [رک بآں] کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایک بڑا ذخیرۂ کتب موجود تھا اور ان کتابوں کی سرخ اور زرد رنگ کے چمڑے کی بڑی خوشنما جلدیں بندھی ہوئی تھیں - الصَّفَدی [رک بآں] نے غَرْس النِعمۃ الصّابی، [= محمد بن ہلال (م ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء)، بغداد کا مؤرخ اور ادیب، عیون التواریخ اور الھفوات کا مصنف] کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اس نے بغداد میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں طلبہ کے استعمال کے لیے [چار ہزار] کتابیں رکھی گئی تھیں لیکن اس سے بھی پہلے ہم ابو تمّام کے کے متعلق پڑھتے ہیں کہ اسے موسم سرما کے باعث ہمدان میں رکنا پڑا، جہاں اس نے اپنے مشہور و معروف مجموعۂ اشعار الحَماسۃ، کا مواد ان کتابوں سے منتخب کیا جو اسے وہاں کے کتاب خانوں میں ملی تھیں - جب سلطان ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے تعلیم عامّہ کے لیے نیشا پور، بغداد اور دیگر مقامات میں مدارس کھولے تو کتاب خانوں کے قیام کو بہت زیادہ تحریک ملی - صرف ان مدارس کے اساتذہ کی تنخواہ ہی کے لیے نہیں بلکہ

یہاں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی ان کی کتابوں کے بیش قیمت مخطوطات کے لیے بھی رقوم وقف کی جاتی تھیں ۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں جب مغول سارے ایران پر چھا گئے تو جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے نہ صرف انسانی جانوں کا نقصان ہوا اور قیمتی جائدادوں پر تباہی آئی، بلکہ ان گنت اور انمول کتابیں بھی بے دردی سے برباد کر دی گئیں ۔ مصر اور شام کے ایوبی امرا نے قیام مدارس کے سلسلے میں جلیل القدر سلجوقی وزیر کی مثال پر عمل کیا، لیکن القَلْقَشَنْدی کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ان کے اور ان مدارس کے منتظمین کے ذہن میں بڑے بڑے عام کتاب خانوں کی قدر و قیمت کا کوئی صحیح تصوّر موجود نہیں تھا (صبح الاَعْشٰی، ۱ : ۴۶۷) ۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک ہمیں ایسے علما و فضلا کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے مساجد اور مدارس کو اپنی کتابوں کے عطیات دیے ۔ یہ عطیات بطور وَقْف یعنی نا قابل انتقال جائداد دیے جاتے تھے، لیکن ان کے نگران اپنی نا قابل اعتبار حد تک پہنچی ہوئی بد دیانتی کے باعث اکثر اوقات نہ صرف ان قیمتی کتابوں کے ضائع ہونے کی روک تھام نہیں کرتے تھے، بلکہ اس سے چشم پوشی کر جاتے تھے ۔ ایسے کتنے ہی مخطوطات ہیں، جنھیں ان کتاب خانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رکھا گیا تھا، لیکن وہ مختلف لوگوں کے ذاتی قبضے میں آ گئے یا یورپ کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں جا پہنچے ۔ علاوہ ازیں بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی کتاب خانہ معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی بے پروائی کا شکار ہو جاتا تھا اور یہاں کی کتابیں طلبہ کے علم میں اضافہ کرنے کے بجائے حشرات الارض کی خوراک بننے لگتی تھیں ۔ چونکہ کتاب خانوں کے محافظین کی قرار واقعی نگرانی نہیں کی جاتی تھی، اس لیے جو کتابیں ان کی تحویل میں دی جاتیں وہ بسا اوقات اس حال کو پہنچ جاتیں کہ پڑھنے کے لیے اٹھایا اور اوراق ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کی ایک واضح اور بین مثال وہ کتابیں ہیں جو کسی زمانے میں دہلی کے شاہی کتاب خانے کی زینت تھیں اور آج کل لنڈن کے انڈیا آفس میں موجود ہیں ۔ خواہ یہ کتابیں کیسی ہی قابل قدر تصنیفات ہی کیوں نہ ہوں دیمک اور عرصۂ دراز کی بے پروائی نے ان کی یہ حالت کر دی ہے کہ مہتمم کتب خانہ طلبہ کو کتابیں مہیا کرنے سے مایوس ہو کر رہ جاتا ہے، موجودہ زمانے میں صورت حال بہتر ہو گئی ہے ۔ کتاب خانۂ خدیویہ (اب سرکاری) نے ایک بار پھر ان علمی خزائن کو جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے جو صدیوں کی بے پروائی سے بچ رہے ہیں ۔ جو طلبہ قاہرہ جانے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ ان خزینوں سے مستفید ہو سکتے ہیں ۔ قسطنطنیہ کے متعدد کتاب خانوں میں قیمتی کتابوں کی صورت میں بڑے بے بہا خزانے محفوظ ہیں، جن کی فہرستیں چھپ چکی ہیں، اگرچہ ان میں بہت سی کتابوں کے بارے میں غلط معلومات درج ہو گئی ہیں ۔ مدینۂ منورہ اور عراق میں بھی متعدد بیش قیمت کتاب خانے ہیں ۔ ان ممالک میں جن لوگوں کے مسلمان دوست موجود ہیں، وہ بعض اوقات وہاں کے نادر مخطوطات کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے ہیں ۔ دمشق کے کتاب خانۂ ظاہریہ اور فاس اور تونس کی جامع مساجد کے کتاب خانوں کی نا مکمل فہرستیں بھی ملتی ہیں، لیکن تاحال یورپی طلبہ کے لیے ان کتاب خانوں کے خزانوں سے استفادہ کرنا بہت مشکل ہے ۔ برصغیر پاکستان و ہندوستان میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے ۔ اس کی تصدیق اس احتیاط سے ہوتی ہے جو حیدر آباد کے کتاب خانۂ آصفیہ، بانکی پور کے

کتاب خانۂ خدا بخش، رام پور کی رضا لائبریری اور بمبئی کے کتاب خانۂ ملا فیروز میں برتی جاتی ہے ۔ اب صنعاء (یمن) کے کتاب خانوں تک بھی شائقین کی دسترس ہونے لگی ہے ۔ کربلا اور نجف میں شیعیوں کی زیارت گاہوں میں بھی قیمتی کتاب خانے ہیں، لیکن اس امید کے پورا ہونے میں شاید ابھی بہت عرصہ باقی ہے کہ انھیں اور عراق کے دوسرے مراکز کے مخطوطات کو یکجا کر کے ایک مرکزی سرکاری کتاب خانے میں رکھوا دیا جائے ۔ یہ واقعہ کہ بلاد مشرق سے قیمتی اور قدیم مخطوطات برابر یورپ میں چلے آ رہے ہیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ صدیوں کی بے پروائی کے باوجود قدیم زمانے کے نسخے ابھی تک اس سے بہت زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں جتنی کہ توقع کی جا سکتی تھی، لیکن پرانے زمانے میں کتابت کے لیے جو بہترین قسم کا کاغذ اور سیاہی استعمال ہوتی تھی، اس کی وجہ سے کئی ایسی کتابیں محفوظ ہو گئیں جو بصورت دیگر مٹ جاتیں ۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ بڑے بڑے کتاب خانوں کے ختم ہونے پر یہ کتابیں لوگوں کی ذاتی ملکیت بن گئیں اور اب وہاں سے نکل کر دوبارہ منظر عام پر آ رہی ہیں ۔ اس کی شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ مشرقی ممالک میں قدیم مخطوطات کے کئی قیمتی نجی کتاب خانے موجود ہیں، مثلاً بغداد میں سیّد صدر الدّین کا اور قاہرہ میں احمد تیمور پاشا کا کتاب خانہ ۔ ان کے علاوہ بھی ہمیں بعض کتاب خانوں کا حال معلوم ہے ۔ بدقسمتی سے بیشتر کتاب خانوں کے مالک اپنی مقبوضہ کتابوں کے متعلق معلومات مہیا کرنے میں بہت بخل سے کام لیتے ہیں، البتہ اس سلسلے میں مذکورۂ بالا دونوں کتاب خانے مستثنیٰ ہیں ۔ جوں جوں لوگوں میں یہ احساس بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ قدیم ادب کی یادگاروں تک، خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی میں، عوام کی رسائی ہونی چاہیے، ان کے مالک بعض نسبۃً نادر تصنیفات کو طبع کر کے منظرِ عام پر لانے لگے ہیں ۔ جب ان کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ ہو جائے گا تو ہمیں امید ہے کہ جو مواد اس وقت مشرقی ممالک کے کتاب خانوں میں چھپا پڑا ہے، اس کا بیشتر حصّہ آئندہ پچاس برس کے اندر اندر طلبہ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا ۔

(F. KRENKOW)

کتاب خانوں کی ترتیب، انتظام اور استعمال : چوتھی/دسویں صدی میں بھی ایسی عمارتیں موجود تھیں جو محض کتاب خانوں کے لیے مخصوص تھیں اور خاص طور سے اسی مقصد کے لیے تعمیر کی گئی تھیں؛ مثلاً ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں بہاء الدّولۃ کے وزیر سابور بن اَرْدشیر نے بغداد کے محلۂ کَرْخ میں ایک دارالکتب بنوایا جس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں (ابن الأثیر : الکامل، ۹ : ۲۴۶؛ یاقوت : المعجم، ۱ : ۷۹۹) ۔ مشہور جغرافیہ نویس المقدسی (ص ۴۴۹) نے شیراز میں ایک عظیم الشان کتاب خانہ دیکھا تھا، جسے عضدالدّولہ بویہی (۳۳۸/۹۴۹ تا ۳۷۲ھ/۹۸۲ء) نے قائم کیا تھا ۔ اس کتاب خانے کی ایک علٰحدہ عمارت تھی جس میں ایک وسیع و عریض دالان تھا اور یہ ایک طویل مضبوط محرابی چھت کی عمارت تھی جس کے تین طرف حجروں (خزائن) کی قطار چلی گئی تھی ۔ محرابی چھت والے مرکزی کمرے اور بغلی کمروں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ تین ہاتھ (ell = ۴۵") اونچی اور تین ہاتھ چوڑی چوبی الماریاں نصب تھیں ۔ ان الماریوں پر منبّت کاری کی گئی تھی اور ان کے کواڑ اوپر سے نیچے کھلتے تھے ۔ کتابیں ان کے خانوں میں اوپر تلے رکھی جاتی تھیں ۔ قاہرہ کے فاطمی

کتاب خانے میں جو الماریاں استعمال کی جاتی تھیں وہ ان سے کچھ مختلف تھیں (المقریزی : الخطط، قاهره ۱۲۷۰ھ، ۱ : ۴۰۹) - کتابوں کی الماریوں (رفوف) میں تختوں کے ذریعے علٰحدہ علٰحدہ خانے (حاجز) بنائے گئے تھے - ہر خانے کے جدا جدا کواڑ تھے اور ان کواڑوں میں قلابے اور تالے لگے ہوے تھے - کھلی الماریوں میں بھی چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے تھے- اس قسم کی الماریوں کو ایک چھوٹی سی تصویر میں دکھایا گیا ہے جسے یحییٰ بن محمود نے ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں بنایا تھا اور جو الحریری کے ایک قلمی نسخے موجودۂ پیرس (عربی مخطوطات عدد ۵۸۴۷) میں ہے - اس تصویر میں بصرے کا ایک کتاب خانہ دکھایا گیا ہے (Blochet : *Les enlumineurs des Mss. orientaux*، پیرس ۱۹۲۶ء، لوحہ ۱۰) - ہمارے دستور کے خلاف چھوٹے چھوٹے خانوں میں اوپر تلے دھری ہیں اور بلادِ مشرق میں یہ رواج ابھی تک چلا آتا ہے- اس سے اس بات کی بھی توضیح ہو جاتی ہے کہ تصنیفات کے بالائی یا زیریں کنارے پر ان کا مختصر نام کیوں لکھا جاتا ہے (یہ بات کبھی کبھی مغربی ممالک میں بھی دیکھنے میں آتی ہے) .

کتابیں بڑی باقاعدگی سے ترتیب دی جاتی تھیں اور علوم کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے انھیں تقسیم کیا جاتا تھا - قرآن مجید کے نسخوں کے لیے عام طور پر ایک خاص جگہ مقرر ہوتی تھی، مثلاً فاطمی کتاب خانے میں انھیں دوسری کتابوں کی نسبت بلند تر مقام پر رکھا جاتا تھا - بہت سی کتابوں کے اکثر اوقات کئی کئی نسخے ہوتے تھے - اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ایک ہی کتاب کا مطالعہ بیک وقت متعدد اشخاص کر سکتے تھے بلکہ قاری کسی غلط عبارت کو دوسرے نسخے کی مدد سے فوراً پڑھ سکتا تھا - مثال کے طور پر قاہرہ کے کتاب خانۂ فاطمیہ میں خلیل کی کتاب العَین کے تیس نسخے، تاریخ الطبری کے بیس نسخے اور اگر غلط نہیں تو ابن دُرَید کی الجَمہرۃ کے ایک سو نسخے موجود تھے.

فہرستیں یا تو کئی کئی جلدوں میں ہوتی تھیں، جن میں (غالباً مختلف اصناف علم کے اعتبار سے) کتابوں کے نام ترتیب وار درج ہوتے تھے اور یا کتاب خانۂ فاطمیہ کی طرح ہر کمرے کے دروازے کے اندر کی طرف وہاں کی کتابوں کی فہرست چپکا دی جاتی تھی .

عموماً کتاب خانوں کا ایک مہتمم (صاحب) اور کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک یا ایک سے زیادہ لائبریرین (خازن)، نیز کاتب (ناسخ) اور چپراسی (فرّاش) ہوتے تھے - ہمیں پتا چلتا ہے کہ بعض مشہور و معروف علما خازن تھے: چنانچہ مؤرخ ابن مسکویہ، رَے میں وزیر ابوالفَضل بن العَمید، کا خازن تھا (ابن مسکویہ : تَجارب الاُمَم، طبع Amedroz و Morgoliouth، اوکسفرڈ ۱۹۲۱ء، متن ۲ : ۲۲۴، ترجمہ ۵ : ۲۳۷) اور الشابُشتی م ۳۹۰ھ/۹۹۹ء) جس نے عیسائی خانقاہوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی، العزیز کے عہد میں قاہرہ کے کتاب خانۂ فاطمیہ کا خازن تھا (ابن خَلِکّان : وَفَیات، ۱ : ۳۳۸) .

کتابیں کچھ تو خرید لی جاتی تھیں اور کچھ کاتب جو کتاب خانوں میں ملازم ہوتے تھے، قلمی نسخوں سے نقل کر لیتے تھے - المقریزی نے ایک کتاب خانے کا میزانیہ قلمبند کیا ہے (۱ : ۴۵۹) - اس کی رو سے خلیفہ الحاکم [بامر اللہ] ۳۸۶ تا ۴۱۱ھ/۹۹۶ تا ۱۰۲۰ء) ہر سال اپنے قائم کردہ دارالعلم پر ۲۵۷ دینار (تقریباً ۱۵۰ پونڈ) خرچ کیا کرتا تھا - یہ رقم حسب ذیل طریق سے خرچ ہوتی تھی .

عبّادان سے آئی ہوئی چٹائیاں وغیرہ	= ۱۰ دینار
کاتبوں کے لیے کاغذ	= ۹۰ دینار
خازن کی تنخواہ	= ۴۸ دینار
پینے کا پانی	= ۱۰ دینار
فراشوں کی اجرت	= ۱۵ دینار
کاغذ، دوات، قلم رکھنے والے کی اُجرت	= ۱۲ دینار
دروازوں کے پردوں کی مرمت	= ۱ دینار
کتابوں کی مرمت	= ۱۲ دینار
موسم سرما کے لیے نمدے کے فرش	= ۵ دینار
موسم سرما کے لیے کمبل	= ۴ دینار

کتاب خانے ہر شخص کے لیے کھلے رہتے تھے اور کسی سے کوئی چندہ وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا ۔ کاغذ، دوات، اور قلم منتظمین کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے۔ بعض نجی کتاب خانوں میں تو دور دراز سے آئے ہوئے متعلمین کو گزارے کے لیے مالی مدد بھی دی جاتی تھی ۔ کتاب خانے کی عمارت سے باہر کتابیں لے جانے کی صورت میں کچھ رقم جمع کرانی پڑتی تھی۔ یاقوت (م ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) مَرو کے کتاب خانوں سے متعلق فراخ دلی کی بڑی تعریف کرتا ہے (معجم، ۴ : ۵۰۹ ببعد)، جہاں سے وہ بغیر رقم جمع کرائے دو سو دینار کی مالیت کی دو سو بلکہ اس سے بھی زیادہ کتابیں لے کر ہمیشہ اپنے گھر میں رکھا کرتا تھا ۔ اس سلسلے میں ۲۱ صفر ۷۹۹ھ/۲۴ نومبر ۱۳۹۶ء کا لکھا ہوا وہ وقف نامہ بھی پر از معلومات ہے جس کی رو سے ابن خلدون نے اپنی کتاب العبر، فاس کی جامع القرویین کے کتاب خانے کو عطا کی تھی ۔ اس کے مطابق یہ مخطوطہ ایک اچھی خاصی رقم جمع کرانے کے بعد صرف کسی قابل اعتبار شخص کو زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے لیے دیا جا سکتا تھا ، کیونکہ یہ عرصہ مستعار لی ہوئی کتاب کو نقل کرنے یا پڑھنے کے لیے کافی ہوتا تھا ۔ مہتمم کتاب خانہ کو ہدایت تھی کہ وہ اس قاعدے پر عمل درآمد کرائے (Levi-Provençal در *JA*، ج، ۲۰۳ (۱۹۲۳ء) ص ۱۶۴) .

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ملکوں میں ایسے کتاب خانے بھی تھے جہاں لوگ صرف مطالعہ کر سکتے تھے ۔ مَدْرَسَۃُ المَحْمُودیّہ کا کتاب خانہ جو ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں قاہرہ میں کھولا گیا تھا، اسی ذیل میں آتا ہے ۔ اس کے بانی اُستادار جمال الدّین محمود بن علی (م ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء) کی وصیّت کی رو سے کوئی کتاب مدرسے کے کمروں سے باہر نہیں نکالی جا سکتی تھی ۔ ابن مسکویہ کی تجارب الاُمَم کا قلمی نسخہ جس کا کائتانی Caetani نے ایک عکسی نسخہ شائع کیا ہے (سلسلۂ یادگار گب، ۷/۶) اسی کتاب خانے کی ملکیت تھا ۔ اس مخطوطے کے پہلے صفحے پر ۱۵ شعبان ۷۹۷ھ/۵ جون ۱۳۹۵ء کی تحریر کردہ دستاویز وقف درج ہے ۔ اس میں لکھا ہے کہ ”مذکورۂ بالا معطی کی طرف سے یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ پوری کتاب یا اس کی کوئی جلد کتب خانے سے مستعار نہیں دی جا سکتی، خواہ اس کے لیے کوئی رقم جمع کرا دی جائے“ ۔ بایں ہمہ جب ۸۲۶ھ/۱۴۲۳ء میں کتابوں کی جانچ پڑتال کی گئی، تو پتا چلا کہ کُل تعداد کا دسواں حصہ یعنی چار سو کتابیں غائب ہیں ۔ اس پر مسجد کے منتظم وقت کو برخاست کر دیا گیا (دیکھیے ۔ ابن حَجَر العَسْقَلانی در Quatremere : کتاب مذکور ص ۶۴، ۷۰؛ المقریزی : الخطَط، ۲ : ۳۹۵) .

اگر ہم مندرجۂ بالا بیانات کو پیش نظر رکھیں جو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کی بھی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں تو ہم بڑے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی کتاب خانے ہر لحاظ سے یورپ کے کتاب خانوں سے

صدیوں آگے تھے اور مغرب سے بہت عرصہ پہلے اسلامی ملکوں نے عوامی کتاب خانوں کی عام ضرورت کو محسوس کر لیا تھا ۔

مآخذ : (۱) Quatremère : *Mémoire sur le gout des livres chez les Orientaux* در *J A*، ۱۸۳۸ء، سلسلہ ۳، ۶ : ۳۵ تا ۷۸؛ اور (۲) اضافی حاشیے از Hammer Purgstall در *JA*، ۱۸۴۸ء، سلسلہ ۴، ۱۱ : ۱۸۷ تا ۱۹۸؛ (۳) von Kremer : *Renaissance des Islâms*، ہائیڈل برگ ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۴ ببعد؛ (۴) Ribera : *Bibliofilos y bibliotécas en la España musulmana*، سَرَقُسطہ ۱۸۹۶ء (میں اس کا مطالعہ نہیں کر سکا)؛ (۵) Grohmann : *Bibliotheken und Bibliophilen im islamischen Orient*، در *Festschrift der Nationalbibliothek in Wien*، وی‌انا ۱۹۲۶ء، ص ۳۳۱ تا ۳۴۲؛ (۶) M. Hartmann : *Das Bibliothekswesen in den islamischen Ländern* در *Centralblatt f. Bibliothekswesen*، ۱۸۹۹ء، ۱۶ : ۱۸۶ ببعد؛ (۷) وہی مصنف : *Zur litterarischen Bewegung und zum Buch-u-Bibliothekswesen in den islamischen Ländern*، در فہرست عدد ۴ از Halle, Buchhandlung Rudolf Haupt ۱۹۰۵ء؛ مغربی ممالک کے کتاب خانوں سے مقابلے کے لیے دیکھیے (۸) Milkau : *Die Bibliotheken der Gegenwart*، ۱/۱ : بار دوم، ۱۹۱۲ء، ص ۵۸۷ ببعد.

(HEFFENING)

⊗ **کتاب الفہرست** : رک بہ الندیم .

⊗ **کتابیات**: اس مقالے میں یہ لفظ کتابوں کی اس باقاعدہ مدون فہرست کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ان لوگوں کے فائدے کے لیے مرتب کی گئی ہو جو کسی خاص موضوع پر لکھے ہوئے مواد کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں .

ممالک اسلامیہ میں طباعت کے رواج سے پہلے اسلامی کتابیات میں جو سب سے نمایاں کارنامہ انجام دیا گیا، وہ کتاب الفہرست کی تدوین ہے ۔ اس کا مصنف ابن النّدیم [رک بہ الندیم] بغداد کا ایک کتب فروش (وراق) تھا ۔ اُس نے یہ کتاب ۳۷۷ھ/۹۸۷-۹۸۸ء میں علم ادب کی کتابیاتی تاریخ کے طور پر دس ابواب میں تالیف کی ۔ ان میں سے پہلے چھے "اسلامی تصنیفات" (قرآن مجید، صرف و نحو، تاریخ، شعر، کلام، اور قانون) سے تعلق رکھتے ہیں ۔ باقی چار فلسفے، سائنس، قصص و حکایات ملَل و نحل اور الکیمیا سے متعلق ہیں ۔ ہر باب میں موضوع زیر بحث کے مطالعے کے آغاز اور نشو و نما کے بیان، اس پر جو کتابیں قابل حصول ہیں ان سب کی فہرست اور ان کتابوں کے مصنفوں کی کتابیاتی تفصیلات قدیم ترین زمانے سے دی گئی ہیں .

اسلامی کتابیات میں سے ایک اور اہم تالیف کشف الظنون عن اسماء الکتب الفنون ہے، جس کے لیے مواد جمع کرنے میں عثمانی عالم متبحّر حاجی خلیفہ نے بیس سال کے قریب صرف کیے۔ اس کی پہلی جلد ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء-۱۶۵۴ء میں الفہرست سے کوئی ۶۵۰ سال بعد مکمل ہوئی ۔ ایک مقدمے کے بعد جس میں مختلف علوم کی ماہیت، قدر و قیمت، اقسام اور تاریخ بالتفصیل درج ہے، مصنف نے ان سب کتابوں کے ناموں کی ردیف وار فہرست دی ہے جو عربی فارسی اور ترکی میں ان علوم پر لکھی گئیں اور جنھیں مصنف نے خود دیکھا یا جن کا نام اسے معلوم ہوا ۔ ہر تصنیف سے متعلق وہ اس کے مصنف، سال تصنیف، اس کے حصص و ابواب کی تقسیم کا اصول اور اس کی مختلف شرحوں، فرہنگوں اور تردیدات و تنقیدات کی تفصیلات بیان کرتا ہے ۔ اس نے ان تمام کتابوں کا جو اس نے دیکھیں، پہلا جملہ لکھ دیا ہے تاکہ

نامعلوم کتابوں کے پہنچاننے میں آسانی ہو - بعد کے لوگوں نے اس کتاب کے متعدد ضمیمے مرتب کیے - ان میں سے آخری ضمیمہ [ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون کے نام سے] اسمٰعیل پاشا البغدادی (م ۱۹۲۰ء) کا ہے، جس میں ۱۸۰۰۰ کے قریب عنوانات دیے گئے ہیں - [یہ کتاب دو جلدوں میں استانبول سے (۱۹۴۵ - ۱۹۴۷ء) سے شائع ہو چکی ہے] .

باقی ماندہ کتابیاتی تصانیف کے متعلق، جو اس وقت تک موجود ہیں، کچھ زیادہ کہنا ضروری نہیں - ابن خیر الاشبیلی (۵۰۲ تا ۵۷۲ھ) نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اندلس میں مشائی طالب علم کی حیثیت سے گزارا تھا - اس نے ایک فہرست (طبع Codera و Ribera، در *BAH*، ج ۹ و ۱۰، سرقسطہ ۱۸۹۴ء) مرتب کی تھی، جس میں اس نے عربی کی کوئی ۱۴۰۰ ایسی کتابوں کے نام درج کیے ہیں جو ہسپانیہ اور مشرق میں لکھی گئیں اور جن کو اس نے خود پڑھا یا ان کا نام سنا؛ اس میں ہر کتاب کے راویوں کا سلسلہ اس کے اصل مصنف تک پہنچایا گیا ہے - انفرادی مصنفین کی تصنیفات کی فہرستیں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً الرازی کی تصنیفات کی فہرست (مؤلفۂ البیرونی، طبع کراؤز P. Kraus، پیرس ۱۹۳۶ء)، جالینوس کے تراجم کی فہرست (تالیف حسین بن اسحٰق، طبع Bergstrasser، لائپزگ ۱۹۲۵ء و ۱۹۳۳ء) اور سیوطی کی خود نوشت کتابیات (براکلمان، ۲: ۱۵۴ و تکملہ، ۲: ۱۷۹)؛ [نیز امام غزالی کی تصانیف کی فہرست، مؤلفہ محمد رضا]۔ شیعیوں نے اپنے فرقے کے مصنفین کی کتابیات کی ترتیب میں بہت انہماک سے کام لیا ہے - سب سے پہلی فہرست محمد بن الحسن الطّوسی (م ۴۶۰ھ) نے لکھی اور شپرینگر Sprenger، عبدالحق اور غلام قادر نے *Bibliotheca Indica* کے لیے اس کی تدوین کی - اس اشاعت کے دیباچے میں کتابیات کی اسی قسم کی تین اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے - اس سے قریب تر زمانے میں اعجاز حسین (۱۲۴۰ تا ۱۲۸۶ھ) کی کتاب کشف الحجب و الاستار عن اسماء الکتب و الاسفار میں ۳۴۱۴ شیعی کتابوں کی کیفیت ردیف وار درج ہے - آغا بزرگ الطّہرانی کی کتاب الذّریعہ الی تصانیف الشّیعہ بھی قابل ذکر ہے .

علوم اسلام کے مغربی فضلا اور طلبہ کی تصنیفات کی فہرست پہلے پہل Schnurrer نے مرتب کی - اس کی *Bibliotheca Arabica* کی طبع دوم ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی - اس میں موضوعات کی ترتیب کے مطابق کتب مطبوعہ کی فہرست قدیم زمانے سے ۱۸۱۰ء تک دی گئی ہے اور تاریخ وار اشاریہ بھی اس کے ساتھ ہے - Zenker کی *Bibliotheca Orientalis* (لائپزگ ۱۸۴۰ء، ۱۸۴۶ء، بار دیگر ۱۸۶۱ء)، جس کا مقصد طباعت کی ایجاد سے لے کر اس وقت تک کی عام عربی، فارسی اور ترکی مطبوعات کے نام جمع کرنا تھا، توقع کے مطابق ثابت نہیں ہوئی - شوفن Chauvin نے Schnurrer کا کام زیادہ مہارت سے جاری رکھا اور اس نے Bibliotheca Arabica کے ساتھ ضمناً مصنفین کا اشاریہ بھی لگا دیا - اس کی کتاب *Bibliographie des ouvrages arabes on relatifs aux Arabes publies dans l' Europe chretienne de 1810 a 1885* کی کل بارہ جلدیں ۱۸۹۲ء سے ۱۹۲۲ء تک طبع ہوئیں اور اس تصنیف کے باقی ماندہ حصے کے لیے مواد مخطوطات کی صورت میں Liege یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے - شوفن Chauvin کا ارادہ یہ تھا کہ Schnurrer اور *Orientaltsche Bibliography* کے مابین جو خلا رہ گیا ہے اسے پُر

کیا جائے ۔ آخرالذکر کی طباعت ۱۸۸۷ء میں شروع ہوئی تھی اور یہ اسلامی موضوعات، نیز مشرقی علوم کی تحقیق کے تمام شعبوں کے متعلق ۱۹۱۱ء تک شائع ہونے والی جملہ مطبوعات کی، ایک نہایت مکمل فہرست مہیا کرتی تھی۔

اگر شوفن کی کتاب پوری طبع ہو جاتی تو دنیا کے ہاتھ میں شروع سے لے کر ۱۹۱۱ء تک کی اسلامی موضوعات پر تمام مغربی مطبوعہ کتب کا خاصا مکمل مجموعہ تینوں فہرستہائے کتب Schnurrer، شوفن اور *Orientalische Bibliography* کو ملا کر استعمال کے لیے موجود ہوتا ۔ اس وقت سے اسلامی علوم کے متعلق تحقیق کے روز افزوں کام اور اس وجہ سے مطبوعات کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس بات کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے کہ ایک خاص مدت کے اندر کی تمام مطبوعات کی تفصیل ایک ہی کتاب میں جمع کر دی جائے ؛ اس لیے ۱۹۱۱ء کے بعد سے جو مطبوعات وجود میں آئیں انھیں معلوم کرنے کے لیے علما کو تمام انواع کی کتابیات کی ایک بڑی تعداد کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جن کا بالتفصیل ذکر یہاں ممکن نہیں ۔ Pfannmüller نے اپنی کتاب *Handbuch der Islamliterature* (برلن و لائپزگ ۱۹۲۳ء) میں اس موضوع پر ایک مفید دیباچہ اور ہدایات قلم بند کی ہیں، لیکن اس کا مقصد اس کی مکمل کتابیات مرتب کرنا نہ تھا) ۔ بڑے بڑے رسالوں کے ذریعے بھی اس مسئلے کے حل کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہاں صرف اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ *Kritische Bibliographe* وقتاً فوقتاً، ۱۹۱۳ سے ۱۹۳۳ء تک، *Der Islam* میں شائع ہوتی رہی ہے اور *Abstracta Islamica* ۱۹۳۷ء سے *Revue des études Islamiques* کا مستقل طور پر ایک خاص حصہ رہا ہے ۔ پیرسن Pearson نے یہ کوشش کی ہے کہ *Index Islamicus* (کیمبرج ۱۹۵۸ء) میں رسالوں میں چھپنے والے، نیز ۱۹۰۶ سے ۱۹۵۵ء تک پچاس سال میں لکھے گئے مقالات کی فہرست مہیا کی جائے۔

کتابیاتی تواریخ ادبیات کی ترتیب کے ضمن میں جو روایت ابن النّدیم اور حاجی خلیفہ نے قائم کی تھی، اس کو ہمارے زمانے میں براکلمان اور سٹوری Storey نے علی الترتیب عربی اور فارسی ادبیات کے متعلق اپنی یادگار تصانیف سے جاری رکھا ہے ۔ ان دونوں مؤلفوں نے مصنفین کی سیرت کے متعلق مواد کے علاوہ مخطوطات کی تاحدِ امکان مکمل فہرست مہیا کی ہے اور تمام کتاب خانوں کے مجموعوں کی مطبوعہ فہرستوں، نیز انفرادی مصنفین کی کتابوں کی خاص خاص طباعتوں، ترجموں اور تاریخ یا تنقید کی تصانیف کی کیفیت یکجا کر دی ہے ۔ براکلمان نے اپنے مواد کو تاریخ وار ترتیب دی ہے اور سٹوری نے اس کو موضوعات کی بنیاد پر مرتب کیا ہے ۔ یہ دونوں عربی اور فارسی ادبیات کے طالب علموں اور عربی اور فارسی کتابوں کی فہرستیں تیار کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہیں ۔ [فؤاد سزگین نے براکلمان کی تاریخ ادب عربی کے تکملے کے طور پر تین جلدیں جرمن زبان میں تالیف کی ہیں، جن کا عربی ترجمہ تاریخ التراث العربی (جلد اول) شائع ہو چکا ہے ۔ فؤاد سزگین کی یہ کتاب بھی کتابیات کے سلسلے میں بڑی مفید اور اہم ہے] ۔ ایک اسی قسم کی تصنیف *Geschichts schreiber der Osmanen*، لائپزگ ۱۹۲۷ء، جس کا احاطہ نظر محدود تر ہے، Babinger نے تیار کی ہے۔

عربی میں عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابیں ایک علٰحدہ موضوع ہے، جس پر G. Graf : *Gessch de. christlichen arabt ite*، ۵ جلدیں Vatican

City ۱۹۴۴-۱۹۵۳ء اور M. Steinschneider : *Arab.Lit. der Juden*، فرینکفرٹ ۱۹۰۲ء، لکھی جا چکی ہیں۔

زمانۂ حال میں خود اسلامی ممالک نے اپنی کتابیات مرتب کرنے میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں یوسف الیان سرکیس نے اپنی کتاب معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ شائع کی ۔ اس میں تمام عربی مطبوعہ کتب کے نام، طباعت کے شروع ہونے سے لے کر ۱۹۱۹ء کے آخر تک، مصنف کے معروف ترین نام کے اعتبار سے (خواہ وہ اسم ہو یا لقب، کنیت ہو یا نسبت) حروف تہجّی کے لحاظ سے درج ہیں ۔ اس کتاب میں تصنیفات کے نام کا اشاریہ بھی شامل ہے ۔ مصر میں السِّجِلّ الثقافی کی متعدد جلدیں شائع ہوئی ہیں، جو علمی لحاظ سے درحقیقت قومی کتابیات مقصود ہو سکتی ہیں ۔ ایک فارسی قومی کتابیات، مرتبۂ ڈاکٹر ایرج افشار، فرہنگ ایران زمین میں ۱۹۵۴ء سے شائع ہو رہی ہے ۔ فارسی کی مطبوعہ کتب کی ایک فہرست کی پہلی جلد، مرتبۂ خان بابا مشار، ۱۳۳۶ شمسی/۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی ۔ برسلی محمد طاہر کی عثمانلی مؤلفلری عثمانی مصنفین کی سیرت اور کتابیات کی معجم ہے، جو تذکروں کی طرز پر لکھی گئی ہے ۔ یہ ترکی ثقافت کے تمام طلبہ کے لیے بڑی قابل قدر کتاب ہے، اگرچہ کتابیاتی تفصیل میں صحت کے لیے مشہور نہیں ۔ بقول Babinger اس کے اشاریے میں کسی نام کا ڈھونڈھ نکالنا اکثر قسمت کی یاوری پر منحصر اور بڑے صبر و تحمل کا متقاضی ہوتا ہے ۔ تورک بیلیو گرافیاسی میں ۱۹۲۸ء سے ترکی کی تمام مطبوعات درج ہیں ۔ کتاب خانۂ ملّی نے اس تجویز کا اعلان کیا ہے کہ ترکی کی تمام مطبوعہ کتب کی فہرست اٹھارھویں صدی سے جبکہ اس ملک میں طباعت کا آغاز ہوا، شائع کی جائے گی ۔ تورکیہ مقالہ لر بیلیو گرافیاسی، ترکی رسالوں میں چھپنے والے مقالات کا اشاریہ ہے، جو ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

مآخذ : ابن النّدیم کی فہرست فلوگل نے مرتب کی اور اس کی وفات کے بعد J. Roediger اور A. Mueller نے شائع کی (۲ جلدیں، لائپزگ ۱۸۷۱-۱۸۷۲ء؛ بار دوم قاہرہ ۱۳۴۸ھ)؛ ایک نیا نسخہ J. Fuck نے مرتب کیا ہے ۔ اس کے مضامین کا فلوگل نے *ZDMG*، ۱۳ : ۵۵۹ تا ۶۵۰ میں بالتفصیل تجزیہ کیا اور براؤن نے اپنی کتاب (۱ : ۳۸۳ تا ۳۸۷) میں اسے بشکل جدول مرتب کیا؛ نیز دیکھیے حوالے، در پیرسن (Pearson) : *Index Islamicus*، شمارہ ۲۳۲۸۱ تا ۲۳۸۲۷، ۲۳۷۳ (بہ استثنائے ۲۳۲۸۵)؛ حاجی خلیفہ کے لیے دیکھیے Babinger : *G. O.*، ۱۹۵ تا ۲۰۳ ۔ کشف الظنون کی فلوگل نے تدوین کی (مطبوعۂ Oriental Translation Fund، ۷ جلدیں، لائپزگ ۱۸۳۵ : ۱۸۵۸ء؛ نیز بولاق، ۱۸۵۸ء، استانبول ۱۳۱۰-۱۳۱۱ھ و ۱۹۴۱-۱۹۴۳ء) ۔ اسمٰعیل پاشا بغدادی کی ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون استانبول میں ۱۹۴۵-۱۹۴۷ء میں طبع ہوئی؛ علم ہیئت پر : نلینو (Nallino) : *Ilm al-Falak*، ص ۴۷ اور اطالوی ترجمہ، *Storia dell astronomia presso gli Arabi* در *Raccolta dei Scritti*، ص ۱۴۳ تا ۱۵۰؛ شیعی کتابیات کے لیے دیکھیے براؤن، جلد ۴، باب ۸، خصوصاً ص ۳۵۵ تا ۳۵۸؛ G. Gabrieli : *Manuale di bibliografia musulmana* (روم ۱۹۱۶ء) اپنی نوع کی منفرد کتاب ہے اور عام کتابیاتی تصانیف کے متعلق اپنی فہرستوں کی وجہ سے بہت ہی قابل قدر ہے (افسوس ہے کہ اس کا صرف پہلا ہی حصہ شائع ہو سکا ہے)؛ Schnurrer اور Zenker کی تصانیف کے لیے دیکھیے شوفن : *Biblio-graphie des ouvrages arabes*، دیباچہ، خصوصاً ص xx تا xxx۔ شوفن کی *Bibliographie* کے غیر مطبوعہ حصوں کے لیے دیکھیے J. Gobeaux - Thoret : *Notes from the Liege*

Library on Victor Chauvin and on Ibn Butlan، در *Unity and variety in Muslim civilisation*، طبع Grunebaum، ۱۹۵۵ء، ص ۳۶۳-۳۶۴: Schnurrer کا اشاریہ ص cxvii تا cxli پر مشتمل ہے۔ براکلمان: *Geschichte der arabischen literatur*، ۲ جلدیں، وائیمر و برلن ۱۸۹۸ء—۱۹۰۲ء، و Supp.، ۳ جلدیں، لائیڈن ۱۹۳۷—۱۹۴۲ء: سٹوری: *Persian Literature*، لنڈن ۱۹۲۷ء وما بعد۔

(J. D. PEARSON)

* **کُتامہ**: (یا کُتَیمہ Kotaıma)، بربروں کے عظیم خاندانوں میں سے ایک۔ جب اسلام شمالی افریقہ میں پہنچا تو اس وقت یہ خاندان موجودہ زمانے کے ضلع قُسْطَنْطِیْنَہ (Constantine) کے سارے شمالی علاقے پر [قاموس الاعلام]، جو اَوْراس (رَکّ بآن) اور سمندر کے درمیان واقع ہے، پھیلا ہوا تھا، یا دوسرے الفاظ میں اس علاقے پر جس میں اِیْکِجَان سطیف، باغایہ، تقاوس، تکسْت، میلہ، قسنطینہ (ابن خَلْدُون، ۶ : ۱۴۹)، سکیکدہ (Philippe-ville)، اَلْقُل (Collo)، جِجِلّی [= جیجل] اور بِلِزمہ کے شہروں کے علاوہ الجزائر کا علاقۂ قبائلیہ، یعنی ود (وادی سہل Wed Sahel) اور سیبن Seban کے درمیان کا علاقہ شامل ہے۔ ایک افسانے کی رو سے، جس سے ان کے افتخار قومی کو بڑھاوا ملتا ہے، وہ اِن حِمْیَریوں کی اولاد ہیں جنھیں اَفْرِیْقُوس یہاں لایا تھا۔ کُتامہ، جس کے نام سے یہ قبیلہ موسوم ہوا، برنس کا بیٹا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے دو بیٹے تھے، غرسین اور اِسْوَدہ؛ کتامہ کے تمام قبائل انھیں کی اولاد سے ہیں (معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان خانہ جنگیوں اور مذہبی لڑائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا جو عُقْبہ کے زمانے سے لے کر بنو اَغْلَب کے عہد تک شمالی افریقہ کو ویران کرتی رہیں۔ ان کے خوارج میں شامل ہونے کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ جب عُبَید اللہ نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا تو اس کے داعیوں کی کتامہ کے بعض حاجیوں سے عرب میں ملاقات ہوئی۔ ان داعیوں نے انھیں اسمٰعیلی عقائد کا معتقد بنا لیا۔ اسمٰعیلی مذہب قبول کرنے والے ان نئے لوگوں میں سب سے ممتاز شخص جمیلہ کی شاخ سُکْیَان کا رئیس موسیٰ تھا، جس کا نام ایک قصبے کے نام میں آج تک باقی ہے۔ ابو عبد اللہ الشّیعی [رَکّ بآن] نامی داعی نے ایکجان میں سکونت اختیار کر لی اور بنو اغلب کی انسدادی کوششوں کے باوجود اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ یہاں سے اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے اور المہدی کو، جو سِجِلْماسہ میں مقید تھا، چھڑانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد بنو کتامہ کی اعانت سے فاطمی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ یہی لوگ اس سلطنت کی سب سے بڑی طاقت تھے اور مصر فتح کرنے کے وسائل بھی انھیں کی بدولت مہیا ہوئے؛ لیکن اس مسلسل جدوجہد نے انھیں مضمحل کر دیا۔ جیسا کہ ابن خَلْدون نے لکھا ہے، جو لوگ المعزّ کے مصر چلے جانے کے بعد المغرب میں باقی رہ گئے تھے انھیں مقامی حکمرانوں کی اطاعت تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمارے زمانے میں کتامہ کے بڑے نمائندے جُرْجُرہ کے زواوۃ اور وہ لوگ ہیں جو جیجل اور قبائلیہ خرد کے گرد و نواح میں آباد ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے اسمٰعیلی عقائد کب محو ہوئے، لیکن اس مذہب سے منسلک ہونے کے بہت عرصے بعد تک انھیں مورد ملامت سمجھا جاتا رہا اور یہی وجہ تھی کہ سِدِوِیْکِش کے طاقتور قبیلے نے، جو کتامہ کی نسل سے تھا، اس خاندان سے اپنے آپ کو بالکل علٰحدہ کر لیا۔ آج کل اس خطّے کے تمام بربر سنّی المذہب ہیں۔

مآخذ : (۱) ابن خلدون : کتاب العبر، ۴ : ۳۲ ببعد و ۶ : ۱۴۸ تا ۱۵۲؛ (۲) *Hist. des Berbères*، مترجمہ de Slanes، ۱ : ۲۹۱ تا ۲۹۹ و ۲ : ۵۱۰ ببعد؛ (۳) Fournel : *Les Berbers*، ۲ : ۵۱ ببعد، نیز وہ مصنفین جن کا حوالہ دیا گیا ہے .

(RENÉ BASSET)

⊗ **کُتُب سَماویہ** : رک بہ انجیل؛ تورات؛ زبور؛ صحیفہ؛ قرآن .

⊗ **الکُتُبی** : رک بہ ابن شاکر الکُتُبی .

* **الکَتّانی**، محمّد بن جعفر بن ادریس، [۱۲۷۴-۱۳۴۵ھ] جس کا تعلق کتّانیین کے مشہور گھرانے سے ہے اور وہ نسلاً اشراف میں سے ہے ؛ عصر حاضر کا ایک مرّاکشی ادیب (وہ ۱۳۱۴ھ میں بھی تصنیف و تالیف میں مصروف تھا)؛ بہت سی کتابوں کا مصنف ہے، جن میں سے ایک کتاب اس نے اپنے جد امجد ادریس کے اعزاز و احترام میں لکھی ہے، یعنی الأزْہار العَاطِرۃ الأنْفاس فاس ۱۳۱۴ھ - اس کی اہم ترین تصنیف سَلوۃ الأنْفاس و مُحادثۃ الأکْیاس بِمَنْ أقْبرَ من العُلَمَاء و الصُلَحَاء بفاس (۳ جلدیں، فاس ۱۳۱۶/۱۸۹۸-۱۸۹۹ء) ہے - اس کتاب کا پہلا حصہ ان فوائد کے بیان کے لیے مخصوص ہے جو زاویوں میں اور اولیاے کرام کے مقبروں پر حاضر ہونے سے حاصل ہوتے ہیں - اس کے بعد اس نے محلّہ وار ان مشہور و معروف ہستیوں کا ذکر کیا ہے جو فاس میں رہتے تھے یا وہاں دفن ہوے، کتاب کے اس حصے میں شہر کے تاریخی مقامی جغرافیے سے متعلق بڑی قیمتی معلومات موجود ہیں - اس نے متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے، جن کی ایک فہرست اس کتاب کی تیسری جلد کے آخر میں درج ہے - [اس کی تصنیف الرسالۃ المستطرفۃ بھی قابلِ ذکر ہے - اس خاندان میں بہت سے اہل علم اور صاحب تصنیف بزرگ ہوے ہیں دیکھیے الزرکلی: الاعلام، بذیل مادۂ الکتانی و محمد بن جعفر الکتانی مع مآخذ] .

مآخذ : (۱) R. Basset : *Recherches bibliographiques sur les sources de la Salouat al-Anfās*، الجزائر ۱۹۰۵ء؛ (۲) Codera y Zaidin : *Considerable numero de libros antiquos y modernos existentes in Marruecos, Actes du XIVe Congrés international des Orientalistes (Algiers)*، پیرس ۱۹۰۸ء، ۳/۲ : ۵۸۷ تا ۵۹۰ .

(RENE BASSET)

* **کَتْخُدا** : (ف : کدخدا، "کد" بمعنی گھر، "خُدا" بمعنی مالک، آقا)، دراصل اس کا مطلب تھا مالک خانہ یا بزرگِ خاندان ؛ بعد ازاں ایران میں یہ نام دیہات میں مقدم یا سرکاری کارندے کے لیے اور شہروں میں حلقے کے "صاحب عُشر" (dixenier" de quartier"، دیکھیے Chardin : *Voyages*، ۱۸۱۱ء، ۴ : ۷۷) کے لیے استعمال ہونے لگا، جو ایک قسم کا عہدیدار پولیس تھا، اور جس کا فرض تھا کہ اپنے حلقے کا معائنہ کرے - وہ "کَلانتَر" [رک بآں] کے ماتحت ہوا کرتا تھا - جنگ عظیم سے پہلے ایران میں جو انتظامی اصلاحات نافذ کی گئیں اُن کا مقصد یہ تھا کہ کتخدا کو قریہ (گاؤں) میں، جو انتظامی اعتبار سے مملکت کی سب سے چھوٹی وحدت ہوتی ہے، عوامی حکومت کا نمائندہ (یعنی میربلدیہ = mayor) بنا دیا جائے - بد قسمتی سے یہ عہدیدار، جن کے فرائض پیشتر ازیں محاصل وصول کرنے تک محدود تھے، بڑے بڑے زمینداروں کے سامنے بالکل بے دست و پا تھے (*RMM*، ۱۹۱۴ء، ۲۷ : ۱۹۴) کیونکہ وہ انھیں کے کارندے ہوتے تھے اور انھیں وہی مقرر کرتے تھے - باین ہمہ بعض ایسے دیہات بھی ہیں جہاں یہ نمائندے

والی صوبه کی طرف سے مقرر کیے جاتے یا وهاں باشندے هی خود انهیں منتخب کرتے تھے.

یه لفظ عثمانی ترکی زبان میں داخل هوا هے، جهاں یه بگڑ کر کهیا یا کیایا هو گیا هے، جس کا مطلب هے گهر کا داروغه - "اصناف کیا یا سی" مزدوروں کی انجمن کے رکن یا صدر کو کهتے هیں - "کیا کدن" محل کی سب سے معزز خاتون، یعنی گهریلو انتظامات اور ملازمین کی مهتمم هوتی هے - "کپو کیایا" وه نمائنده یا گماشته هوتا هے جو صوبوں کے والیوں کی طرف سے باب عالی میں مقرر کیا جاتا هے - "دولت کیایاسی" کا نام اس عهدیدار کے لیے استعمال هوا کرتا تھا جس کے فرائض جدید حکومتوں کے وزیر داخله سے ملتے جلتے تھے - "قل کیایاسی" یعنی چری فوج کا ناظر اور آغا کا نائب اور اس کے ذاتی عملے کا سردار هوتا تھا، جسے اوجق [= اوجاق] کے تمام افراد کی منظوری هی سے برطرف کیا جا سکتا تھا - خود اس کا ایک نائب، آغا کے ساتھ رهتا تھا، جو سردار کے احکام قلعوں کے سپه سالاروں کے پاس پهنچاتا تھا اور "کیایایری" یعنی نائب ناظر کهلاتا تھا.

مآخذ : (۱) Barbier de Meynard : *Diction-naire turc-francais*، ۲: ۶۱۲؛ (۲) G. Demorgny : *Essai sur l' administration de la Perse*، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۵۰، ۵۵.

(CL. HUART)

* **کِتْمان** : رک به تَقِیَّة

* **کَتَنگَه** : [جمهوریهٔ زائر، یعنی سابق] بلجین کانگو کا ایک صوبه.

تاریخ و جغرافیه : کتنگه [جمهوریهٔ زائر کا] انتهائی جنوبی، زرخیز ترین اور بهت کم آباد صوبه هے - یه ۵ درجے اور ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے عرض بلد جنوبی اور ۲۱ درجے تیس دقیقے اور ۳۰ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع هے - اس کے شمال میں مشرقی صوبه اور صوبهٔ کانگو کسائی واقع هیں، مشرق میں خلیج تانگا نیکا اسے سابق جرمن مشرقی افریقه اور شمالی رهوڈیشیا سے جدا کرتی هے، جنوب میں شمالی رهوڈیشیا اور [جمهوریهٔ] انگولا اور مغرب میں انگولا اور صوبهٔ کانگو کسائی هیں - صوبهٔ کتنگه کا رقبه دو لاکھ مربع میل هے، جو سارے ملک کے چوتھائی کے برابر هے - [۱۹۷۰ء کی مردم شماری کی رو سے صوبه کی آبادی ستائیس لاکھ نفوس پر مشتمل هے جس میں اکثریت بنتو قبائل کی هے - سفید فام باشندوں میں بلجمی، ولندیزی اور انگریز هیں - بهارتی اور پاکستانی باشندے بهی پائے جاتے هیں] - کتنگه کا صوبه چار اضلاع: بالائی لواپولا، لومامی، لولوا اور تانگا نیکا موئیرو پر مشتمل هے - معاشی آسودگی کی بدولت یهاں بهت سے شهر آباد هوگئے هیں، مثلاً الزبتھ ویل Elisabethville، لکاسی Likasi، البرٹ ویل Albertville، کانگولو Kongolo، کبنڈا Kabinda، سنڈورا Sandora اور کمبووه Kambove وغیره.

کتنگه کی آب و هوا عام طور پر معتدل هے، بالخصوص دس درجے عرض بلد کے جنوب میں، جهاں سطح سمندر سے بلندی ساڑھے تین هزار سے ساڑھے پانچ هزار فٹ کے درمیان هے - اسے لوالبه Lualaba (دریائے کانگو کی بالائی شاخ) جیسی عظیم الشان ندیاں سیراب کرتی هیں - یه دریا اور ندیاں جنوب سے شمال کو بهتی هیں - ان میں بهت سی معاون ندیاں بهی آ کر مل جاتی هیں، جن کا منبع خلیج تانگا نیکا هے - کتنگه کی سرزمین جهاڑیوں سے ڈهکی هوئی هے - یه دوسرے صوبوں کی طرح زرخیز نهیں اور نه سیاحوں کے لیے هی فرحت بخش هے، البته یه معدنیات کی بے اندازه دولت سے مالا مال هے - بلجیم سے آمده آباد کاروں

کی معاشی حکمت عملی کا رخ بھی معدنیات سے استفادے کی طرف رہا ہے۔

ٹیسن کے بکثرت ذخائر لوالبہ اور خلیج تانگا نیکا کے درمیانی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ البرٹ ویل اور لیونہ Leuna میں دو اہم کانوں سے کوئلا نکالا جا رہا ہے۔ بعض مقامات سے سونے، لوہے اور ہیروں کے ذخیرے بھی ملے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں انجمن کان کنی (Mining Union) کو شیوکولوبیوہ Shiukolobiwe میں یورینیم کے قیمتی ذخائر بھی ملے تھے۔ حکومت بلجیم کتنگہ سے یورینیم درآمد کرکے ریڈیم بناتی رہی ہے۔

کتنگہ کی ثروت کا اصل وسیلہ تانبے کی کانیں ہیں۔ یہاں یہ دھات وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اہل بلجیم کی آمد سے قبل ہی ملکی باشندے ان سے تانبا نکالتے رہے ہیں۔ کچا تانبا کثرت سے چودہ درجے کی گہرائی تک پایا جاتا ہے اور ہر سال لاکھوں ٹن برآمد کیا جاتا ہے۔ برقی قوت کے استعمال سے معدنی صنعت نے بے حد فروغ پایا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط تک اہلِ یورپ اس سرزمین سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جب ۱۸۷۷ء میں مشہور سیاح سٹینلے Stanley دریاے کانگو کے دہانے تک جا پہنچا تو بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ ثانی کو اس علاقے کی اہمیت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لا محدود امکانات کا احساس ہوا۔ "کانگو فری سٹیٹ" کا قیام عمل میں آیا اور برلن کانفرنس (۱۸۸۴-۱۸۸۵ء) میں لیوپولڈ کو اس کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء کے معاہدے کی رو سے اس ریاست کا بلجیم کے ساتھ با ضابطہ الحاق کر لیا گیا۔

[بالآخر کانگو ۳۰ جون ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوگیا اور آزادی کے بعد ملک کا نام جمہوریۂ کانگو قرار پایا۔ ملک کی آزادی کے بعد اباکو پارٹی کے صدر جوزف کاساووبو Goseph Kasavubs اور کانگو کی قومی تحریک آزادی کے قائد پیٹرک لومبا Patrice Lumumba علی الترتیب صدر اور وزیر اعظم منتخب ہوے، لیکن ملک میں سیاسی استحکام نہ پیدا ہو سکا۔ قبائلی اور علاقائی عصبیتیں ابھرنے لگیں، جن کے نتیجے میں کتنگہ وزیر اعظم شومبے کی سرکردگی میں ملک سے علٰحدہ ہوگیا۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ کی فوجوں نے بغاوت کر کے تمام بلجمی افسروں کو ملک سے باہر نکال دیا۔ لومبا نے اقوام متحدہ اور روس سے امداد کی درخواست کی۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج روانہ کی۔ فروری ۱۹۶۱ء میں کتنگہ کے قبائل نے لومبا کو اغوا کر کے قتل کر دیا۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں اقوام متحدہ کی افواج نے کتنگہ پر حملہ کر کے جنوری ۱۹۶۳ء تک کتنگہ کے تمام مرکزی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں صدر کاساووبو نے وزیر اعظم شومبے کو برخاست کردیا۔ اس کے بعد کمانڈر انچیف جوزف مابوٹو Goseph Mabuto نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ملک کا انتظام و انصرام خود سنبھال لیا۔ جون ۱۹۶۷ء میں ملک میں استصواب عام کی رو سے ایک نیا دستور وضع کیا گیا، جس کے نتیجے میں ملک میں صدارتی طرز کی جمہوریہ قائم کر دی گئی اور کتنگہ اس کا ایک صوبہ قرار پایا۔ ۱۹۷۱ء میں ملک کا نام جمہوریۂ زائرے Zaire رکھا گیا۔ ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کی رو سے کتنگہ کی آبادی ستائیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں کتنگہ نے صنعتی اعتبار سے خاصی ترقی کی ہے۔ تانبے اور ہیرے کی کانیں حکومت نے ۱۹۶۷ء سے قومی تحویل میں لے لی ہیں۔ ان سے ملک کو کثیر زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ لوبمباشی Lubumbashi (سابق الزبتھ ویل) میں ایک

یونیورسٹی بھی قائم ہے]۔

مسلمانوں کی آمد : تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہجرت سے پیشتر ہی بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس کا درمیانی سمندر عربوں کے جہازوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب صحابۂ کرامؓ اور عام مسلمان جوق در جوق شمالی افریقہ میں چلے آئے تو عربوں کو بحر ہند کے اردگرد کے ممالک کی باقاعدہ تسخیر کرنے اور وہاں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کا خیال دامن گیر ہوا ۔ ان میں سوفالہ اور زنجبار ایسی بڑی سلطنتیں بھی تھیں جن پر عروج و اقتدار کے مختلف ادوار گزرے ہیں ۔

یہ سیاسی اقتدار جلد ہی مائل بہ تنزل ہوگیا اور اس کی جگہ تاجروں اور پیداواری وسائل سے منفعت اٹھانے والوں نے لے لی ۔ بقول Privelle یہ تاجر اور نفع خور اپنے استحصال کے لیے معاشرے کی عام اور طبعی حالت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

اسی زمانے میں عرب سردار مشرقی افریقہ کے اندرونی حصے میں راہ پانے لگے ۔ ملکی باشندے ان کی مزاحمت نہ کر سکے ۔ اندرون ملک ان سرداروں کو ہاتھی دانت کے بیش بہا ذخیرے اور غلاموں کی بڑی تعداد ملی، جنھیں وہ مسلمان تاجروں اور امریکی آبادکاروں کے ہاتھ مہنگے داموں فروخت کر دیا کرتے تھے۔

زنجبار اور ساحل موزمبیق سے نکل کر مسلم آباد کار انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں خلیج تانگا نیکا تک پہنچ گئے ۔ وہ خلیج متوآ M'Toa سے ہوتے ہوئے کتنگہ تک پھیل گئے اور سڑک کے راستے مشرقی صوبے میں کابمبیر Kabambare اور کاسونگو Kasongo تک جا پہنچے ۔ ایک سردار تپوتپ Tippo-Tip اور اس کے بھتیجے رشید کی سرکردگی میں تانگانیکا کے کناروں سے سٹینلے ویل Stanleyville تک ایک عرب ریاست قائم ہو گئی۔

عربوں کی یلغار (جس کی تفصیلات سٹینلے اور لِونگ سٹون Livingstone نے اپنے سفرناموں میں بیان کی ہیں)، ان کی مفروضہ زیادتیوں اور ملکی باشندوں کے معاشرے کے تنزل اور مسلسل جنگوں کے باعث ان کی اندرون ملک نقل مکانی کی بنا پر یورپ میں زبردست رد عمل ہوا ۔ Cardinal de Lavigerie نے عربوں کے خلاف جنگ کی تبلیغ شروع کر دی ۔ لیوپولڈ ثانی کی درخواست پر یورپ کی "مہذب قوموں" کا اجتماع ۱۸۸۹ء میں غلامی کی روک تھام کے لیے ہوا اور (اس کے بہانے) رشید، سیفو اور کمالیزا وغیرہ عرب سرداروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ۔ Dhanis نے کانگو کے جنوب میں اور کمانڈار جیکوئیز Jacques اور اس کے نائبوں نے خلیج تانگا نیکا، البرٹ ویل اور مپالا وغیرہ مقامات پر عربوں کے خلاف گھمسان کی جنگیں لڑیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقے ہمیشہ کے لیے عربوں کے اقتدار سے آزاد ہو گئے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں کا کتنگہ کے بنتو قبائل پر کیا اثر پڑا ؟ خلیج تانگا نیکا سے لے کر آبشار سٹینلے تک آج بھی زنگی ملتے ہیں، جو اسلام کے حلقہ بگوش ہیں اور انھیں ونگوانہ عرب کہتے ہیں ۔ ہم وثوق سے کہ سکتے ہیں کہ عرب ہمیشہ سے تبلیغ اسلام کے لیے کوشاں رہے ہیں اور یہ بھی یقینی ہے کہ اسلام [اپنی تعلیمات کی بنا پر اور غلامی کی مخالفت کے باعث ہمیشہ سے] افریقہ کے ملکی باشندوں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔

مشرقی صوبے میں یہ اثر نمایاں ہے، لیکن کتنگہ میں خلیج تانگانیکا کے کنارے اور قدیم عرب شاہراہوں پر بھی زنگی ملتے ہیں، جنھوں نے عربوں کے طور طریقے اپنا لیے ہیں ۔ ان کی دینی تعلیم اگرچہ ابتدائی درجے تک محدود ہے، لیکن

دوسرے زنگیوں پر اپنی برتری کا نقش قائم کرنے کے لیے یہ مسلم زنگی سفید لباس پہنتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور رمضان میں روزے بھی رکھتے ہیں۔ زنگی مشرف باسلام ہو کر غیر مسلموں اور ان کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دیگر مسلمان بھی ان جذبات کی پرورش میں لگے رہتے ہیں۔

کتنگہ کے مسلم زنگیوں کے ساتھ عرب بھی آباد ہیں، جن میں ہندوستانی [اور پاکستانی] مسلمان بھی آ ملے ہیں۔ ان کی بڑی بڑی دکانیں ہیں اور وہ آسودہ حال ہو گئے ہیں۔

[۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے کتنگہ میں عربوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے اور ان کی سیاسی اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا]۔

مآخذ: (۱) *Travaux du groupe d'etudes coloniales, Le Katanga* : A de Bauw (۲)؛ *Le Katanga*، برسلز ۱۹۲۰ء؛ (۳) O Meynier : *L' Afrique noire*، پیرس ۱۹۱۴ء؛ (۴) A de Préville : *Les Sociétés africaines*، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۵) P. Daye : *L' empire colonial belge*، ۱۹۲۳ء؛ (۶) E. Van der Straeten : *Bulletin de la Société belge d'études coloniales*، ۱۹۲۴ء؛ (۷) Sidney Langford-Hinde : *La chute de la domination des Arabes du Congo*، بلجیمی کانگو کا دستور العمل، مطبوعہ امارت بحریہ، لنڈن ۱۹۱۹؛ (۸) *Statesman's year Book* 1974/1975ء.

(E. VAN DER STRAETEN [و ادارہ])

* **کُتَی**: (Kutai)، مشرقی بورنیو Borneo کی ایک خود مختار ریاست، جو [ولندیزی عہد حکومت میں] بورنیوریزیڈنسی (Zuider-en Oosterafdeeling van Borneo) کی قسمت سمارندہ Samarinde میں شامل تھی؛ [آج کل انڈونیشیا کے صوبۂ مشرقی کالی منتان کا ضلع، جو] زیادہ تر دریائے مَہَکم Mahakam کی وادی پر مشتمل اور موارہ مجب Muara Mujub تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک بہت اہم دریا ہے اور اس کا بڑا حصہ جہاز رانی کے قابل ہے۔ مَکسر سے آنے والی سڑک اس کی مشرقی سرحد معیّن کرتی ہے۔ ولندیزی نائب ریزیڈنٹ مَہَکم کے کنارے سمارندہ میں رہتا تھا۔ سلطان کا دارالحکومت، تَنگَرنگ Tenggarung، دریا کے بالائی جانب ذرا فاصلے پر واقع تھا۔ ملک خوشحال ہے، یہاں کی زمین میں عمدہ قسم کا کوئلا اور پٹرولیم کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اگر حالات حسب معمول ہوں تو جنگل کی پیداوار اور خشک اور نمکین مچھلی کی تجارت زوروں پر ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سلطنت کا نام مشتق ہے یُوپَ کوٹی سے (سنسکرت: کوٹی = الجام، نقطہ)، جو ہندوستان کی کتب جغرافیہ میں مذکور ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ پانچویں صدی عیسوی سے قبل یہاں ہندوؤں نے جاوا کے راستے سے نہیں بلکہ براہ راست ایک نو آبادی قائم کر لی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں مُولَوَرمَن نامی ایک راجا کے ماتحت ہندوؤں کی ایک خوشحال سلطنت موجود تھی۔ اس کا ثبوت پتھر کی چار اھدائی (dedicative) لاٹھوں پر خالص سنسکرت میں لکھے ہوئے کتبوں سے ملتا ہے، جو کُتَی میں دستیاب ہوئی ہیں۔ ممکن ہے دیگر قدیم نوادر، بالخصوص کوہ کومبنگ Kombeng کے ایک غار سے دستیاب ہونے والے برہمنی دیوتاؤں کے بتوں کا تعلق بھی اسی سلطنت سے ہو۔ بورنیو میں زمانۂ مابعد کی جس ہندو تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں وہ درحقیقت جاوا سے یہاں آئی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں کُتَی مجاپاہت کی جاوی سلطنت کے علاقوں میں شامل تھا۔ ریاست کُتَی کی ابتدا

اور اس کے حکمران خاندان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں ایک مقامی روایت کا پتا ایک ملائی مسودے سے چلتا ہے، جو سلطان تنگرنگ کے قبضے میں تھا (اس کی ایک اور نقل برلن میں موجود ہے)۔ اس سلسلۂ نسب (''سَلْسِلہ'') کی رو سے، جس کا پہلا حصہ بہت حد تک اساطیری ہے اور ولندیزی ترجمے کے ساتھ چھپ چکا ہے، یہاں اسلام ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ، راجا مکوئتہ Mokoeta کے عہد میں، سلاویسی (Celebes) سے پہنچا تھا .

یہاں کی آبادی بہت مخلوط نوعیت کی ہے ۔ ملک کے اصل باشندے دیاک Dayakes ہیں، جو ابھی تک زیادہ تر اصنام پرست ہیں ۔ اب فی الواقع مَہَکم کے کنارے ان کی کوئی بستی باقی نہیں رہی۔ دوسرے لوگ جو یہاں آباد ہو رہے ہیں، وہ انھیں روز بروز تیزی سے اندرونی علاقوں کی طرف دھکیلتے جا رہے ہیں ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تُنْجُنگ دیاکوں کے سردار کُتَی کے حکمران خاندان کے رشتے دار ہیں ۔ مذکورۂ بالا ''سَلْسِلہ'' کی رو سے تُنْجُنگ کے شہزادے کرن (Kerna) نے ۱۴۵۰ء کے قریب اس وقت کے حکمران راجا پتیری Poteri کی ایک بہن سے شادی کی تھی ۔ دور افتادہ اندرونی علاقوں میں ابھی تک چند خانہ بدوش قبائل ملتے ہیں ۔ یہاں کی دوسری قومیں کُتَینی، بُگنی، بنجری اور بَجَو، سب مسلمان ہیں ۔ کُتَینی، جن پر یہاں کی آبادی کا زیادہ تر حصہ مشتمل ہے، غالباً قدیم مختلف النسل ملائی نو آبادکاروں کی اولاد ہیں ۔ یہ لوگ سارے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ بُگنی کی نوآبادیوں کے آغاز کا پتا بھی ہمیں ایک مقامی روایت سے چلتا ہے، جو ایک کتاب *Salasila Bugis* میں محفوظ ہے ۔ یہ لوگ غالباً ۱۶۸۶ء کے آغاز میں یہاں آباد ہونا شروع ہوئے تھے اور وجو Wadjo سے آئے تھے۔ ان کے آنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے ۔ شروع شروع میں بُگنی تمام تر سَمارندہ میں رہتے تھے اور وہاں کی آبادی میں ان کی خاصی معقول تعداد تھی ۔ یہ لوگ عملی طور پر سلطان کُتَی کی حکومت سے آزاد تھے اور ان پر ان کا اپنا سردار (پُوا اَدُو) حکومت کرتا تھا، جسے مختلف خاندانوں اور گھرانوں کے بزرگ منتخب کرتے تھے۔ [آگے چل کر] کُتَی میں یہ بُگنی جمہوریہ باقی نہیں رہی اور بُگنی بھی یہاں کے دوسرے باشندوں ہی کی طرح سلطان کے ماتحت آ گئے ۔ وہ سارے ملک میں آباد ہو چکے ہیں اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں ۔ بَنْجَری آباد کار بھی، جو بورنیو کے جنوب سے آئے ہیں، روز بروز بڑھ رہے ہیں ۔ ان کا بڑا پیشہ جنگل کی پیداواروں کا جمع کرنا ہے ۔ بَجَو جزائر سُلو سے آئے تھے ۔ پہلے یہ لوگ بحری قزاق تھے، لیکن اب وہ مَہَکم کے دہانے پر مستقلاً آباد ہو گئے ہیں اور ماہی گیری پر گزر اوقات کرتے ہیں ۔ آبادی کے مختلف النسل ہونے کا اثر زبان پر بھی نمایاں ہے، جو ملائی کی ایک مبدّل شکل ہے اس پر ابھی تحقیق ہونا باقی ہے، البتہ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جاوی زبان کے الفاظ بڑی تعداد میں شامل ہیں ۔ کُتَی کو ولندیزیوں سے پہلی بار سابقہ ۱۶۳۵ء میں پڑا، جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہاں کے حکمران سے پہلا معاہدہ ہوا ۔ ۱۸۲۵ء اور ۱۸۴۴ء کے معاہدوں کی رو سے سلطان نے ولندیزی سیادت تسلیم کر لی ۔ یہ بھی طے پایا کہ سلطان چار سربرآوردہ اشخاص کی اعانت سے حکومت کرے گا، دیاک اپنے اپنے حکمرانوں کے ماتحت رہیں گے اور جن حکمرانوں کا عہدہ موروثی ہوگا سلطان اس کی توثیق کرے گا .

مآخذ: (۱) J. H. Moore : *Notices of the Indian archipelago and adjacent conntries*، سنگاپور ۱۸۳۷ء؛ (۲) A. L. Weddik : *Overzigt van hetrijk van Koetei*، در *Indisch Archief*، ۱۸۴۹ء، ج ۱؛ (۳)

John Dalton en zijne xxx berigten over Koeti en den majoor Müller، در *Tijdschrift voor Neder-landsch Indië*، ۱۸۵۶ء، ۱۸ : ۲۷۳؛ (۳) J.G.A. Gallois: *Korte aanteekeningen, gehouden gedurende eene reis langs de Oostkust van Borneo*، در *BTLV*، ۱۸۵۶ء، ۳ : ۲۲۰؛ (۵) J. Zwager: *Het rijk van Koetei op de Oostkust van Borneo, in het jaar 1853*، در *Tijdschrift voor Nederlandsch Indië*، ۱۸۶۶ء، سلسلۂ جدید، ۳: ۲۳۱؛ (۶) P. J. Veth: *Het Koeteische vorstenhuis*، در *Tijdschrift voor Nederlandsch Indië*، ۱۸۷۰ء، سلسلۂ سوم، ۳ : ۳۵۳؛ (۷) *Verslag van het verhandelde tot regeling der betrekkingen tusschen de Maleische en Boegineesche nederzettingen aan de Koetei-rivier onder den vorigen Sultan van Koeti, vertaald uit het oorspronkelijke Maleische*، در *TBGKW*، ۱۸۷۷ء، ۲۳ : ۲۱۲؛ (۸) Carl Bock: *Reis in Oost-en Zuid-Borneo*، 's-Gravenhage، von Koetei naar Banjarmassin، ۱۸۸۱ و ۱۸۸۲ء، ۲ جلد؛ (۹) H. Kern: *Over de Opschriften uit Koetei in Verband met de geschiedenis van het schrift in den Indischen Archipel*، در *Versprede Geschriften*، ۱۹۱۷ء، ۷ : ۵۵؛ (۱۰) J. van Nieuwkuyke: *Exploitatie door Nederlanders van de Noordoost-kust van Borneo*، در *Tijdschrift voor Nederlandsch Indië*، ۱۸۸۲ء، سلسلۂ جدید، ۱۱ : ۴۰۱؛ (۱۱) S.W. Tromp: *Eenige mededeelingen omtrent de Boegineezen van Koetei*، در *BTLV*، ۱۸۸۷ء، ۳۶: ۱۶۷؛ (۱۲) وهی مصنف: *Uit de Salasila van Koetei*، در *BTLV*، ۱۸۸۸ء، ۳۷ : ۱؛ (۱۳) C. Snouck Hurgronje: *Nog iets over de Salasila van Koetei*، در مجلۂ مذکور، ص ۱۰۹ (منقول در *Gesammelte Schriften*، ۱۹۲۵ء، ۵ : ۱۴۵)؛ (۱۴) S. W. Tromp: *Een reis naar de bovenlanden van Koetei*، در *TBGKW*، ۱۸۸۹ء، ۳۲ : ۲۷۳؛ (۱۵) وهی مصنف: *Mededeelingen uit Borneo*، در *Tijdschrift van het Kon. Ned. Aardrijkskundig Genootschap*، ۱۸۹۰ء، سلسلہ ۲، ۷ : ۲۲۸؛ (۱۶) A. W. Nieuwenhuis: *Quer durch Borneo*، لائیڈن ۱۹۰۴ و ۱۹۰۷ء، ۲ جلد؛ (۱۷) S. C. Knappert: *Beschrijving van de onderafdeeling Koetei*، در *BTLV*، ۱۹۰۵ء، ۵۸ : ۵۷۵؛ (۱۸) H. Witkamp: *Een bezoek aan eenige oudheden in Koetei*، در *Tijdschrift van het Kon. Ned. Aardrijkskundig Genootschap*، ۱۹۱۳ء، سلسلہ ۲، ۳۱ : ۵۸۷؛ (۱۹) M. L. R. Rutten: *Reischerinneringen uit Noord-Koetei, bewesten de Sangkoelirangbaai*، در مجلۂ مذکور، ۱۹۱۷ء، ۳۳ : ۱۱۷؛ (۲۰) *Encyclopaedie van Nederlandsch Indië*، بار دوم، ۱۹۱۸ء، ۲ : ۴۷۳، بذیل مادّۂ Koetei؛ (۲۱) J. Ph. Vogel: *The Yupa inscriptions of King Mulavarman, from Koetei (East Broneo)*، در *BTLV*، ۱۹۱۸ء، ۷۳ : ۱۶۷.

(W. H. RASSERS)

* **کَٹَک** : (Cuttack)، ایک ضلع، جو بھارت کے صوبۂ اُڑیسہ [رک بآں] میں واقع ہے.

* **کَثَـای** : (خِطای)، رک بہ الصین.

* **کُثَیِّر عَزَّہ** : ابو صَخْر کثیر بن عبدالرحمٰن الخزاعی، جسے اس کے نانا کی طرف منسوب کر کے ابن ابی جُمْعَۃ بھی کہتے ہیں، عہد بنی امیہ کے بڑے نام آور شعراء میں سے ہے ۔ اس کی محبوبہ عَزَّۃ کی وجہ سے، جس کی مدح و ثنا میں اس نے بہت کچھ لکھا ہے، اسے کُثَیِّر عَزَّۃ کہتے تھے ۔

اس کی مستقل سکونت تو مدینے ہی میں تھی لیکن ویسے وہ حجاز کے اور مقامات میں بھی رہتا رہا تھا ۔ اس کا شمار خزاعہ میں ہے، لیکن اسے

اپنا تعلق الصَلْت بن النَضْر بن کِنانَہ سے جوڑنے کا شوق تھا ۔ یہ، بقول الیعقوبی، ایک گروہ تھا، جو خزاعہ میں شامل ہوگیا تھا ۔ کچھ لوگ اس وجہ سے اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پھر اس کا کریہ المنظر ٹھنگنا ڈیل ڈول بھی کچھ ایسا تھا کہ دیکھتے ہی ہنسی آتی تھی ۔ کہتے ہیں کہ اس کی حماقت اور غباوت کی وجہ سے بھی لوگ اسے خواہ مخواہ چھیڑا کرتے تھے.

عقائد کے لحاظ سے وہ غالی شیعہ تھا اور اپنے شاعر دوست خِندِف (الاسدی) کے زیر اثر وہ غیبۃ (رک بآں) کے بعد دوبارہ دنیا میں لوٹ آنے (رَجعۃ، رک بآں) اور تناسخ کا بھی قائل تھا.

بایں ہمہ کُثیر کے یہ اعتقادات اس بات سے مانع نہیں ہوے کہ وہ بنو مروان کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے ۔ خلیفہ عبدالملک اس کے اشعار کی بہت قدر کرتا تھا، چنانچہ اس نے کئی بار کُثیِّر کو وافر انعام دیے ۔ اس خلیفہ کی وفات کے بعد کُثیِّر نے اس کا خاص طور پر مرثیہ لکھا ۔ ایک مدت انتظار کرنے کے بعد جب شاعروں کو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (عمر ثانیؒ) کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ملی تو ان کے ساتھ کُثیِّر بھی باریاب ہوا اور اس نے انہیں نہایت برمحل اشعار سنا کر داد و تحسین وصول کی ۔ کُثیِّر کو بنو مہلب کی سرپرستی بھی حاصل رہی.

کُثیِّر کا عَزَّۃ کے ساتھ، جس کا ذکر وہ اپنے بہت سے اشعار میں کرتا ہے، کیا علاقہ تھا ؟ اس کی بابت بہت سی متضاد حکایات موجود ہیں ۔ ناقدین ادب وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ جمیل [رک بآں] کے عشق کے مقابلے میں اگر دیکھا جائے تو کُثیِّر کا عشق حقیقی نہیں، بلکہ مجازی تھا ۔ کُثیِّر جمیل کے اشعار کی روایت کرنے والا (راوِیَۃ) تھا ۔ وہ جمیل کو سب شعرا سے افضل مانتا تھا اور اس کی کی تقلید کیا کرتا تھا ۔ خود کُثیِّر کا راویۃ سائب ابن ذَکْوان تھا (مثلاً دیکھیے الاغانی، ۱۱ : ۱۸ س ۳ و ۱۱ ؛ ۱۴ : ۱۵۵ س ۵ ؛ نیز دیکھیے ۱۱ : ۵۰ حصۂ زیریں : السائب بن الحکیم السدوسی).

کُثیِّر نے بعہد یزید ثانی ۱۰۵ھ/۷۲۳ء میں وفات پائی ۔ اکثر مصنفین نے لکھا ہے کہ اسی روز مشہور عالم دین عِکْرِمہ کی وفات ہوئی تھی (دیکھیے ابن حجر : تہذیب التہذیب، حیدر آباد ۱۳۲۵ - ۱۳۲۷ھ، ۷ : ۲۷۱) ۔ دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے بعض فضلا کی راے میں کُثیِّر زمانۂ اسلام کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔ ابن سَلّام الجُمَحی رقم طراز ہے کہ اہل حجاز کُثیِّر کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں، لیکن اہل عراق اس کے اتنے قائل نہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا کمال مدیح میں ظاہر ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ قصیدے کی نسیب میں امر کا جوہر کھلتا ہے؛ تاہم بیشتر نقاد نسیب کے میدان میں جمیل کو متقدم مانتے ہیں (الموازنۃ، ص ۴ ببعد) ۔ کُثیِّر کی بہت سی نظمیں موسیقی میں ڈھالی اور گائی گئی ہیں.

کُثیِّر کی بابت معلومات الزُبَیر بن بَکّار اور اسحٰق بن ابراہیم الموصِلی نے جمع کی ہیں (اخبار کُثیِّر، ابن الندیم : الفہرست، ص ۱۱۱ س ۱۰، ص ۱۴۲ س ۲۰) ۔ ایک اور تالیف کتاب کُثیِّر و عَزّہ بھی متداول تھی (الفہرست ص ۳۰۶ س ۱۱) ۔ دیوان کُثیِّر کا ذکر القالی نے کیا ہے کہ کامل دو جزء میں تھا اور ابن دُرَید سے اس نے پڑھا تھا (ابن خیر : فہرست، ج ۱ [Bibl Arabico Hispana، ج ۹]، ص ۳۹۶ س ۴)۔ اس کا ذکر حاجی خلیفہ : کشف الظنون (طبع Flugel، ۳ : ۳۰۳، عدد ۵۶۳۰) میں بھی موجود ہے، مگر اس وقت یہ مخطوطے

نا پید ہیں - مخطوطۂ اسکوریال، عدد ۹۰۴ (H. Derenbourg: Les manuscrits arabes de l' Escurial، پیرس ۱۸۸۴ء، ۱ : ۲۷۳) میں دیوان موجود نہیں ہے بلکہ اس میں فقط ایک قصیدہ ہے (دیکھیے P. Schwarz: *Studien Zur Arab. litratur-und Sprachkunde* Stuttgart، ۱۹۲۲ء ۱: ۱ تا ۱۷)، چند قلمی قصیدے برلن میں موجود ہیں (Ahlwardt: *Verzeichn*، عدد ۷۵۲۴، ۲ : ۸۲۵۵، ۴۱؛ ۸۴۷۱، ۶) دیوان مع شرح عربی طبع H. Peres، ۱ و ۲ (الجزائر-پیرس ۱۹۲۸ و ۱۹۳۰ء (Bibl. Arabe) مجموعۂ مقطوعات).

مآخذ : (۱) ابن سلّام الجُمحی : طبقات الشعراء، طبع Hell، ص ۱۲۱، س ۸ ببعد، ۱۲۲ - ۱۲۵؛ (۲) ابن قتیبہ : الشعر و الشعراء، طبع ڈخویہ : ص ۳۱۶ تا ۳۲۹، دیکھیے ص ۱۸، س ۸ ببعد، ص ۵۹ س ۱۱ ببعد، ص ۶۲، س ۹ ببعد، ۲۶۱ تا ۲۶۳ : (۳) المبرد : الکامل، طبع Wright، ص ۳۲۰ ببعد، ۴۱۶ س ۹، ۴۹۷، س ۹ ببعد، ص ۵۵۴، س ۶ ببعد؛ (۴) القالی : الامالی، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱: ۴۶ ببعد، ۶۵ ببعد، ۱۷۸، ۲: ۵، ۵۶، ۶۲ تا ۷۰، ۱۰۷ تا ۱۱۰، ۱۲۹؛ ۳ : ۶۷، ۱۱۹ ببعد، ۲۲۰ ببعد؛ (۵) الف) الاغانی، ۸ (بولاق) : ۲۷ تا ۴۴ : ۱۱ (بولاق) : ۴۶ تا ۵۲ و مواضع کثیرہ ؛ (۵) البلاذری : انساب الاشراف، طبع Ahlwardt، Greifswald، ۱۸۸۳ء، ۱۱: ۲۱۱ ببعد، ۲۳۵، ۲۶۶، س ۱ : (۶) ابن واضح الیعقوبی : تاریخ، طبع Houtsma، ۲ : ۳۶۶؛ (۷) الطبری : تاریخ، طبع ڈخویہ، ۳ : ۲۴۸۴ ببعد؛ (۸) المسعودی : مروج الذہب، پیرس ۱۸۷۷ - ۱۸۶۱ء، ۵ : ۱۷۶ ببعد، ۱۸۱ ببعد ۴۵۵؛ ۶ : ۴۲۶؛ (۹) وہی مصنف : التنبیہ والاشراف، *B.G.A.*، ۸: ۳۱۰؛ (۱۰) ابن خلّکان : وفیات الاعیان، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۳۳۳ - ۳۵۰ : (۱۱) یاقوت : معجم البلدان، طبع Wüstenfeld، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) عبدالقادر البغدادی : خزانۃ الادب، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۲ : ۳۷۷ تا ۳۸۳؛ (۱۳) جرجی زیدان : تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، قاہرہ، ۱۹۲۴ء، ج ۱؛ طبع دوم : ۲۹۱ ببعد، (۱۴) Brockelmann : *G A L.*، ۱ : ۴۸، و [(۱۵) تکملہ، ۱ : ۷۹ تعریب، ۱ : ۱۹۵، ۱۹۶]. (۱۶) المرزبانی : الموشح، ۱۴۳، ۱۵۸ مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۷) وہی مصنف؛ معجم الشعراء، ص ۲۵۰، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۸) السیوطی : شرح شواہد المغنی، ص ۲۴، مطبوعۂ قاہرہ ؛ (۱۹) طہ حسین : حدیث الاربعاء، ۲ : ۱۱۶ تا ۱۲۶، قاہرہ].

(C. VAN ARENDONK)

* **کَچھ :** (بعض اوقات کَچ؛ البلاذری اور الیعقوبی : قصّہ؛ البیرونی: کچ؛ یاقوت، طبع وُسٹنفلڈ، ۴ : ۱۲۶ سطر ۱ : القصّہ، لیکن ۱ : ۵۰۵، سطر ۲۲، ۴ : ۹۴، سطر ۱۰ : القَص، انگریزی : "کچھ" Cutch؛ [اس کا چ ڈیلٹ اور کنجرکوٹ کا علاقہ پاکستان میں شامل ہے] کل رقبہ ۸۴۶۱ مربع میل اور آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے - اس کے جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب، جنوب میں خلیج کچھ اور شمال میں صحرائے تھر ہے - نمک کی عظیم دلدلیں جنھیں رن آو کچھ کہتے ہیں، اسے سندھ کی اصل زمین (پاکستان) اور سوراشٹر (بھارت) سے علٰحدہ کرتی ہیں اور اس طرح یہ قطعۂ زمین ایک قسم کے جزیرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے - یہ سارا علاقہ بنجر ہے، جہاں کوئی درخت نظر نہیں آتا ؛ جنوب میں کچھ پہاڑیاں ہیں، جن پر سبزی مائل آتشیں مادّہ ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کی آتش فشانی کے زمانے کا لاوا ہے - یہاں زلزلے اکثر آئے ہیں ؛ چنانچہ ۱۸۱۹ء کے زلزلے میں تو سب کچھ تباہ ہو گیا تھا.

لوگوں کا عام مقبول روزگار زراعت ہے، خاص خاص فصلیں بگی گندم، جَو اور کپاس ہیں -

کنو کے علاقے میں رن کے نمک کے ذخیروں میں سے نمک بھی حاصل کیا جاتا ہے اور یہاں کے لوگوں کا اہم روزگار ہے ۔ منڈوی اور کَودلہ یہاں کی دو بڑی بندرگاہیں ہیں ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ رن کچھ کسی زمانے میں سمندر ہی کا ایک بازو ہو گا اور غالباً یہ وہی جگہ ہے جسے Arrian نے ایک بڑی جھیل کے نام سے تعبیر کیا ہے اور دہانۂ سندھ کے قریب یہاں سے سکندر اعظم بھی گزرا ہے ۔ V. de St. Martin، Watters Sgulien اور V. Smith کا خیال ہے کہ چینی سیاح ہوان سانگ نے جس علاقے کو کچ لکھا ہے وہ یہی علاقہ ہے ۔ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہ ملک "وَلّہ" بھی راجاؤں کے ماتحت ہے، لیکن یہ بات مشکوک ہے کیونکہ جس صوبے کا ہوان سانگ ذکر کرتا ہے وہ سمندر کے قریب نہیں ہے۔

البلاذری قصہ کے ایک بادشاہ کا ذکر کرتا ہے جسے راسک (راسک) کہتر تھا اور جو خلیفہ الولید اول (۸۶تا۹۶ھ/۷۰۵ تا ۷۱۵ء) کا ہم‌عصر تھا ۔ نویں صدی عیسوی میں بھی خلیج کچھ میں سرستہ (سوراشٹر) کا شہر آباد تھا ۔ یہاں سَید لوگ رہا کرتے تھے جو مشہور بحری قزّاق تھے ۔ بقول البلاذری خلیفہ ہشام (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ/۷۲۳ تا ۷۴۳ء) کے زمانے میں خلیج کَچھ کے باشندے مسلمان تھے ۔ جب علاقۂ سندھ میں مسلمانوں کی قوت کو زوال ہوا تو انھوں نے اپنے آپ کو علاقۂ "قَصّہ" میں برقرار رکھنے کی کوشش کی (الیعقوبی) ۔ البیرونی بیان کرتا ہے کہ دریائے سندھ کی مشرقی شاخ مہران اُس مقام پر سمندر میں جا گرتی تھی جسے کچھ میں سندھ ساگر کہتے تھے اور صاف ظاہر ہے کہ یہ رن آو کچھ (Rann of Kacch) ہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۰۰۰ء تک یہ رن سمندر ہی کا ایک بازو بنا رہا اور دریائے سندھ کی ایک شاخ اس میں سے بہتی رہی ۔ البیرونی نے بھی کچھ کے متعلق لکھا ہے کہ بحری قزّاقوں کا گھر تھا ۔ (بوَارج) سمّہ راجپوت حکمرانانِ سندھ نے اس علاقے کو غالباً چودھویں صدی عیسوی میں فتح کر لیا ۔ ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا، لیکن جھریجہ خاندان نے جس کا اقتدار منڈوی (۱۲۷۰ تا ۱۲۹۸ء) میں قائم تھا ایک ایسا ہندو مذہب اختیار کر لیا جو عام ہندو مت سے ذرا مختلف تھا ۔ وہ اس ملک میں برابر حکومت کرتے رہے ۔ پہلے وہ گجرات کے بادشاہوں کے ماتحت تھے، اس کے بعد مغلوں کے اور سب سے آخر میں انگریز برسر اقتدار آ گئے ۔ سندھ کے کلہوڑا خاندان نے اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۷۶۲/۵ء) میں کچھ پر حملہ کیا ۔ ابتدائی زمانے میں علاقۂ کچھ بحری ڈاکوؤں کی جائے پناہ ہونے کی وجہ سے بے حد بد نام تھا، انگریز آئے تو پھر وہی حالت ہو گئی ؛ چنانچہ ۱۸۱۹ء میں انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ جھریجہ خاندان کے حکمران راؤ کے لقب سے کوئی ایک صدی تک یہاں حکومت کرتے رہے ۔ ۱۸۴۸ء میں ہندوستانی ریاستوں کا الحاق برطانوی ہند سے ہو گیا ۔ [نیز رک بہ پاکستان، ۵ : ۴۵۱].

کچھی زبان اس صوبے کی خاص بولی ہے ۔ یہ زبان مغربی ہند کی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور عام طور پر اسے گجراتی زبان کی ایک بولی شمار کیا جاتا ہے، گو بقول گریرسن اسے زیادہ تر سندھی زبان کی ایک بولی سمجھنا چاہیے ۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر یہ زبان دونوں زبانوں کے درمیان ایک رابطے کا کام دیتی ہے۔

مآخذ : (۱) البلاذری، طبع ڈخویہ، ص ۴۳۸، س ۹، ص ۴۴۰، س ۱۱ تا ۱۳، ص ۴۴۴، س ۲ ؛ (۲) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲ : ۳۸۰، س ۱۲ ببعد ؛ (۳) البیرونی : کتاب الھند، طبع زخاؤ، ص ۱۰۲، س ۹ و ۱۱، ص

۱۳۰؛ ص ۶ و ۱۲؛ ترجمہ ص ۲۰۸ و ۲۶۰؛ (۴) Reinaud : *Mem.....sur l' Inde Mem de l'Acad. des Inscr. et Belles Lettres, XVIII* 2و)، ص ۱۸۷ تا ۱۸۸؛ (۵) V. Smith : *Early Histroy of India*، طبع سوم، آکسفرڈ ۱۹۱۵ء؛ (۶) Sivewright : *Cutch and the Rann* (Geogr. Journal ۱۹۰۷ء)؛ (۷) J. Burnes : *Narrative of a visit to the court of Sinde*؛ (۸) *A sketch of the History of Cutch*؛ لنڈن ۱۸۳۱ء، ضمیمہ ص ۱۳۵ ببعد؛ (۹) Pertsch : در *Zeitschr. der Dtsch. Morg. Cesellsch.*، ۲۵ : ۶۱۱ تا ۶۱۳ (سکّوں پر)؛ (۱۰) D.P. Khakhar : *Arch. Survey of Western India* (صوبۂ کچھ)، عدد ۱۵۲، بمبئی ۱۸۶۸ء۔

(M. LONGWORTH DAMES)

*® **کچھی** : یا کچھ گنداوہ؛ پاکستانی بلوچستان کا مثلث نما چپٹا علاقہ جو ۲۷ درجہ، ۵۳ دقیقہ تا ۲۹ درجے ۳۵ دقیقے شمال میں اور ۶۷ درجے ۱۱ دقیقے تا ۶۸ درجے ۲۸ دقیقے مشرق میں واقع ہے [اس کا رقبہ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مطابق ۵۳۱۰ مربع میل ہے] ۔ اس کے شمال مشرق میں کوہ سلیمان کا سلسلہ ہے اور مغرب میں کرتھار کی پہاڑیاں ۔ جنوبی گوشہ خالی ہے اور شمالی سندھ کا میدان اس طرف حدبندی کرتا ہے ۔

اس علاقے کی تاریخ بلوچستان کی نسبت سندھ سے زیادہ قدیمی تعلق رکھتی ہے ۔ [ابن حوقل اس کا صدر مقام قندابیل لکھتا ہے جو آج کل گنداوہ کہلاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں برہمن راجہ چچ نے اس پر قبضہ کیا تھا ۔ عرب وارد ہوئے تو ان کے زیر تصرف آ گیا ۔ بعد میں سندھ کے سومرہ اور سمّہ خاندانوں کے قبضہ میں چلا گیا ۔ بلوچ نویں صدی ہجری، پندرھویں صدی عیسوی میں آئے، لیکن وہ کبھی بھی مضبوط سیاسی قوت کے مالک نہ بنے، اس لیے اس علاقے کا اقتدار پہلے ارغون خاندان کے ہاتھ میں چلا گیا اور بعد میں مغلوں کے ہاتھ میں ۔ انجام کار سندھ کے کلہوڑے اس کے مالک بنے ۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں میر عبداللہ احمد زئی خان قلات کو کلہوڑوں نے قتل کر دیا اور نادر شاہ نے یہ علاقہ تلافی کے لیے بروہیوں کے حوالے کر دیا ۔ پاکستان کے قیام سے قبل یہ علاقہ ریاست قلات [رک بآں] کا حصہ تھا ۔ کچھی کے مشرقی نصف علاقے میں جو قبائل آباد ہیں، یعنی ڈومبکی، اَمرانی اور کَھیڑی وہ برائے نام خانِ قلات کے ماتحت سمجھے جاتے تھے ۔ یہ قبائل اس ریلوے لائن کے مشرق میں ہیں جو جیکب آباد سے کوئٹہ کو جاتی ہے اور سارے صوبے میں سے جنوباً شمالاً گزرتی ہے ۔ لائن کے مغرب میں بھی زیادہ تر بلوچ قبائل ہی آباد ہیں، سوا اس علاقے کے جو شمال میں دھادھر کے قریب ہے، جہاں ایک خانہ بدوش قبیلہ بروہی آباد ہے ۔ یہاں ہر جگہ جاٹ [رک بآں] لوگوں کی بڑی تعداد میں بستیاں ہیں ۔ بڑے بڑے قصبے بالکل نہیں ۔ گنداوہ، شوران، دھادھر، سبی، لاہری [بھاگ اور جھل] اہم مقامات ہیں ۔ [بلوچی [رک بآں] اور بَرَاہُوئی [رک بآں] زبانیں بولی جاتی ہیں، سندھی کا دخل بھی ہے ۔ خانہ بدوش لوگوں کی زبان پشتو ہے ۔ باہمی گفتگو کے لیے اردو استعمال ہوتی ہے] ۔

[آب و ہوا سخت گرم ہے اور بارش کم اور شاذ و نادر ہوتی ہے] ۔ کاشتکاری کے لیے ندیوں اور پہاڑی نالوں سے پانی حاصل کیا جاتا ہے ۔ ناری اور بولان شمال میں، مُولا اور سُکلیجی مغرب میں، اور لاہری اور چھتّر مشرق میں بہنے والے دریا ہیں ۔ مُولا، بولان اور ناری کی وادیاں ان دروں کا کام دیتی ہیں، جن کے ذریعے بالائی علاقوں سے رسل و رسائل اور نقل و حمل کا سلسلہ قدیم الایّام سے قائم ہے ۔ اول الذکر دو وادیوں

میں سے ریل گزرتی ہے، جو بولان اور ہرنائی کے علاقوں میں سے ہوتی ہوئی کوئٹے اور پشین کو جاتی ہے ۔ آبادی منتشر ہے لیکن بلوچستان کے اکثر حصوں کی نسبت زیادہ گنجان ہے ۔

[پاکستان بننے کے بعد علاقے کی پیش رفت کے لیے نئے بند تعمیر ہوے ہیں، مثلاً دھادھر کے جنوب میں بند اللہ یار شاہ، صرف اسی بند سے سالانہ چونتیس ہزار ایکڑ سیراب ہوتے ہیں ۔ دریاے سندھ سے بھی آبپاشی کا انتظام ہے ۔ ان تمام منصوبوں کی وجہ سے قابل کاشت رقبے اور پیداوار میں اضافہ ہوا ہے ۔ گندم، جو اور کپاس کی کاشت ہوتی ہے ۔ کپاس کی کاشت ۱۹۳۲ء میں نہر کرتھار کے کھلنے سے شروع ہوئی تھی ۔ خواندگی بڑھانے کے لیے بالخصوص ۱۹۷۱ء کے بعد بلوچستان بھر میں نئے پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کھولے گئے ہیں ۔ اس سے کچھی کا علاقہ بھی مستفید ہوا ہے ۔ دھادھر اور بھاگ میں ہائی سکول تو ۱۹۵۴ء میں کھل گئے تھے ۔ آمد و رفت کے لیے پختہ سڑک ہے ۔ بسیں دیہات تک بھی جاتی ہیں ۔ خبررسانی کے لیے ریڈیو سیٹ ہیں ۔ بھاگ میں سول ہسپتال ہے اور مختلف مقامات پر ڈسپنسریاں ہیں ۔ سفری ڈسپنسریاں اور صحت کے دیہاتی مراکز بھی ہیں ۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی توجہ کے باعث ترقیات جاری ہیں، سرداری نظام کی منسوخی سے استبداد کا خاتمہ ہو گیا ہے] ۔

مآخذ : (۱) *Census of India 1901 and 1911*، بلوچستان؛ (۲) *Imperial Gazetteer of India*، ۱۹۰۸ء، بذیل مادۂ کچھی؛ [(۳) *Encyclopaedia Britannica*، مطبوعۂ نیویارک ۱۹۷۴ء؛ (۴) *Baluchistan District Gazetteer Series*، ساراوان، کچھی و جھلاوان، بمبئی ۱۹۰۷ء؛ (۵) *Census of Pakistan*، جلد ۳، مغربی پاکستان مردم شماری ۱۹۶۱ء؛ (۶) میر احمد یار خاں بلوچ، *Inside Baluchistan*، کراچی ۳، ۱۹۷۵ء؛ (۷) *Bench-Mark Survey, Kachhi and Harnai Development Areas, Quetta and Kalat Region*، سلسلہ نمبر ۴، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء؛ (۸) *District Census Report* قلات ۱۹۶۱ء؛ نیز [رک بہ بلوچستان، سندھ].

M. LONGWORTH DAMES و [ادارہ]

اَلْکُحْل : اول تو ایک دھات، یعنی کبریت آمیز سرمے (''stibnite'') اور دوسرے کبریتی سیسے (lead sulphide) کا نام؛ ان دونوں کے لیے اِثْمِد کا لفظ بھی مستعمل ہے ۔ اِثْمِد یونانی لفظ στιμμι سے نکلا ہے اور J. Ruska کے بیان کے مطابق antimony اور bismuth کے الفاظ اِثْمِد سے مشتق ہیں ۔ فارسی میں الکحل کو اس جگہ کے نام پر جہاں سے یہ آتا ہے، سرمہ کہا جاتا ہے ۔ عربی میں اس کے مرادفات النحاس المُحَرَّق (جلا ہوا تانبا)، الاصفہانی، کُحل جِلاء، کُحل سلیمان، کُحل اسود، وغیرہ ہیں ۔

اگرچہ صاحب مَفَاتیح العُلُوم (طبع van Vloten، ص ۲۶۲) کُحل کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ اُسْرُب، یعنی سیسے کا جوہر ہے اور ارسطو کی *Petrology* (= حجریات) میں بھی یہ لکھا ہے کہ اثمد میں اسرب پایا جاتا ہے، لیکن بقول E. Seidel (*Mechithar*، عدد ۲۱۵، ص ۱۸۵) وہ اثمد جو کُحل کا مرادف ہے ہمیشہ سرمے کا مرکب (antimonite) ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے قدرتی طور پر التباسات پیدا ہو گئے ہیں ۔ M. Meyerhof کے بیان کے مطابق الکُحل خالص سرمہ (antimony) ہے ۔

حَمْدُ اللہ المُستوفی نے نُزْھَۃ القلوب (طبع Le Strange: سلسلۂ یادگارگب، ۲۳/۲: ۱۹۷) میں ان جگہوں کا ذکر کیا ہے جہاں الکُحل پایا جاتا ہے، یعنی اصفہان میں، دماوند پر اور اندلس میں ۔ کہا

جاتا ہے کہ اندلس میں ہر مہینے کے دوسرے ہفتے میں اس دھات کی خاص طور پر فراوانی ہوتی ہے ۔ اب بھی ایران اور اندلس میں کحل یا کبریت آمیز سرمہ پایا جاتا ہے ۔ ایران میں کچھ پہاڑ ہیں جنھیں کوہ سرمہ کہا جاتا ہے؛ چنانچہ القزوینی بسطہ کے قریب ایک جبل الکحل کا ذکر کرتا ہے (متن، ص ۱۷۱) ۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرمے کو کوٹ کر سیسے کی نسبت زیادہ باریک سفوف بنایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ سیسے کے مقابلے میں بہت زیادہ نرم دھات ہے ۔ چونکہ کحل سے زیادہ تر سنگار کا کام لیا جاتا تھا، لہذا اس سے سنگار کی جو چیز بنی، وہ پہلے اسی نام سے موسوم ہوئی اور پھر اس سے آرائش کی سب چیزیں مراد لی جانے لگیں ۔ چونکہ یہ نہایت باریک پیسا جاتا ہے، لہٰذا عام طور پر اسے بہت باریک سفوف کے معنوں میں بھی بولنے لگے ۔

عورتیں الکحل کو دوسری اشیا سے ملا کر کوٹنے کے بعد اپنی آنکھوں کی زینت کے لیے، نیز ابرو، پلکوں اور پپوٹوں کے کناروں کو سیاہ کرنے کے لیے خاص طور پر استعمال کرتی ہیں ۔ غالباً عربوں نے یہ رسم قدیم مصریوں سے لی ہوگی کیونکہ ان کی اشیاے زینت میں کبریت آمیز سرمہ اکثر پایا گیا ہے (X. Fischer: *Archiv für pharma kologie*، ۲۳۰ (۱۸۹۲ء):۹): لیکن مصریوں کی زینت کی اشیا عام طور پر پسے ہوے کحل الحجر (galena) سے بنائی جاتی ہیں، جس میں اور چیزیں بھی ملی ہوتی ہیں ۔ (M. Meyerhof *Der Bazar der Drogen etc. in Kairo*، *Archiv für Wirtschafts for schung im orient* ۱۹۱۸ء، ۳/۴:۲۱) کے بیان کے مطابق کبریتی سرمہ یاسیسہ (جسے کحل کہتے ہیں) آنکھوں کو خوبصورت بنانے کے لیے بعینہٖ اسی طرح اب بھی قاہرہ میں بکتا ہے جس طرح قدیم زمانے میں بکتا تھا ۔ بہترین سرمہ اب بھی ایران سے آتا ہے (الاصفہانی)۔ وہ سرمہ جسے حاجی لاتے ہیں، بہت مقبول ہے (المکی اور الحجازی) ۔ تہران میں بھی سرمہ سنگار کے طور پر مستعمل ہے ۔ آرائش کی نقلی اشیا میں کحل الحجر اور انزروت (isinglass) شامل ہوتے ہیں ۔ کحل الحجر کے بجاے پنسل کا سرمہ (graphite)، کاجل (بالخصوص جو سستی قسم کے لوبان سے حاصل کیا جاتا ہے) اور قشر بادام سوختہ وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں ۔

مذکورۂ بالا سیاہ مادوں کے علاوہ کچھ اور رنگ بھی کحل کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے ۔ الموفق اپنے "اصول قرابا دین" میں ایک گہرے سیاہ اور ایک ہلکے سیاہ، ایک سیاہ بنفشی، ایک پیازی، ایک بالکل سفید اور ایک زرد رنگ کے کحل کا بھی ذکر کرتا ہے ۔ اس طرح اسم صفت "کحلی" صرف سیاہ رنگ ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام گہرے رنگوں کے مثلاً گہرے نیلے، ارغوانی اور گہرے سرخ رنگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔

الکحل سرمے کے طور پر ایک چھوٹی سی سلائی (میل یا مروند) سے لگایا جاتا ہے، جس کا سرا بعض اوقات گلاب سے تر کر لیتے ہیں ۔ سرمہ ایک مکحلہ (=سرمے دانی) میں رکھا جاتا ہے ۔ لین Lane نے اس کی جو تصویر دی ہے وہ گلاب پاش (bear glass) سے مشابہ ہے ۔ مکحلہ دھوپ گھڑی اور اس مخروطی شکل کو بھی کہتے ہیں جس کا سر کٹا ہوا ہو (دیکھیے E. W. Lane: *Manners and Customs of the Modern Egyptions*، ص ۲۹ ببعد، ۳۰۴؛ E. Wiedemann و J. Würschmidt: *Über eine arabische Kegelförmige Sonnenuhr*، *Archiv. f. Gesch. der Naturwissensch. und Technik*، ۱۹۱۶ء، ۷: ۳۵۹) ۔

الکُحل کا استعمال آنکھوں کی دوا کے طور پر بکثرت ہوتا ہے۔ ابن البیطار اور دیگر مصنفین نے اس موضوع پر بالتفصیل لکھا ہے۔

الجوہری کی کتاب المختار فی کشف الاسرار کے باب "کشف اسرار الکحّالین" میں کئی نقلی کحلوں کا ذکر ملتا ہے؛ اس جگہ الکُحل کا لفظ سرمے کے بجائے آنکھوں کی دوا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

شعرا ان عورتوں کی خاص طور پر تعریف کرتے ہیں جن کی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا ہو یا جو قدرتی طور پر سرمگیں ہوں اور انھیں سرمے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ E. von Lippmann نے اس سلسلے میں المتنبی، حافظ اور فردوسی کے اشعار نقل کیے ہیں۔

Paracelsus نے محض خودرائی سے کام لیتے ہوئے لفظ الکحل کو کوفتہ و بیختہ اور نہایت باریک اور لطیف سفوف کے معنوں میں، جو ہر شراب کے مفہوم میں استعمال کیا، غالباً اس لیے کہ شراب کا بہترین جزو ترکیبی الکحل ہے؛ چنانچہ بعد ازاں یہ نام شراب کے لیے بتدریج استعمال ہونے لگا۔

تقریباً تیرھویں صدی سے پہلے مسلمان روح شراب (= الکحل Alcohol) کو عمل تقطیر سے حاصل نہیں کرسکے تھے کیونکہ مناسب آلات کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان بخارات کو جو الکُحل کے محلول سے خارج ہوتے تھے، منجمد نہیں کر سکتے تھے۔ الکُحل سب سے پہلے غالباً بارھویں صدی میں مغربی یورپ میں بنائی گئی (دیکھیے E. von Lippmann کی تحقیقات، در *Beiträge zur Geschichte der Naturwissenschaften und der Technik*، برلن ۱۹۲۳ء، ص ۵۶ تا ۱۲۷)۔

زمانۂ مابعد (یعنی سولھویں صدی کے نصف آخر) میں مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے سے "عرق" تیار کرنے کی تحریری تفصیل موجود ہے (ابوالفضل علامی: آئین اکبری، مترجمۂ H. Blochmann و J. Jarret، ۱۷۹۳ء، ۱: ۶۹؛ نیز دیکھیے E. Wiedemann، در *Beiträge zur Geschichte des Zuckers*، *Die deutsche Zuckerindustrie Aie*، ۱۹۱۲ء، ص ۳۰۳؛ E. von Lippmann: کتاب مذکور، ص ۱۲۴)۔

الکُحل سے لفظ الکحّال بمعنی، معالج چشم، نکلا ہے۔ اس کے لیے M. Meyerhof کے متعدد مقالوں کے علاوہ دیکھیے J. Hirschberg کا اس موضوع پر مکمل اور جامع بیان، در *Geschichte der Augenheilkunde*، کتاب ثانی: *Gesch. d Augenheil Kunde im Mittelalter* جسے Graefen Saemisch: *Handbuch der allgemeinen Augenheil Kunde*، ج ۱۳، لائپزگ ۱۹۰۸ء، میں شامل کر دیا گیا ہے۔ J. Hirschberg کا خلاصہ یہ ہے:

عرب کحّالین نے جو کام انجام دیا، اس کی اہمیّت کے متعلق مختلف اندازے ہیں۔ ان کی تصانیف کے متعلق ناواقفیت کی وجہ سے اکثر حلقوں میں ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکا، لیکن بہت پہلے یعنی ۱۳۹۰ء ہی میں پیڈوا Padua کے پروفیسر A. Beneditti نے کہا تھا کہ "آج کل کے نہایت ذہین کحّال ایشیا، یعنی شام اور عراق عجم (Media) میں ہیں؛ دیگر ممالک میں، جن میں اٹلی بھی شامل ہے، ایسے نامور اہل کمال کی تعداد بہت ہی کم ہے"۔ پھر تاریخ معالجۂ چشم کا سب سے مستند عالم J. Hirschberg اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ عربوں کا نام امراض چشم کی ادویہ اور جراحی کی تحقیقات کی تاریخ سے کبھی محو نہ ہوگا (کتاب مذکور، ص ۲۴۳)۔

مآخذ: متن میں مذکور ہیں۔

(E. WIEDEMANN)

* **کَخْتا** : (یا کِیَخْتَہ Kiakhta یا کختہ؛ بعض اوقات الکختا)؛ ایک مقام، جو دریاے فرات کے ایک معاون کختا صُو کے کنارے مَلَطِیہ سے ۴۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے ۔ یہ ایک قائم مقام کی سکونت گاہ تھی اور اسی نام کی قضا کا، جو تین ناحیوں (گرگر، شیرو اور میردیس) پر مشتمل تھی، صدر مقام تھا ۔ اس کی کل آبادی چھیالیس ہزار کے لگ بھگ تھی (جس میں بقول Cuinet زیادہ تر کرد تھے اور ان کے علاوہ چار ہزار سے زیادہ ارمن تھے) ۔ کختا صوبۂ مَعْمُورۃ العزیز (خرپوت) کے لواے مَلَطِیہ میں شامل تھا ۔ آج کل کختا میں صرف چند سو جھونپڑیاں نظر آتی ہیں، جہاں ایک ہزار کے قریب باشندے آباد ہیں، جو تقریباً سب کے سب کرد ہیں ۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یہ مقام اپنے انتہائی مستحکم قلعے کی وجہ سے بہت مشہور تھا، جو ایک بلند ڈھلواں چٹان پر بنا ہوا تھا ۔ یہ قلعۂ سُمیساط سے ملطیہ جانے والی مشرق سڑک کی نگہبانی کرتا تھا اور بلاد اسلامیہ کے سرحدی قلعوں (ثُغُور) میں سے تھا ۔ عصر حاضر میں اس نے پھر نئے سرے سے شہرت حاصل کی ہے کیونکہ یہاں نمرود طاغ کے قریب ہی Commagene کے Antiochus اوّل کے آثار برآمد ہوے ہیں، جن کا تعلق پہلی صدی ق ۔ م سے ہے ۔ سب سے پہلے اس کا نام ہمیں صلیبی محاربات کے مشرق مؤرخین کے بیان میں ملتا ہے ۔ Michael Syrus کے ہاں اسے گختہ لکھا ہے ۔ [ابن العبری : مختصر الدول، بیروت ۱۹۵۸ء، ص ۲۵۰، حاشیہ، میں کاختا درج ہے، متن کے 'کاختین' کا واحد] ۔ اس کے قدیم اور بوزنطی نام معلوم نہیں ہو سکے، لیکن کختا میں ۲۰۰ء کے قریب، Septimius Severus کے عہد میں، بولام صُو پر جو پل بنایا گیا تھا اس سے اور قلعے میں بوزنطی عمارات کے بچے کھچے آثار سے یہ پتا چلتا ہے کہ عہد قدیم اور ازمنۂ وُسطیٰ کے ابتدائی ایام میں بھی یہ مقام ایک اہم سرحدی مستقر تھا ۔ Ainsworth کا یہ مفروضہ قابل قبول نہیں کہ کختا وہی پرانا شہر Claudias ہے جسے عرب قَلَوْذِیَہ (رک بآں) کہتے تھے ۔

۱۹ اگست ۱۰۷۱ء کو مَلَا زجِرْد کی لڑائی ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سرحدی اضلاع ہمیشہ کے لیے بوزنطی سلطنت سے نکل گئے اور ملطیہ کے دانشمند اوغلو، روم کے سلجوق اور خرپوت کے ارتقی فرمانرواؤں (جو کختا پر قابض ہونے کے لیے باہم دست و گریبان تھے) اور صلیبیوں (جو اَلرّھا اور مَرعَش کے حکمران تھے) کے درمیان گوے بازی بن کر رہ گئے ۔ اسی زمانے میں ارمنوں نے، جو گیارھویں صدی کے نصف آخر تک کافی تعداد میں ان علاقوں میں نقل مکانی کر آئے تھے، مَلَطِیہ، حصْن مَنصُور، گرگر اور کختا جیسے مستحکم مقامات میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا (Michael Syrus، طبع Chabot، ۳ : ۱۵۸ ببعد، ۱۹۸، ۲۰۵ ببعد) اور قرب و جوار کے مسلمان فرمانرواؤں کے مقابلے میں ڈٹے رہے ۔ کختا کے قلعے کا ایک کتبہ، جو ۵۲۵ھ/۱۱۳۰-۱۱۳۱ء میں لکھا گیا تھا، اسی زمانے کا ہے ۔ اس میں ایک شخص ملک المنصور کا ذکر ہے کہ اس نے دفاعی مورچوں کو دوبارہ بنوایا تھا (O. Hamdy Bey : *Le Tumulus de Nemroud Dagh*، ص ۲ ببعد)؛ [لیکن Cl. Cahen نے اس کی تردید کرتے ہوے بتایا ہے کہ یہ کتبہ دراصل ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء کا ہے (Cl. Cahen، لائیڈن، بار دوم، ۴ : ۳۶۴)] ۔

مرعش کا فرمانروا (Count) بالڈوِن Baldwin اور اس کا جانشین رینالڈ Reinaud یکے بعد دیگرے تھوڑے ہی عرصے میں نورالدّین سے برسرپیکار ہو کر جان گنوا بیٹھے تو اَلرّھا کے جنگجو حکمران

جوسلین Joscelin نے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، جن میں گرگر اور کختا بھی شامل تھے۔ مئی ۱۱۵۰ء میں وہ بھی نورالدین کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور کختا اور اس کے قرب و جوار کے قلعے، مثلاً گرگر، حصن منصور، وغیرہ خرپوت کے قرا ارسلان کے ہاتھ لگے۔ کختا کے آخری ارمن فرمانروا کرکور (Krikor) کو فاتح نے ایک اور ضلع عطا کر دیا (Michael Syrus، ۳ : ۲۹۴ ببعد؛ Chalaudan : *Les Comnène*، ۲ : ۴۲۱، ۴۲۳)۔ اس طرح ان علاقوں میں عیسائی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۵۔ اکتوبر ۱۱۷۷ء کو سلطان قِلِیْج اَرْسَلان نے ملطیہ فتح کیا اور آخری دانشمند اوغلو حکمران کو نکال باہر کیا، جو خرپوت کی جانب بھاگ گیا (Michael Syrus، ۳ : ۲۷۳)؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک سرحدی قلعوں، مثلاً حصن منصور، کختا، وغیرہ پر سلاجقہ کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔

۱۲۲۶/۵۶۲۳ء میں علاء الدین کیقباد [رک بہ کیقباد اوّل] اور آمد اور ماردین کے اُرتقی فرمانروا مسعود سے لڑائی چھڑ گئی۔ اسی سال شوّال کے مہینے میں مسعود اور اس کے حلیفوں نے کختا کے مقام پر شکست فاش کھائی اور یہ قلعہ، جو اب تک مسعود کے زیرنگیں تھا، فاتح کے ہاتھ آ گیا (ابن الاثیر : طبع Tornberg، ۱۲ : ۳۰۰؛ ابوالفداء : تاریخ، مطبوعۂ قسطنطنیہ، ۳ : ۱۴۴؛ Houtsma : *Recueil etc.*، ۳ : ۲۸۰ و ۴ : ۱۱۸ ببعد)۔ اس کے بعد یہ سلاجقۂ روم کے قبضے میں رہا حتّٰی کہ اس زمانے میں بھی جب، وہ ایلخانیوں کے باجگزار بن چکے تھے۔ بابا رسول اللہ کی بغاوت (۱۲۴۰-۱۲۴۱/۶۳۸ء) کے دوران میں اس جنونی شخص کے مریدوں نے کختا اور اس کے گردو نواح کے علاقے کو خوب لوٹا (Bar Hebraeus : *Kᵉtābā dᵉ Makṭᵉbānūt Zabnè*، طبع Bedjan، ص ۴۷۳؛ *Chronik*، طبع Bruns و Kirsch، ۲ : ۵۱۷ = تاریخ مختصر الدول، طبع صالحانی، بیروت ۱۸۹۰ء، ص ۴۳۹)۔ اس سے چند سال قبل روم سے نکالے ہوئے خوارزمی یہاں تاخت و تاراج کر چکے تھے (Bar Hebraeus : تاریخ وغیرہ، ص ۴۳۷ ببعد)؛ بعد ازاں کیکاؤس دوم کے عہد میں وقتاً فوقتاً جلا وطنی کی سزا پانے والوں کو یہاں بھیجا جاتا رہا (Houtsma : *Recueil*، وغیرہ، ۴ : ۲۵۹، ۲۶۲)۔ علاوہ ازیں اس کا ذکر اور سلسلوں میں بھی ملتا ہے (Bar-Hebraeus : کتاب مذکور، ص ۴۹۹، س ۱۴ = تاریخ وغیرہ، ص ۴۶۷ ببعد، بذیل ۱۲۵۷ء)۔ بقول منجم باشی (تاریخ، ۳ : ۲۷۱) قونیہ کے آخری علاء الدین نے عثمان کے ایک بیٹے اور ارطغرل کے پوتے کو کختا کے قریب پیْغی اِلی میں ایک جاگیر عطا کی تھی اور اِرتِنَہ، جو ایشیائے کوچک میں ایلخانیوں کے عامل کی حیثیت سے (۱۳۲۸/۷۲۸ء تا ۱۳۵۲/۷۵۳ء) اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکا تھا، ملطیہ کے علاقے پر حکومت کرتا تھا (ارتنہ کے بارے میں دیکھیے M. Von Berchem و Halil Edhem : *Matériaux pour un Corpus Inscr. Arabicarum*، قاہرہ ۱۹۱۰ء، ص ۴۱ ببعد)۔ مغول کے خلاف مصر کے مملوک سلاطین کی مہمات کے دوران میں کختا کا ذکر بار بار آتا ہے (المقریزی : السلوک لمعرفۃ دول الملوک؛ فرانسیسی، ترجمہ از Quatrèmere : *Hist. des Sultans Mamelouks*، ۱/۲ : ۶۱)۔

۱۲۸۳-۱۲۸۴/۶۸۲ء میں حلب کے مصری عامل قَراسُنْقُر نے شہر پر قبضہ کر لیا اور یہاں از سر نو بڑی مستحکم مورچہ بندی کی (المقریزی : کتاب مذکور؛ ابوالفداء : تاریخ، ۴ : ۱۸)۔ یہی وجہ ہے کہ یکم ربیع الآخر ۶۸۴ء کو آرمینیای کوچک کے بادشاہ لیون Leon سے معاہدے

میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ یہ سلطان قلاوون کے علاقے میں شامل ہے (المقریزی: کتاب مذکور، ۲/۱: ۱۶۸)؛ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ چند دوسرے مقامات کے ساتھ کختا عارضی طور پر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵-۱۳۱۶ء میں مغول کے خلاف مصری مہم کے سلسلے میں، جس کے دوران میں مملوکوں نے ملطیہ فتح کرکے اسے تباہ و برباد کیا، کہا جاتا ہے کہ قَلْعَۃ الرُّوم، بہسنا، کختا اور گرگر کے باشندے مسلمانوں کے علاقے میں دھاوے مارا کرتے تھے (ابوالفداء: کتاب مذکور، ۴: ۷۷)۔ آگے چل کر یہ علاقہ ترکوں کی پہلی فتح کے زمانے تک ضرور مرعش کے ذوالقدر اوغلو کے ماتحت رہا ہوگا، جو مملوک سلاطین کے باجگزار تھے۔ جب بایزید اوّل نے ۸۰۱ھ/۱۳۹۷-۱۳۹۸ء میں (مصری ماخذ کی رو سے ۸۰۰ھ میں، دیکھیے Weil: *Gesch. der Chalifen*، ۵: ۷۰، ۷۴؛ نشری، در *Zeitschr.d. Deutsch.Morgenl.Gesellsch.*، ۱۵: ۴۵۲؛ قدیم عثمانی وقائع نگاروں کی رو سے ۷۹۸ھ میں دیکھیے Leunclavius: *Histor. Musulm*، عمود ۳۳۷ س ۲۴ ببعد، ۳۳۸، س ۱۷ ببعد و طبع Giese، ص ۳۴ ببعد؛ نیز عاشق پاشا زادہ: تاریخ، ص ۴۷) مصر کے خلاف جنگ و جدل کا آغاز کیا تو اس نے سب سے پہلے ملطیہ پر قبضہ کرکے وہاں سے ترکمانوں، یعنی ذوالقدر اوغلو کو، جو اب تک وہاں حکومت کر رہا تھا، نکال دیا۔ ۸۰۳ھ/۱۴۰۰-۱۴۰۱ء کے ابتدائی مہینوں میں امیر تیمور نے شام پر لشکر کشی کے دوران میں ملطیہ اور گرد کا سارا علاقہ کختا تک فتح کر لیا، بایزید کی متعینہ فوج کو نکال باہر کیا اور "ترکمان" قرہ عثمان کو یہاں مامور کر دیا (شرف الدّین علی یزدی: ظفر نامہ، مطبوعۂ کلکتہ، ۲: ۲۷۱ ببعد، ۲۷۸؛ Weil: کتاب مذکور، ۵: ۸۲)۔ تیمور کی واپسی کے بعد مملوک سلاطین پھر اس علاقے میں داخل ہوگئے اور برابر اس پر قابض رہے تاآنکہ سلطان سلیم اوّل نے ان کا سارا اقتدار ملیا میٹ کر دیا۔ اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے ۸۲۰ھ/۱۴۱۷-۱۴۱۸ء میں کختا فتح کیا (المقریزی: کتاب مذکور، ۲/۱: ۶۱ حاشیہ؛ Weil، ص ۱۳۹)۔ ابن ایاس: بدائع الظہور، قاہرہ ۱۳۱۱ھ، ۲: ۱۴۱، میں لکھا ہے کہ ۸۷۷ھ/۱۴۷۲-۱۴۷۳ء میں اوزون حسن نے یہ قلعہ تسخیر کیا۔ حلب کے بارے میں اپنے فتح نامہ (آخر ماہ رجب ۹۲۲ھ) میں سلیم اوّل خاص طور پر گرگر اور کختا کی فتح کا ذکر کرتا ہے۔ ترکوں کی حکومت میں سرحدی قلعے کی حیثیت سے کختا کی وہ اہمیت نہ رہی جو اسے ازمنۂ وسطیٰ میں حاصل تھی اور جس کا تذکرہ ابوالفداء (تقویم، طبع Reinaud، ص ۲۶۲ ببعد) اور الدمشقی (طبع Mehren، ص ۲۰۶) خاص طور پر کرتے ہیں۔ جلال زادہ نے (سولھویں صدی کے وسط میں) سلطنت عثمانیہ کا ذکر کرتے ہوئے گرگر اور کختا کے اضلاع کے بیان میں اس کے لیے ایک پورا باب مخصوص کیا ہے (von Hammer: *Des Osm. Reiches Staats-verf*، ۲: ۴۴۹)؛ اولیا کے یہاں بھی اس کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے (سیاحت نامہ، ۴: ۲۲)، لیکن سترھویں صدی کی بلند پایہ تصنیفات جغرافیہ (یعنی محمّد عاشق: مناظر العوالم ورق ۱۷۶، مخطوطۂ وی‌انا؛ کاتب چلبی: جہان نما، قسطنطینیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۶۰۰ ببعد) سے پتا چلتا ہے کہ کختا کے بارے میں ان کی معلومات صرف ابوالفداء تک محدود ہیں، جس کے بیانات کا انھوں نے لفظ بلفظ ترجمہ کر دیا ہے۔ آناطولی کی قضاؤں میں کختا کو ساتویں درجے کی بیرونی چوکیوں میں رکھا گیا ہے (v. Hammer: *Gesch. d. Osm. Reiches*، ۹: ۸، شمارہ ۴۷۰)۔ گزشتہ تین صدیوں میں ان دُور افتادہ اور ناقابل گزر اضلاع

میں کرد آباد ہوگئے ہیں۔ کاتب چلبی (کتاب مذکور) ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ رھزن ڈاکوؤں کی ایک باغی، شورش پسند اور ناکارہ جماعت ہے۔ وہ صرف اپنے سرداروں (بای بیگلری) کے اطاعت گزار ہیں اور جن علاقوں میں وہ آباد تھے وہاں باب عالی کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے گزشتہ صدی میں بار بار فوجی مہمیں بھیجنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان لڑائیوں میں کختا کے قلعے نے بھی حصہ لیا کیونکہ ایک کُرد بے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں حصار بند ہوکر بیٹھ رہا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں ترکی دستوں نے اس پر یلغار کی اور اسی واقعے نے Ainsworth اور v. Moltke کی روئدادوں کے ذریعے اسے سارے یورپ میں مشہور کر دیا (دیکھیے C. Ritter : *Erdkunde*، ۱۰: ۸۷۰، ۸۷۴، ۸۸۳ ببعد)۔ ابھی قلعے کے آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام باقی ہے۔ ۱۸۸۳ء کی ترکی مہم کے بارے میں حمدی بے کی تصنیف کے اندر مختصر سا ذکر ملتا ہے۔ اس نے اسلامی کتبات کی جانب خاص طور پر توجہ کی ہے (یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں)۔ خرپوت کے سالنامے میں اس کے بیانات بالتفصیل بطور تتمہ درج کیے گئے ہیں۔ عظیم الشان آہنی دروازہ، جس کا ذکر ۱۲۳۶ء میں سلجوقوں کی فتح کے سلسلے میں بھی ملتا ہے، ۱۸۸۲ء میں قلعۂ گرگر کے دروازے کے ساتھ دیاربکر میں لایا گیا [مزید معلومات کے لیے دیکھیے (۱)، لائیڈن، بار دوم، بذیل مادّہ]۔

مآخذ: (مندرجۂ ذیل کا ذکر اوپر نہیں آیا):
(۱) W. F. Ainsworth: *Travels and Researches in Asia Minor, Mesopotamia*، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱: ۲۵۶ ببعد؛ (۲) O. Hamdy Bey و Osgan Efendi: *Le Tumulus de Nemroud-Dagh*، قسطنطنیہ ۱۸۸۳ء، مع فوٹو گراف؛ (۳) Humann و Puchstein: *Reisen in Kleinasien und Nordsyrien*، برلن ۱۸۹۰ء، مع تصاویر؛ (۴) Vincent W. Yorke: *Geographical Journal*، ج ۸ (۱۸۹۶ء)؛ (۵) سالنامہ، ولایت مَعْمُورَۃ العزیز، بابت ۱۳۰۵ھ؛ (۶) Cuinet: *La Turquie d' Asie*، ۲: ۳۷۹ ببعد؛ (۷) F. Chalandon: *Les Comnène*، ج ۲، پیرس ۱۹۱۲ء، بمواضع کثیرہ: (۸) J. Laurent: *Byzance et les Turcs Seldjoucides dans l' Asie Occidentale Jusqu'en 1081*، پیرس - نینسی ۱۹۱۳ء، بمواضع کثیرہ؛ [(۹) ابن الأثیر، ۱۲: ۴۵۸؛ (۱۰) ابن بی بی، مترجمۂ H. Duda، ص ۱۲۲ ببعد، ۲۴۸ ببعد؛ (۱۱) ابن تغری بردی، مترجمۂ Popper، ۶: ۳۶۷ ببعد، ۵۹۴؛ (۱۲) ابن ایاس، مترجمۂ Wiet، ۱: ۲۶۷؛ (۱۳) اولیا چلبی، ۴: ۲۲].

(J. H. MORDTMANN)

(۲) ایک شہر جو ماورائے بیکال (Trans-baikalia) کے علاقے میں، ۳۰ درجے ۱۹ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۰۶ درجے ۴۰ دقیقے طول بلد جنوبی پر سطح سمندر، سے ۲۵۵۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ایک پچاس گز چوڑا آزاد غیر جانبدار علاقہ کختا کو مَیمچِن (Dai Oergö) سے جدا کرتا ہے اور تقریباً ساڑھے تین ورسٹ (verst) لمبی اس ضلع کی واحد شاہراہ اسے Trioskosawsk سے ملاتی ہے۔ کختا ندی (مغولی: ککتو گورخون) کے کنارے اور پہاڑوں (بَرگُلتی Burgultei = کوہ عقاب) سے گھرا ہوا شہر کختا ایک روسی سرحدی چوکی سے ظہور میں آیا ہے، جو کختا ندی کے جنوب میں رورو (Roro) ندی پر واقع تھی۔ یہ ندی سرحد کا کام دیتی ہے اور اسے اس وجہ سے شہرت نصیب ہوئی کہ یہاں ۱۰ اگست ۱۷۲۷ء کو معاہدۂ کختا پر دستخط ہوے تھے۔ چینیوں نے روس اور چین کے درمیان تجارت کے لیے اس جگہ کو مرکز بنایا اور چینیوں نے یہاں میمچن (تجارتی سرحد) اور روسیوں نے کختا کی سرحدی چوکی قائم کی۔ اس

زمانے سے کختا منگولیا اور چین میں علوم، سیاست، تجارت (چاے کی تجارت) اور باهمی راہ و رسم کے داخل ہونے اور ان ممالک کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے ایک "غلام گردش" کا کام دیتا ہے ۔ مضبوط کٹہروں کے ذریعے محفوظ کیا ہوا یہ مقام آج تک سوداگروں کی ایک چھوٹی سی اپنی مملکت ہے، جس کے اندر اپنا ٹیکس (چاے کا ٹیکس) ہے، اپنے رسم و رواج ہیں اور اپنا نظام حکومت ہے، اپنے ممتاز نمائندوں کی مشاورتی مجلس ہے، آگ بجھانے کا انجن ہے اور گرجا ہے ۔ پتھر کے بنے ہوے مکانوں کے علاوہ کختا میں چوبی عمارتیں اور بڑی بڑی تجارتی عمارات ہیں، جن میں قافلوں کے لیے وسیع صحن بنے ہوے ہیں، لیکن دکان کوئی نہیں ہے ۔ روس کے ساتھ تھوک تجارت کے علاوہ مغولوں اور چینیوں کے درمیان چھوٹی تجارت بھی ہوتی ہے ۔ ۱۷۲۷ء سے دسمبر کا مشہور میلا ہر سال کختا میں منعقد ہوتا ہے ۔ قافلے کی چاے کے نام سے جو چاے مشہور ہے اس کا سب سے بڑا گودام اور اس کی برآمد کا مرکز کختا ہے ۔ ایک زمانے میں یہاں سے ریوند چینی کی ناجائز طریقے سے روس میں درآمد ہوتی تھی ۔ آج کل چین میں سونا چوری چھپے لے جایا جاتا ہے ۔ معاهدۂ پیکن (۱۸۹۸ء) ہو جانے اور سائبیریا کی مشہور ریل کے چلنے کی وجہ سے چاے، ریشم اور سوتی سامان کی درآمد کافی گھٹ گئی ہے، البتہ کپڑے سمور اور چمڑے کی تجارت نسبتہً زیادہ ہوتی ہے ۔ یہاں ایک صحرائی ڈاک خانہ اور تار گھر قائم ہے اور اُرگہ (Urga) کے راستے پیکن کو خطوط اور تار بھیجے جا سکتے ہیں .

مآخذ : (۱) *Meng-Ku-Yu Mu-Ki*، مترجمۂ P. S. Popow، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۵ء، ص ۶۸، ۳۳۶، ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۳۵۹؛ (۲) Pallas : *Reise d. verschiedene Provinzen d. Russ.' Reichs* سینٹ پیٹرز برگ ۱۷۷۲-۱۷۷۳ء، ۳ : ۱۰۹ تا ۱۱۲؛ (۳) Ritter : *Asien*، برلن ۱۸۳۲ء، حصہ ۲/کتاب ۲ : ۱۰۲ تا ۱۱۱ (قدیم سفر ناموں کی تفصیل)، ۱۲۰؛ (۴) Jakynth : *Zapiski o Mongolii*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۲۸ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵؛ (۵) Timkowski : *Reise n. China*، لائپزگ ۱۸۲۵ء، ۱ : ۱۹ تا ۲۰ و ۳ : ۱۴۳؛ (۶) *Inscription de l' Expèdition Finnoise 1890* : *Orkhon*، هلسنگفورس ۱۸۹۲ء، ص iii؛ (۷) W. Obrutschew : *Aus China*، لائپزگ ۱۸۹۶ء، ص ۱۲ تا ۱۷؛ (۸) Wenyukow : *Die russ.-asiat. Grenz-lande*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ص ۱۸۰ ببعد، ۲۰۰ ببعد، ۲۱۰؛ (۹) Wilda : *Von Hongkong nach Moskau*، Altenburg ۱۹۰۲ء، ص ۲۸۶ تا ۲۹۶؛ (۱۰) Consten : *Weideplätze d. Mongolen*، برلن ۱۹۱۹ - ۱۹۲۰ء؛ (۱۱) Perry : *With the Russians in Mongolia*، لنڈن ۱۹۱۳ء، بمدد اشاریہ، ص ۳۳۵؛ (۱۲) Prschewalski : *Mongolia i strana Tangutow*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء، ۱ : ۱ تا ۵؛ (۱۳) وهی مصنف : *Reisen in der Mongolei*، Jena ۱۸۷۷ء، ص ۱ تا ۶، xxx؛ (۱۴) وهی مصنف : *Ot K'iachty na istok' rieki*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۸ء، ص ۷۰ تا ۷۳؛ (۱۵) Bogolepow : *Očerki Russko-Mongolskoi Torgowli*، Tomsk ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۵؛ (۱۶) وهی مصنف : *Moskowskaya Torgowaya ekspediciya w Mongoliyu*، ماسکو ۱۹۱۲ء؛ (۱۷) H. P. Lw'ecnikow : *Russkiye w Mongolii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۲ء، ص ۱۸، ۳۲، ۳۳، ۴۵ تا ۵۰؛ (۱۸) J. Maiski : *Sororennaya Mongoliya*، Irkutsk ۱۹۲۳ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۶؛ (۱۹) A. Palladiya : *Dorozhniya Zamyetki na puti po Mongolii 1847 i 1859*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۲ء، ص ۸۰

(H. CONSTEN)

* **کُدُمّل** : ایک چھوٹا سا آتش فشانی جزیرہ، جو بحیرۂ قلزم میں ۱۷ درجے ۵۲ دقیقے عرض بلد شمالی پر واقع ہے ۔ انگریزی وزارت بحریہ کے نقشوں میں اس کا نام Kotumble کی شکل میں درج ہے ۔ اس جزیرے میں قسم قسم کے پھول پودے کثرت سے پائے جاتے ہیں، جن کا مطالعہ ماہر نباتات اہرن برگ Ehrenberg نے کیا ہے ۔ یہ جزیرہ اپنی لوہے کی کانوں کے لیے بھی قابل ذکر ہے، جن کا ذکر ابن المُجَاور (م ۶۳۰ھ) تک کے قدیم عہد میں بھی ملتا ہے ۔ کُدُمّل کا یہ سنگلاخ جزیرہ ساحل عرب پر حَمِدَہ کے قریب واقع ہے اور کسی زمانے میں سر زمین کنانۃ اور یمن کے مابین سرحد کی نشان دہی کرتا تھا ۔

مآخذ : (۱) الہَمدانی: صِفَۃ جزیرۃ العرب، طبع D. H. Müller، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء، ص ۵۱؛ (۲) C. Ritter : *Die Erdkunde von Asien*، برلن ۱۸۴۶ء، ۱/۸ : ۱۰۲۳؛ (۳) A. Sprenger : *Die Post-und Reiserouten des Orients*، در Abhandl. f. d. *Kunde des Morgenlandes*، لائپزگ ۱۸۶۴ء، ۳/۳ : ۱۳۳؛ (۴) وہی مصنف: *Die alte Geograph. Arabiens*، برن ۱۸۷۵ء، ص ۳۲؛ (۵) A. Grohmann : *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، در *Osten und Orient*، ج ۱ : R. Geyer و H. übersberger، طبع Forschungen، I. Reihe، Bd. ۴، Wien ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۸ .

(ADOLF GROHMANN)

* **کُر** : روسی میں کُرہ Kura، عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں قفقاز کا سب سے طویل دریا، جس کی لمبائی ۶۰۰ میل سے زیادہ اور بقول حَمْد اللہ القَزْوِینی (نُزْھَۃُ الْقُلُوب (سلسلۂ یادگار گب)، ۱ : ۲۱۸) ۲۰۰ فرسخ ہے ۔ الاصْطَخْری، (در *BGA*، ۱ : ۱۸۹) بیان کرتا ہے کہ یہاں کشتی رانی ہو سکتی ہے اور اس میں بکثرت مچھلیاں ہیں ۔ آج بھی اس دریا میں مِنگچَور Mingecaur (اَلْاَزَن Alazan کے دہانے سے ذرا نیچے) سے بحیرۂ خَزَر تک جدید دخانی جہاز چلانے کے لیے صرف تھوڑی سی کمی پوری کرنے کی حاجت ہوگی ۔ دریائے سیحُوں کو، جو قدیم زمانے میں ایک علٰحدہ دریا متصور ہوتا تھا اسلامی مآخذ میں ہمیشہ کُر کا معاون دکھایا گیا ہے ۔ بقول حَمْد اللہ القَزْوِینی (کتاب مذکور) اُن دنوں بحیرۂ خزر میں کُر کے دہانے کے علاوہ اس کی ایک شاخ باہر نکل کر بحیرۂ شَمْکُور میں جا گرتی تھی: یہ بیان (جو محض یہیں ملتا ہے) لازمی طور پر کسی غلط فہمی پر مبنی ہوگا ۔ حَمْد اللہ القزوینی کے ہاں ہمیں کسی ایسے بحیرے کا ذکر نہیں ملتا ۔ اس نے صرف ایک قصبہ شَمْکُور (روسی : شَمْخور) کا ذکر کیا ہے، جو گنجہ سے تفلس جانے والی سڑک سے دو فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا (کتاب مذکور، ص ۱۸۱ ببعد) اور جو آج کی طرح اس کے زمانے میں بھی کھنڈر ہو چکا تھا ۔ کُر میں جہاز رانی سے سیاسی تاریخ میں صرف ایک ہی دفعہ کام لیا گیا، یعنی جب ۳۳۲ھ/۹۴۳-۹۴۴ء میں روسیوں نے بَرْذَعہ کے قصبے کو تباہ و برباد کیا تھا (رک بہ برذعہ؛ نیز دیکھیے (۱) D.S. Margoliouth : *The Russian Seizure of Bardha'a in 943 A.D.*، در *Bull. of the School of Oriental Studies*، ۱۹۱۸ء، ص ۸۲ ببعد؛ (۲) A. Yakubovskiy : *Ibn Miska-veikh o pokhode Rusov v Berdaa v 332g. = 943/4g*، یعنی *Vremennik*، ۱۹۲۳-۱۹۲۶ء، ۲۴ : ۶۳ ببعد).

مآخذ : (۱) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۷۹؛ (۲) E. Weidenbaum : *Putevoditel' po Kavkazu*، تفلس ۱۸۸۸ء، ص ۱۳ ببعد؛

(W. BARTHOLD)

* **الکَرَبِیسی** : یعنی بزّاز؛ متعدد عرب مصنفین کی نسبت جن کے نام یہ ہیں : (۱) ریاضی دان

احمد بن عمر، جس کی تاریخ وفات معلوم نہیں اور جس کی تصنیفات میں اقلیدس کے ترجمے کی ایک شرح خاص طور پر مشہور ہے (دیکھیے الفہرست، ص ۲۶۵ س ۲۵، ص ۲۸۲ س ۳؛ ابن القفطی: تاریخ الحکماء، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۵۷ س ۵).

اس کی صرف ایک تصنیف ہم تک پہنچی ہے، یعنی کتاب مساحۃ الحلق (اوکسفرڈ و قاہرہ میں مخطوطات، دیکھیے *Bibl. Bodl. Codd. Mss. Or.*، ج ۱، عدد ۹۱۳؛ اور فہرسۃ الکتب العربیۃ فی کتبخانۃ الخدیویۃ، ۵ : ۲۰۴).

(۲) محدث اور فقیہ ابو علی الحسین بن علی بن یزید المُہَلَّبی، جس کا شروع میں اہل الرّائے سے تعلق تھا، لیکن جب امام شافعیؒ بغداد میں آئے تو ان سے وابستہ ہوگیا - بایں ہمہ وہ عقیدۂ جبر کا پورا حامی بھی رہا - رجال حدیث اور فقہ کی تنقید پر اس کی تصانیف میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچی - اس نے ۲۴۵ھ/۸۵۹ء میں اور بعض کے نزدیک ۲۴۸ھ/۸۶۲ء میں وفات پائی.

مآخذ: (۱) [ابن ندیم]: الفہرست، طبع فلوگل، ص ۱۸۱ س ۴؛ (۲) السمعانی: الانساب، طبع عکسی از Margoliouth، سلسلۂ یادگار گب، جلد ۲۰، ۱۹۱۲ء، ورق ۴۷۶ ب؛ (۳) ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld، عدد ۱۸۰ و قاہرہ ۱۲۹۹ھ، ۱ : ۱۸۱؛ (۴) الشّہرستانی: الملل، طبع Cureton، ص ۹۶؛ (۵) النّووی: تہذیب، طبع Wüstenfeld، ص ۴۷۷؛ (۶) السّبکی: طبقات، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱ : ۲۵۱ تا ۲۵۶؛ (۷) ابن الأثیر: الکامل، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، ۷: ۲۹؛ (۸) ابوالفداء: تاریخ، قسطنطنیہ ۱۲۸۷ھ، ۲: ۴۳۹ و طبع Reiske-Adler، ۲ : ۲۰۴؛ (۹) ابن تَغْری بُردی، طبع Juynboll، ۱ : ۷۵۳، ۷۶۳.

(۳) حنفی فقیہ اَسْعَد بن محمّد (م ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء)؛ اس کی کتاب الفُروق فی الفروع کا، جسے حاجی خلیفۃ (کَشْف الظّنون، طبع فلوگل، ۴ : ۴۱۹، عدد ۹۰۴۱) نے المحبوبی کی تَلْقِیح العُقول (براکلمان، ۱ : ۳۸۰، عدد ۳۴) سے ملتبس کر دیا ہے، ایک نسخہ قاہرہ میں محفوظ ہے - (دیکھیے فہرسۃ الکتب العربیۃ فی الکتب خانۃ الخدیویۃ، ۳ : ۹۶).

(C. BROCKELMANN)

کراچی: [پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور ⊗ بہترین بندرگاہ، جو دریاے سندھ کے ڈیلٹا کے عین شمال مغرب میں بحیرۂ عرب کے کنارے ۲۴ درجے ۵۱ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۶۷ درجے ۴ دقیقے طول بلد مشرق پر واقع ہے - یہ صوبۂ سندھ کے اسی نام کے ضلع اور قسمت کا صدر مقام اور ملک کا تجارتی و صنعتی مرکز اور بین الاقوامی فضائی مستقر ہے - خاص شہر کا رقبہ ۲۲۸ مربع میل اور عظیم کراچی کا رقبہ ۵۶۰ مربع میل ہوگا - ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی ۱۰۶۸۴۵۹ تھی، جو ۱۹۶۱ء میں بڑھ کر ۱۹۱۳۵۹۸ ہوگئی - اب یہ تیس لاکھ سے متجاوز ہوچکی ہے].

کراچی کے نام کا تعلق زیادہ قدیم زمانے سے نہیں ہے - شہر کے لوگوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ کوئی دو سو برس ہوے یہ صرف ماہی گیروں کی ایک بستی تھی، جہاں کُلاچی نامی ایک عورت حکمران تھی اور یہ بستی اسی کے نام سے موسوم تھی - یہ نام بعد میں "کراچی" کی صورت میں بدل گیا؛ لیکن دراصل نام کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں بلوچوں کا ایک قبیلہ، جسے کُلاچی کہتے تھے، آباد ہوگیا تھا - یہ لوگ اصل میں راجپوت تھے، (دیکھیے *Glossary of Punjab Castes*، لاہور ۱۹۱۱ء)؛ صوبۂ سرحد کے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک قصبے کُلاچی کی وجہ تسمیہ بھی غالباً یہی ہے - سندھی زبان کے عام دستور کے مطابق کُلاچی کا لام، رے میں تبدیل ہو کر "کراچی" بن گیا (دیکھیے پنجابی: کوٹلی، اور سندھی: کوٹری).

تاریخی پس منظر : [ایک عام روایت یہ بھی ہے کہ کراچی وہی مقام ہے جو محمّد بن قاسم کی آمد کے وقت دیبل کے نام سے مشہور تھا ۔ دیبل کے معنی ہیں مندر اور یہ شہر اس مندر کے باعث دیبل کہلاتا تھا جو آج بھی منوڑا میں واقع ہے ۔ سیٹھ ناؤ مل ہوت چند کا بیان ہے کہ کراچی سے ۱۶ میل مغرب میں دریاے ہب کے دوسرے کنارے پر ایک بندرگاہ کھڑک بندر واقع تھی، جہاں اٹھارھویں صدی کے اوائل میں سیٹھ ناؤ مل کے دادا سیٹھ بھوجو مل کا شمار بڑے تاجروں میں ہوتا تھا ۔ جب یہ بندرگاہ ریت سے اٹ جانے کے باعث ناکارہ ہوگئی تو سیٹھ بھوجو مل اور اس کے ساتھی نئی بندرگاہ کی تلاش میں نکلے اور ماہی گیروں کی اس بستی میں منتقل ہو گئے جو ان دنوں "کلاچی جو گوٹھ" کہلاتی تھی ۔ تاجروں کی آمد سے یہ بندرگاہ ترقی کرنے لگی اور جب ایک اور نواحی بندرگاہ شاہ بندر میں بھی کیچڑ آ گئی تو وہاں کے لوگ بھی یہاں چلے آئے اور اس مقام کی رونق میں اور بھی اضافہ ہو گیا ۔ مانک پتھو والا کو اس سے اختلاف ہے ۔ کیونکہ] کھڑک خلیج فارس میں ایک جزیرہ ہے، جس پر ولندیزی ۱۶۴۸ سے لے کر ۱۷۶۵ء تک قابض رہے اور یہ کسی طرح کراچی پر اثرانداز نہ ہو سکتا تھا ۔ رہا شاہ بندر، تو وہ تو سندھ ڈیلٹا کی مشرقی جانب سے اتنا دور ہے کہ اس کا کوئی اثر کراچی پر پڑ ہی نہیں سکتا ۔ اصلی سبب یہ تھا کہ دیول اور سندی (مشمولہ طور پر دیول سندی بھی مذکور ہے) کی دونوں بندرگاہیں، جو دریاے سندھ کے مغربی دہانے پر واقع تھیں آہستہ آہستہ بیکار ہو رہی تھیں ۔ یہ بندرگاہیں Thevenot (*Travels in India*، ۱۶۷۸ء) کے وقت میں بھی استعمال ہوا کرتی تھیں اور منوچی Manucci ۱۶۵۵ء میں ہندوستان جاتے وقت سندی میں بھی آیا تھا ۔ اٹھارھویں صدی میں خشکی کا حصہ بڑھ جانے کی وجہ سے ان بندرگاہوں کا تعلق سمندر سے منقطع ہوگیا، لیکن کراچی، جو ڈیلٹا سے کہیں باہر مغرب کی طرف واقع تھی، ریت اور گاد کی تیز تر بھرائی سے محفوظ تھی ۔ اس طرح جنوب مغربی سندھ کے بڑے شہر ٹھٹھہ کی جگہ بھی کراچی نے لے لی ۔

[۱۷۸۲ء میں بھوجومل کی موت کے وقت یہاں خاصی آبادی ہوچکی تھی ۔ کئی سال تک یہاں کا نظم و نسق بنیوں اور سیٹھوں کے ہاتھ میں رہا ۔ لیکن جلد ہی اس پر کلہوروں نے قبضہ کر لیا ۔ بعد ازاں خان قلات سے جنگ کے بعد کلہوروں نے اس کے بھائیوں کے قصاص کے طور پر کراچی کو خان قلات کے حوالے کر دیا ۔ کلہورہ خاندان کے زوال کے بعد امیر فتح علی خان تالپور نے اسے چھیننے کے لیے دوبارہ چڑھائی کی، مگر ناکام رہا، تاہم تیسری بار ۱۷۹۵-۱۷۹۷ء میں اس کا کراچی پر قبضہ ہوگیا ۔ ۱۷۹۷ء میں] اس نے بندرگاہ کی حفاظت کے لیے منوڑا کے مقام پر ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا ۔ اس وقت سے تجارتی کاروبار زیادہ بڑھ گیا ۔ ۱۸۰۸ء میں بوٹنجر نے یہاں کی سیاحت کی تو اس کی آبادی نو ہزار تھی اور اس کا شمار سندھ کے خوشحال شہروں میں ہوتا تھا ۔ ۱۸۳۱ء میں برنز (Burnes) کی تحقیقات کے مطابق یہاں کی آبادی پندرہ ہزار ہو چکی تھی ۔

۱۸۴۱ء میں سرچارلس نیپیئر نے یہاں آ کر لنگر ڈال دیے اور ۱۸۴۳ء میں سندھ کے الحاق [تفصیل کے لیے رک بہ سندھ] کے بعد وہ اس کی ترقی اور خوشحالی کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اسے فوجی اور انتظامی مرکز کے علاوہ ایک اہم بندرگاہ بھی بنا دے، جو پنجاب اور سندھ کے تجارتی کاروبار کو ہاتھ میں لے سکے ۔

اپنی صحیح راے اور پیش بینی کی بدولت وہ

اس ترقی کی بنیادیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جو زمانۂ حال میں ہو رہی ہے۔ ۱۸۵۴ء میں سر بارٹل فریئر (Bartle Frere) نے نیپیئر مول (Mole = مصنوعی بندرگاہ) کی تعمیر سے، جو جزیرۂ کیماڑی کو برعظیم سے ملا دیتی ہے، اس بندرگاہ کی اصلاح اور درستی کی۔ ۱۸۶۹ تا ۱۸۷۳ء میں منوڑا کا بند تعمیر ہوا اور بندرگاہ کے رقبے کو رفتہ رفتہ محدود کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس رقبے کو زیادہ گہرا کرنے اور کارآمد بنانے کا کام بھی جاری رہا۔ ۱۸۸۳ء میں دریاے ملیر سے کافی مقدار میں پانی لایا گیا۔

جنرل ہیگ [دیکھیے ماخذ] نے لکھا ہے کہ کراچی وہی مقام ہے جو سکندر اعظم کے زمانے میں ہیون Haven کے نام سے مشہور ہوا اور جہاں نیارکس Nearchus دریاے سندھ کے مغربی دہانے کے مغرب کی جانب سفر کرتا ہوا پہنچا تھا۔ چونکہ اس مقام پر اصلی ڈیلٹے کی نسبت کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے یہاں بعض موقعوں کی شناخت ممکن ہے۔ بیکتہ Bibakta کا ٹاپو غالباً وہی ہے جو آج کل منوڑا پائنٹ (Manora Point) ہے اور ایروس Eiros وہ سطح مرتفع ہے جو کیوورا Kiovra کی بندرگاہ کے مشرق میں ہے۔ Clifton کا مقام ہمیشہ ایک جاے پناہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہوگا۔ موجودہ زمانے میں اس مقام کی زبردست ترقی کی وجہ یہ ہے کہ یہ پاکستان کی واحد بندرگاہ ہے، جہاں سے پاکستان کے علاوہ افغانستان اور [کسی حد تک] ایران کا مال، یعنی گندم، کپاس، روغنی تخم، کھالیں اور کھیل کود کا سامان باہر کے ملکوں میں جاتا ہے۔

[کراچی کا موسم سال کے زیادہ تر حصے میں خوشگوار رہتا ہے]۔ یہاں نہ تو جنوب مغربی مون سون ہوائیں پہنچتی ہیں اور نہ جنوب مشرقی؛ اس لیے یہاں صرف دو موسم ہی ممکن ہیں۔ سردی کا موسم ماہ نومبر میں شروع ہوتا ہے اور ماہ مارچ میں ختم ہو جاتا ہے [کم سے کم درجۂ حرارت ۵۶ درجے فارن ہائیٹ/۱۳ درجے سینٹی گریڈ؛ بعض اوقات تیز سرد ہوائیں چلنے سے درجۂ حرارت ۴۰ درجے فارن ہائیٹ/۴ درجے سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے]۔ موسم گرما اپریل سے لے کر اکتوبر تک رہتا ہے [زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۵۳ درجے فارن ہائیٹ/۳۴ درجے سینٹی گریڈ، جو بعض اوقات ۱۰۵ درجے فارن ہائیٹ/۴۱ درجے سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے]۔ برسات کا موسم زیادہ تر جون، جولائی اور اگست تک محدود رہتا ہے اور اس عرصے میں کوئی ۸ انچ کے قریب بارش ہو جاتی ہے۔ ہواؤں کی رفتار بھی مختلف ہے؛ ۲۵ میل فی گھنٹے سے زیادہ رفتار کی ہوائیں تو موسمی ہواؤں کے زمانے میں چلتی ہیں، لیکن عام طور پر موسم گرما میں مغربی اور جنوب مغربی ہوائیں چلتی ہیں اور موسم سرما میں شمال مشرقی اور شمال مغربی ہواؤں کا زور ہوتا ہے۔ دسمبر کا مہینا سب سے زیادہ خشک ہوتا ہے اس وقت درجۂ رطوبت صرف ۵۰ فیصد کے قریب ہوتا ہے؛ سب سے زیادہ مرطوب مہینا اگست کا ہوتا ہے، جب کہ کراچی میں درجۂ رطوبت ۸۴ فیصد کے قریب ہو جاتا ہے۔

زمانۂ حال کی ترقی اور توسیع: [قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد کراچی ملک کا دارالحکومت مقرر ہوا تو یہ طے پایا] کہ کراچی کو زیادہ وسیع کیا جائے اور اسے ایک مرکزی شہر کی شکل میں تبدیل کر کے بیس ہزار ایکڑ کے رقبے میں پھیلا دیا جائے تاکہ اس علاقے میں ایک ایسا بڑا اور عظیم الشان شہر آباد ہو جائے جو اس سب سے بڑی اسلامی حکومت کے شایان شان ہو۔ اس شہر کو اپنی شان اور زندگی کی بالیدگی حاصل ہو چکی ہے۔ بندر روڈ کے دونوں طرف، جو کراچی کی سب سے زیادہ بارونق

اور اہم شارع عام ہے، ایک مستزاد حاشیے کی صورت میں نئی آبادیاں قائم ہوچکی ہیں۔ دوسری بڑی بڑی سڑکوں کے ذریعے ایک نو وارد کراچی کے ان مضافات اور قصبات تک پہنچ جاتا ہے جو زیر تعمیر عظیم کراچی کا جزو لاینفک بن رہے ہیں۔ [۱۹۵۹ء میں ملک کا دارالحکومت راولپنڈی۔ اسلام آباد میں منتقل کر دیا گیا اور کراچی محض صوبۂ سندھ کا صدر مقام رہ گیا۔ پھر صوبۂ سندھ کا صدر مقام بھی حیدرآباد قرار پایا۔ بایں ہمہ کراچی کی توسیع و ترقی کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی] .

کراچی کی آبادی ۱۸۸۳ء میں دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی؛ ۱۹۴۱ء میں یہ تعداد پچھتر ہزار ہوگئی اور ۱۹۵۱ء میں گیارہ لاکھ [اور ۱۹۶۱ء میں انیس لاکھ] سے متجاوز ہوگئی۔ تقریباً ۹۵ فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ ان میں سے کم از کم تین چوتھائی آبادی [قیام پاکستان کے بعد بھارت یا ملک کے دوسرے صوبوں سے آنے والے مہاجرین یا نوواردوں کی ہے۔ جہاں تک دوسری قوموں کا تعلق ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے ان کی تعداد یہ ہے : ۱۰۴۹۷ ہندو، ۶۷۸۶ پسماندہ اقوام، ۳۵۱۶۵ عیسائی اور ۶۲۶۶ پارسی وغیرہ]۔ آبادی میں ان انقلاب آمیز اور اچانک تبدیلیوں کے باوجود کراچی کی وہی مخلوط شان اب تک باقی ہے۔ مختلف قوموں نے اس شہر کی ترقی اور بہبود میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ [قیام پاکستان کے بعد] مسلمانوں نے ہر میدان میں ترقی کی ہے اور اس شہر میں انگریز آبادکاروں اور ہندوؤں کی جگہ لے کر صنعت و حرفت کو بھی کافی فروغ دیا ہے .

[کراچی شہر کا نقشہ : کراچی ایک نہایت خوبصورت قدرتی بندرگاہ ہے، جو جزیرۂ منوڑا، جزیرۂ کیماڑی اور آئسٹر راکس Oyster Rocks کے باعث بحری طوفانوں اور حملوں سے محفوظ ہے۔ بندرگاہ کے ساتھ ساتھ ایک طویل ساحلی پٹی چلی گئی ہے۔ اس کے شمال اور مشرق میں سطح زمین بتدریج ۵ سے ۱۲۰ فٹ تک بلند ہوتی چلی گئی ہے اور اس وسیع میدان میں کراچی آباد ہے۔ شمال اور مشرق میں چند پہاڑیاں بھی ہیں، جن میں سے بلند ترین منگھو پیر (۵۸۵ فٹ) ہے۔ دو برساتی ندیاں، ملیر اور لیاری، علی الترتیب شہر کے مشرق اور شمالی حصے میں سے ہوکر گزرتی ہیں۔ کراچی کے نقشے میں خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ اس کی چار بڑی سڑکیں، یعنی لارنس روڈ، بندر روڈ، فریئر روڈ اور میکلوڈ روڈ، میری ویدر ٹاور Mereweather Tower سے شروع ہوکر ایک دوسرے کے متوازی غرباً شرقاً چلی گئی ہیں اور انہیں مختلف مقامات پر متعدد سڑکیں، مثلاً نیپئر روڈ، کچہری روڈ اور گارڈن روڈ، شمالاً جنوباً قطع کرتی ہیں۔ مرکزی شہر انہیں سڑکوں کے اردگرد آباد ہے۔ پرانا شہر بندر روڈ کے شمال میں بندرگاہ کے قریب واقع ہے اور تقریباً ایک میل تک بے قاعدہ طور پر پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کے مشرق میں ڈرگ چھاؤنی، سول لائن اور صدر بازار کے علاقے ہیں، جو یورپی طرز پر تعمیر ہوئے ہیں۔ ان سے آگے کئی سڑکیں نکل کر مضافات کی نئی بستیوں، مثلاً ناظم آباد، دہلی کالونی، سندھی ہاؤسنگ سوسائٹی، حیدرآباد کالونی، پیر الٰہی بخش کالونی، کورنگی کی طرف چلی جاتی ہیں۔ نقشے پر کراچی شہر کچھ اس طرح نظر آتا ہے جیسے ایک بڑی سی مکڑی اپنی ٹانگیں چاروں طرف پھیلائے بیٹھی ہو (*Ency. Brit.*)] .

حمل و نقل : کراچی، جو ہمیشہ سے دنیا بھر کے لوگوں کا شہر سمجھا جاتا رہا ہے، اب ایسی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کی نظیر اس مقام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس شہر میں خشکی، تری اور ہوائی راستوں کے ذریعے آجاسکنے

ہیں۔ [پشاور جانے والی شاہراہ اعظم اسے اندرون ملک سے اور زاہدان جانے والی سڑک ایران اور مشرق وسطیٰ سے ملاتی ہے۔ شہر کے وسطی علاقوں میں سڑکوں کی لمبائی تقریباً چار سو میل اور مضافات میں ۱۶۰۰ میل سے زیادہ ہے۔ کراچی پاکستان ریلوے کا آخری سٹیشن ہے]۔ یہ ریلوے، جو وادی سندھ کے بیچ میں سے ہو کر گزرتی ہے، سمندر کے عقبی علاقے کی تمام پیداوار اس کے دروازے پر لا پھینکتی ہے اور درآمد شدہ مال اندرون ملک پہنچاتی ہے۔ کوئی درجن بھر مال گاڑیاں یہاں روزانہ پہنچتی اور اتنی ہی تعداد میں یہاں سے روانہ ہوتی ہیں۔ مال کے نقل و حمل میں ٹرک بھی بڑی تعداد میں استعمال ہوتے ہیں۔

دنیا کے مختلف حصوں سے جو جہاز اب آتے ہیں وہ کیماڑی میں آ کر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بعض ایسے سمندری راستوں کے مرکز میں واقع ہے جن پر بہت زیادہ آمد و رفت رہتی ہے۔ کراچی بحری تجارت کے لیے ایک مرکزی مقام ہے، خصوصاً وہ تجارت جو ایک طرف تو خلیج فارس، نہر سویز اور راس امید وغیرہ کے درمیان ہوتی ہے اور دوسری طرف لنکا، برما، جاپان، انڈونیشیا (ہند چینی) اور آسٹریلیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ الغرض کراچی سے ہر طرف بہتیرے بحری راستے پھوٹتے ہیں۔ یہاں کی بندرگاہ ہر قسم کے جہازوں کے لیے ہر موسم میں محفوظ ہے کیونکہ منوڑا ٹاپو، جو بندر گاہ کے جنوب مغرب میں ہے، غیر معمولی محل وقوع کا حامل ہے۔ آج کل کراچی کی بحری تجارت کی مجموعی مقدار لاکھوں ٹن تک پہنچ چکی ہے۔ [۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں یہاں کی بیس سے زیادہ گودیوں میں ۶۳ لاکھ ٹن مال اتارا اور تقریباً ۳۲ لاکھ ٹن مال لادا گیا۔ یہاں سترہ سو سے زیادہ جہاز سالانہ لنگر انداز ہوتے ہیں]۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ساحلی تجارتی کاروبار بھی مقامی طور پر بڑے پیمانے پر ہوتا رہتا ہے۔

[کراچی ایک بین الاقوامی فضائی مستقر ہے، جہاں روز و شب یورپ، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، آسٹریلیا اور امریکہ کے درمیان ہوائی جہازوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے]۔ ہوائی جہازوں کے اترنے کے لیے غیر معمولی طور پر عمدہ زمین موجود ہے، جو ایک وسیع کف دست چٹیل میدان کی صورت میں پھیلی چلی گئی ہے۔ سال بھر میں زیادہ عرصے کے لیے آب و ہوا بھی عموماً خشک ہی رہتی ہے، اس لیے کراچی کے دونوں ہوائی اڈے، ڈرگ روڈ (سول) اور ماڑی پور (فوجی) پوری رونق پر رہتے ہیں۔ متعدد بین الاقوامی اور بین المملکتی کمپنیوں کے کاروبار کی وجہ سے یہاں شب و روز بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ ہزاروں مسافر، بھاری ڈاک اور تجارتی مال وغیرہ کی آمد و رفت اور نقل و حرکت ہر مہینے متواتر ہوتی رہتی ہے۔ رات کے وقت پرواز کرنے کے لیے ضروری ساز و سامان مہیا ہے اور اس بات کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ جیٹ قسم کے طیارے اور بھاری بھرکم ہوائی جہاز یہاں اتر سکیں۔

[صنعت و تجارت: کراچی پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔ یہاں تین ہزار سے زیادہ کارخانے چل رہے ہیں، جن میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ پارچہ بافی اور کفش سازی کی صنعتوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ تیل صاف کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم ہے۔ مشینیں، ادویات، ظروف، فرنیچر، کاغذ، بجلی کا سامان، چمڑے کی چیزیں وغیرہ بھی بڑی مقدار میں تیار ہوتی ہیں۔ فولاد کا کارخانہ لگ جانے کے بعد اس کی صنعت و حرفت میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔

یہاں تقریباً تیس بڑے بنکوں کے مرکزی دفاتر اوران کی شاخیں کام کر رہی ہیں ۔ دو درجن سے زیادہ بیمہ کمپنیاں ہیں اور ملک سب سے بڑا سٹاک ایکسچینج بھی یہاں قائم ہے ۔

عظیم کراچی کا نظم و نسق پانچ ادارے چلا رہے ہیں، یعنی کراچی میونسپل کارپوریشن، کورنگی لانڈھی میونسپل کمیٹی، ڈرگ ملیر میونسپل کمیٹی، کراچی کنٹونمنٹ بورڈ اور کراچی پورٹ ٹرسٹ ۔ کراچی میں آب رسانی کے مندرجۂ ذیل وسائل ہیں : (۱) جھیل ہالیجی سے، جو کراچی سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے اور اس میں دریاے سندھ کا پانی آتا ہے؛ (۲) دریاے ملیر کی خشک تلیٹی میں کھودے ہوے کنووں سے؛ (۳) یہاں سے ۶۰ میل دور جھیل کالری سے ۔ شہر میں تقریباً دس کروڑ گیلن پانی روزانہ استعمال ہوتا ہے ۔ اس کے باوجود اس کے بعض حصوں، بالخصوص لانڈھی، ملیر اور ماڑی پور کی مضافاتی بستیوں میں قلت کی شکایت ہے ۔

کراچی تعلیمی مرکز بھی ہے، یہاں یونیورسٹی کے علاوہ ثانوی، اعلیٰ اور صنعتی تعلیم دینے کے متعدد ادارے قائم ہیں] ۔

کراچی کا مستقبل نہایت درخشاں ہے ۔ بحرعرب کے ساحل پر یہ شہر اور اس کی بندرگاہ بے مثال ہے ۔ زمانۂ گزشتہ میں اس کی ترقی عظیم الشان رہی ہے اور اگر صحیح طریقے سے اس کی دیکھ بھال اور توسیع ہوتی رہی تو اس کی آبادی میں بھی کسی حد تک بڑھنے کے علاوہ یہاں کی دولت اور صحت میں بھی معتد بہ اضافہ ہو سکتا ہے ۔

مآخذ : (۱) Pithawalla و Kaye : *Geology and Geography of Karachi and its Neighbourhood*، دو حصے، کراچی ۱۹۴۶ء؛ (۲) مانک پیٹھا والا و خان محمّد شمشاد : *Climate of Karachi and how to live in it*؛ (۳) A. W. Hughes : *Gazetteer of the Province of Sind*، ۱۸۷۶ء؛ (۴) James Evans : *Memoires of Seth Naomal Hotchand, C.S.I.—1804 to 1879*، ۱۹۱۵ء؛ (۵) *Karachi District Gazetteer*، ۱۹۲۷ء؛ (۶) Postans : *Personal Observations on Sindh*، لنڈن ۱۸۴۳ء؛ (۷) Burton : *Sindh Revisited*، لنڈن ۱۸۹۷ء؛ (۸) عبدالحمید خان : *Towns of Pakistan*، ۱۹۵۰ء؛ [(۹) *District Census Repot, Karachi*، ۱۹۶۱ء؛ (۱۰) نذیر احمد : *Survey of Shelterless People in Karachi*، ۱۹۵۹ء؛ (۱۱) *The Great Karachi Resettlement Housing Programme*، مطبوعۂ کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی، ۱۹۶۱ء؛ (۱۲) A. F. Balie : *Kurrachee—Past, Present and Future*، ۱۸۹۰ء؛ (۱۳) H. Feldman : *Karachi Through A Hundred Years*، ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) G. Rains : *Indus-trial Efficiency and Economic Growth : A Case Study of Karachi*، ۱۹۶۱ء؛ (۱۵) امتیاز الدّین حسین، محمّد افضل و امجد علی بہادر رضوی : *The Social Characteristics of the People of Karachi*، ۱۹۶۵ء؛ (۱۶) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۷۳ء، ج ۱۰؛ (۱۷) *Pakistan Year Book, 1971*؛ (۱۸) *The States-man Year Book 1974-75*؛ (۱۹) کیمی مارپوا : آج کا پاکستان (مترجمۂ محمّد حسن رایع)، لاہور ۱۹۶۶ء ۔

(MANECK B. PITHAWALLA [و ادارہ])

کَرَامَۃ : [ع]؛ دراصل کَرُمَ (= کریم یا "نیک" ہونا، وسیع ترین معنی میں) کا مصدر، لیکن استعمال میں یہ ایک اسم ہے، جس کے معنی وہی ہیں جو اِکْرَام اور تَکْرِیم کے ہیں، یعنی کسی کے سامنے اپنے آپ کو نیک خو ثابت کرنا (لسان، ۱۵ : ۴۵۶ س ۳ ببعد) ۔ اگرچہ کریم کا لفظ بکثرت اللہ اور اس کے کاموں کے لیے قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے (راغب الاصفہانی : المفردات، بذیل مادّہ)، لیکن *

کرامہ کا لفظ کہیں نہیں آیا، لہٰذا اسلام کی دینی زبان میں اس کے معنی ہوے: اللہ کا اپنے احسان و انعام، حفظ و نصر کا کسی بندے پر مبذول فرمانا، مثال کے طور پر دیکھیے البیضاوی: تفسیر القرآن، بذیل ۱۰ [یونس]: ۶۳ (طبع Fleischer، ۱: ۴۱۹ آخر صفحہ) جو اولیاء اللہ کی بابت معتبر ترین بیان ہے؟ اور کرامات اس بذل کی جزئی صورتوں کو کہتے ہیں؛ چنانچہ کرامات کے مخصوص معنے ہوے ایک خارق عادت انعام و اکرام جس کو اللہ اپنے اولیا کے حفظ و حمایت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں کرامات کا پتا ان آیات میں لگایا گیا ہے: ۳ [آل عمرٰن]: ۳۷ جس میں حضرت مریم[۴] کے پاس مُقفّل محراب میں خرق عادت کے طور پر آپ ہی آپ خوراک پہنچ جانے کا ذکر ہے اور وہ آیات جن میں تخت بلقیس کو ایک مصاحب سلیمان کے، جس کا نام نہیں لیا گیا، آن کی آن میں یمن سے شام پہنچا دینے کا ذکر ہے (۲۷ [النمل]: ۴۰)۔ چونکہ نہ تو حضرت مریم[۴] پیغمبر تھیں اور نہ بے نام ساتھی پیغمبر تھا اس لیے اس خرق عادت کو دونوں صورتوں میں معجزہ نہیں کہہ سکتے۔ اس کی پوری بحث کے لیے دیکھیے شرح تفتازانی بر عقائد نسفی، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ص ۱۳۴ ببعد؛ لیکن حقیقت میں ان کی اصل سیر اولیاء میں ہے جن میں ان کے بے شمار خارق عادت کارنامے درج ہیں جو ان کی باطنی زندگی کے ناقابل شک احوال و مواجید کے مبالغہ آمیز اور محرف خیالی بیانات ہیں۔ ان واقعات یا کارناموں کی تہ میں جو حقیقت واقعیّہ کارفرما ہے اس کو تمام راسخ العقیدہ مسلمان، تسلیم کرتے ہیں، یہاں تک کہ ابن خلدون (طبع Quatremere)، ۱: ۱۶۹، ۱۹۹، مترجمۂ دیسلان، ۱: ۱۹۰، ۲۲۷) جیسا فلسفی مؤرخ اور ابن سینا جیسا مشّائی فلسفی تک بھی مانتے ہیں (اشارات، طبع Farget، ص ۲۰۹، ۲۱۹، ۲۲۱ ببعد)۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ لوگ واقعات کے دباؤ کی وجہ سے اس مفروضے کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے کہ کائنات میں ابھی تک ایسے بہت سے راز پوشیدہ ہیں جو حل نہیں ہوے (دیکھیے Goldziher: *Die Richtungen desislamischen Koranauslegung*، لائیڈن ۱۹۲۰ء، ص ۱۳۹ حاشیہ ۳)۔ صرف معتزلہ نے جنھیں اس بات کا یقین تھا کہ کائنات میں ایسے راز نہیں ہیں جو ان سے پوشیدہ رکھ چھوڑے ہیں، لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے دینی مسائل کی تحقیق کے لیے فقط عقل کو رہنما بنائیں، اس کے خلاف احتجاج کیا اور خود قرآن مجید میں اپنے احتجاج کی اصل بھی ڈھونڈ لی (دیکھیے الزمخشری: الکشاف، طبع Nassau Lees، ۲: ۱۵۳۹ بذیل ۷۲ [الجن]: ۲۶، ۲۷)، اور اس مسئلے کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے Goldziher: کتاب مذکور، ص ۱۴۴ ببعد۔ لفظ کرامات اور قدیم مسیحی مذہب (I cor. xii) کے لفظ χαρίσματα (قرنتیان اول باب ۱۳) تلفظ، اشتقاق اور معنی میں باہمی توافق عجیب ترین امر ہے اور اس کا اتفاق ہونا مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے مذہبی مظاہر ایک جیسے ہیں، لیکن لفظی تعلق واضح نہیں، شام کے عیسائی χαρίσματα کو محض "تحفے" *Mauhᵉbhāthā* کہا کرتے تھے جس کی عربی مواہب ہے اور یہ لفظ سچ مچ کرامات کے لیے استعمال بھی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یونانی لفظ جب سریانی میں منتقل ہوا تو اس نے عربی زبان بولنے والوں کو ان کا اپنا لفظ کرامات سمجھا دیا ہو۔ اصطلاحاً کرامت بمفہوم بالا خارق العادۃ "عادت یا معمول کو توڑنے والوں" میں داخل ہے کیونکہ راسخ الاعتقاد اسلام میں Nature کوئی شے نہیں، اگر ہے تو فقط یا زیادہ سے زیادہ

اللہ کی ایک مقرر کی ہوئی عادت یا رسم ہے جس کے مطابق امور عالم عموماً ظہور پذیر ہوتے ہیں (Goldziher: *Vorlesungen*، ص ۱۳۰)۔ کرامت اور معجزہ (دلیل نبوت) میں فرق یہ ہے کہ کرامت کسی نبی سے اپنی نبوت کے ثبوت میں اللہ کی طرف سے صادر نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ نبوت کا دعوٰی نہیں ہوتا نہ مخالفوں کو مقابلے کی دعوت دی جاتی ہے۔

معونت (مدد) اور کرامت میں یہ فرق ہے کہ معونت حاصل کرنے والا گو مسلم ہوتا ہے، لیکن اس پر کوئی دینی (باطنی) حال طاری نہیں ہوتا اور نہ اسے مذہبی تجربہ ہوتا ہے۔ یہ ارهاص سے بھی علٰیحدہ ہے جو اس غیر معمولی واقعے کو کہتے ہیں جو کسی نبی کی بعثت سے پہلے اس کے لیے میدان تیار کرنے کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کرامت استدراج اور اہانہ سے بھی مختلف ہے کیونکہ استدراج اور اہانہ کفار کی خاطر ظہور پذیر ہوتے ہیں تاکہ انہیں گمراہ اور شرمندہ کیا جائے (کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۴۴۴ ببعد، النسفی: عقائد، محل مذکور مع اس کی شروح کے)۔ ولی کو اپنی کرامتیں چھپانی چاہییں حالانکہ نبی کے لیے ان کا اظہار ضروری ہے۔ ولی کو اپنی کرامات سے باخبر ہونا ضروری نہیں، لیکن نبی کو لا محالہ ان کا علم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے، کہ ولی کی کرامت کو اس نبی کا معجزہ سمجھا جائے گا جس کا وہ پیرو ہے اور آخری بات یہ ہے کہ ولی کو جہاں تک ہو سکے اپنی کرامات کو نظر انداز کرنا چاہیے اور اسے بجائے عنایات ربّانی سمجھنے کے ذرائع ابتلا سمجھنا چاہیے۔

مآخذ: (۱) القشیری: الرسالہ، بولاق ۱۲۹۰ھ، مع شروح، ۴ : ۱۴۶ ببعد (دیکھیے Richard Hartman: *Das Ṣûfîtum nach al-ḳuschairi*)؛ (۲) Goldziher: *Muhammed. Studien*، ۲ : ۳۷۲ ببعد؛ (۳) الایجی: المواقف، بولاق ۱۲۶۶ھ، مع شرح الجرجانی، ص ۵۷۸ ببعد، ۵۴۷ ببعد؛ (۴) ہجویری: کشف المحجوب، مترجمۂ آر۔ اے نکلسن، بمدد اشاریہ؛ (۵) الشعرانی: الطبقات الکبرٰی، بمواضع کثیرہ؛ (۶) یوسف النبہانی: جامع کرامات الاولیاء، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، (حکایات کا بہت بڑا مجموعہ ہے)؛ (۷) ابن بطوطہ: تحفۃ النظّار، بمواضع کثیرہ؛ (۸) D. B. Macdonald: *Religious Attitude and Life in Islam*، لیکچر، ۳ تا ۷، ۹۔

(D. B. MACDONALD)

کرامت علی: جونپور [رکّ باں] کے ایک * شیخ گھرانے میں پیدا ہوئے (صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں غالباً انیسویں صدی کے اوائل میں) جس کے افراد اسلامی دور حکومت میں خطیب کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ کرامت علی کے والد کلکٹر جونپور کے دفتر میں سررشتہ دار تھے، انہوں نے دینیات اور دیگر علوم اسلامی کی تحصیل اپنے زمانے کے مشہور و معروف علما، خصوصاً شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی سے کی جو پہلے سید احمدؒ بریلوی کے استاد تھے اور جنھوں نے بعد میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ۱۸۲۰ اور ۱۸۲۴ء کے درمیان سید احمدؒ نے بنگال اور شمالی ہند کا دورہ کیا اور پیروؤں کی ایک جماعت فراہم کر لی۔ کرامت علی ان کے مخلص ترین نوجوان پیروؤں میں سے تھے، لیکن بظاہر انھوں نے اس جہاد میں شرکت نہیں کی جو سید احمدؒ نے سکھوں [رکّ باں] کے خلاف کیا اور نہ وہ افغانستان کے اس سرحدی علاقے میں کبھی گئے جہاں ۱۸۳۱ء کی جنگ میں سید احمدؒ نے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ سید موصوف کی شہادت کے بعد ان کے معمر استاد شاہ عبدالعزیزؒ ان کے خلیفہ ہوئے اور بہار و بنگال میں تجدید اسلام کی تحریک بڑی سرگرمی سے شروع ہوئی۔ اس پر امن تحریک

میں کرامت علی بھی بدل و جان شامل ہوے اور انھیں اس تحریک کا سب سے کامیاب حامی اور داعی کہا جاسکتا ہے اور یقیناً وہ اس کے لائق ترین نمائندے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرات کے دوران میں مشرقی بنگال میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی اصلاحی تحریکیں چلیں، لیکن ان کے قائد ایسے لوگ تھے جن میں بہ نسبت علم و فضل کے جوش اور سرگرمی زیادہ تھی، مثلاً حاجی شریعت اللہ [رک بہ فرائضی]، جنھوں نے ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ - ۱۸۳۷ء میں کرامت علی سے کلکتے میں ملاقات کی۔ ۱۸۵۵ء تک دو مختلف الخیال گروہوں کے درمیان مصالحت کی کوششیں کسی حد تک کامیاب ہوچکی تھیں؛ چنانچہ ایک جلسے میں، جو باریسال میں منعقد ہوا، کرامت علی دوسرے گروہ کے نمائندے مولوی عبدالجبّار سے کئی ایک مسائل پر متفق ہوگئے، لیکن برطانوی ہند میں جمعے اور عید کی نمازوں کے شرعی جواز کے مسئلے پر مولوی عبدالجبّار کی شدید مخالفت پر غالب نہ آسکے اور مولوی عبدالجبّار کے متبعین کو خوش کرنے کے لیے ظریفانہ انداز میں کہا کہ ان کے رہنما نے ملخ (ٹڈیوں) کو (جو حلال ہیں) غلطی سے گھاس کے ٹڈے (جو حرام ہیں) سمجھ لیا ہے (حجّت قاطعہ، ص ۲۹ تا ۳۲)۔

اپنی دعوت کے سلسلے میں کرامت علی کو دُہری کشمکش سے پالا پڑا۔ ایک طرف تو انھیں ان ہندوانہ رسوم اور توہمات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی شرعی زندگی میں داخل ہوچکی تھیں (چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تصنیفات میں ان پر رد و قدح کرنے کے علاوہ ایک کتاب ردّ البدعۃ خاص اسی موضوع پر لکھی) اور دوسری طرف ان کی یہ کوشش تھی کہ راہ راست سے ہٹے ہوے سب فرقوں کو، جن کے خلاف انھوں نے کامیابی سے مسلسل جنگ کی تھی، سنت قائمہ کے دائرے میں لایا جائے۔ ان کی ضخیم کتابوں میں ان جہلا کا صراحۃً و کنایۃً بار بار ذکر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی موضوع پر انھوں نے ایک اور مخصوص کتاب ہدایۃ الرّافضیّین تصنیف کی۔ وہ بنگال کے مسلم عوام کے ساتھ ہمیشہ ربط ضبط رکھتے تھے اور تمام نذرانے، جو انھیں وصول ہوتے تھے، حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ وہ ایک مشاق قاری اور ماہر فن خوشنویس تھے۔

گارساں دتاسی Garcin de Tassy (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶۲) لکھتا ہے کہ Sir Charles Trevelyan نے اعلان کیا تھا کہ یورپ کی جدید نہضۃ علمیہ پر یونان اور عرب کے اثر کے موضوع پر جو ہندوستانی بہترین مقالہ لکھے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ اس مقابلے میں کرامت علی نے بھی حصہ لیا تھا، لیکن انگریزی ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے، جس کا ساتھ ہونا شرائط کی رو سے ضروری تھا، ان کا مقالہ مقابلے میں شامل نہ کیا جا سکا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اکثر ہم عصر ہندوستانی مولویوں کے برعکس اس بات کے قائل تھے کہ بیرونی دنیا کے عام مسائل سے اسلام کا بھی تعلق ہے اور اس موضوع میں دلچسپی لیتے تھے۔ کرامت علی نے ۳ ربیع الآخر ۱۲۹۰ھ/ ۳۱ مئی ۱۸۷۳ء کو وفات پائی اور رنگ پور میں مدفون ہوے (تجلّی نور، ۲ : ۱۳۶)؛ گویا وفات کے بعد بھی وہ اسی صوبے میں رہے جہاں زندگی بھر احیاے اسلام کی کوشش میں مصروف رہے تھے۔ ان کے بعد یہ کام ان کے بیٹے مولوی حافظ احمد (م ۱۸۹۸ء) اور بھتیجے محمد محسن نے سنبھالا۔ کرامت علی کے متبعین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بنگال میں بمشکل کوئی ایسا گاؤں ہوگا جہاں ان کے شاگرد نہ ہوں۔ اس صوبے کے بعض اضلاع میں آج

تک ان کا اثر زندہ و پائندہ ہے .

ان کی تصنیفات زیادہ تر اردو میں ہیں ۔ رحمٰن علی (کتاب مذکور، ص ۱۷۱، ۱۷۲) نے ان کی ۴۶ کتابوں کی فہرست دی ہے اور یہ دعوٰی نہیں کیا کہ یہ فہرست جامع اور مکمل ہے ۔ ان کی ایک کتاب مِفْتاحُ الجَنّۃ بار بار طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے اور یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ اس کتاب میں اسلامی قواعد و مسائل کا بالکل درست اور صحیح بیان ہے ۔ ان کی تصنیفات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے : (۱) عام تصنیفات، مثلاً مفتاح الجنّۃ؛ (۲) قرآن مجید کی قراءت، اس کی لفظی تفسیر اور نماز و طہارت کے مسائل پر تصنیفات؛ (۳) پیری مریدی کے مسئلے پر تصنیفات، جو پاک و ہند کے اہل السنت و الجماعۃ مسلمانوں کے ہاں خاصا اہم ہے ۔ اس مسئلے کی اہمیت تسلیم کر لینے سے کرامت علی وہابی فرقے سے صاف طور پر جدا نظر آتے ہیں اور غیرمحسوس طور پر زمرۂ متصوفین سے جا ملتے ہیں اور انھیں اہل السنۃ کے مستند فرقوں سے مربوط و منسلک کرتے ہیں؛ (۴) شریعت اللہ، دودو میاں اور وہابیوں کے بارے میں مناظرانہ تصنیفات .

عام طور پر جو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کرامت علی وہابی تھے، اس کی تردید ان کے اپنے عقائد کے بارے میں اس مشرح و مبسوط بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب مکا شفات رحمت میں دیا ہے ۔ انھوں نے وہابیوں کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن ان کی بابت زبانی استفسارات ضرور کیے تھے ۔ کرامت علی اور ان کے پیروؤں نے بڑی احتیاط سے شرک اور بدعت میں فرق بتایا ہے ۔ شرک کا مطلب سرے سے نفی اسلام ہے اور بدعت کا مطلب فقط کسی جزوی مسئلے یا عقیدے میں غلط فہمی ہے (ص ۳۹) ۔ انھوں نے حجت قاطعہ میں فاسق (گنہگار) اور کافر میں فرق واضح کیا ہے اور ان لوگوں پر سخت لعن طعن کی ہے جو ایسے لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں جنھوں نے زندگی میں نماز نہیں پڑھی بلکہ فقط کلمہ ہی پڑھ کر بیٹھے رہے (ص ۲۱) اور یہ بھی بتایا ہے کہ اگر کسی اسلامی ملک کو غیر مسلم فتح کر لیں تو ان کے ماتحت ملک میں نماز جمعہ و عیدین [رک بآں] شرعی اعتبار سے نہ فقط جائز بلکہ واجب ہے (ص ۱۳، دو بار) ۔ انھوں نے اجازت روایت اور سند پر، جو مستند اساتذہ اپنے شاگردوں کو عطا کرتے ہیں، بڑا زور دیا ہے ۔ انھوں نے اپنے اصولی مسائل کی بنیاد حنفی المذہب راسخ العقیدہ سنی مسلمانوں کی کتابوں پر رکھی ہے (مکا شفات رحمت، ص ۳۷) ۔ صحاح ستّہ، تفا سیر، اصول فقہ، مسالک تصوف اور پیری مریدی کے سلسلے ان کے نزدیک مسلّم تھے (ص ۳۸، ۳۵)، حتٰی کہ سید احمدؒ کی تحریک بھی ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث پر مبنی ہونا ثابت کرتے تھے (ص ۳۲) ۔ وہ مانتے تھے کہ ہر صدی میں احیاے دین کے لیے ایک مجدد پیدا ہوتا ہے ۔ سید احمدؒ تیرھویں صدی ہجری کے ایک ایسے ہی مجدد تھے اور ان کی پیروی لازم ہے، تاآنکہ چودھویں صدی میں کوئی اور مجدد پیدا ہو جائے (ص ۳۴) ۔ ان کی "اصلاح" فقط یہیں تک محدود تھی کہ ہندوانہ رسم و رواج کو مٹایا جائے یا ان باتوں کی بیخ کنی کی جائے جو لا علمی کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں (ص ۳۶) اور مسلمہ مذاہب اہل السّنۃ کے مطابق اسلام کو رواج دیا جائے (ص ۵۰) ۔ سیّد احمدؒ کی زندگی کے سیاسی اثرات نے ان کے متبعین کو ارباب حکومت سے متصادم کر دیا تھا، لیکن جماعت کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاست یا عقیدے کے اعتبار سے ان کا اس فرقے سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کی بنیاد محمّد بن عبدالوہاب

[رکّ بان] نے عرب میں رکھی تھی .

مآخذ : کرامت علی کے جو حالات یورپی مصنفین کے ہاں ملتے ہیں وہ غیر تسلی بخش ہیں، کیونکہ یہ بیانات سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اور یہ مصنفین اس اصلاحی فرقے اور وھابیت کے درمیان تمیز نہیں کر سکے بلکہ انھوں نے بعض جگہ مادّۂ مندرجۂ بالا کے کرامت علی کو مولوی سید کرامت علی جونپوری (۱۷۹۶ تا ۱۸۷۶ء) سے ملتبس کر دیا ہے، جنھوں نے ۱۸۳۲ سے ۱۸۳۵ء تک کابل میں امیر دوست محمّد خان کے دربار میں برطانوی حکومت کی سفارت کی تھی اور ۱۸۳۷ تا ۱۸۷۶ء ہگلی کے امام باڑے کے متولی رہے تھے (*Nineteenth Century*، سنی ۱۹۰۵ء، ص ۷۸۰ تا ۷۸۲) - نیز دیکھیے (۱) W.W. Hunter: *The Indian Musalmans*، ص۱۱۴؛ (۲) C. E. Buckland: *Dictionary of Indian Biography*، ص ۲۲۹؛ (۳) نور الدّین زیدی : تجلی نور، ۲ : ۱۳۹؛ (۴) *Census of India* (۱۹۰۱ء)، ۱/۶ (بنگال) : ۷۴ (کلکتہ ۱۹۰۲ء)؛ (۵) *Journal Asiatic Society of Bengal*، ۳/۶۳ : ۵۴ تا ۵۶ (کلکتہ ۱۸۹۴ء)؛ (۶) Garcin de Tassy: *Hist. de la litterature Hindouie et Hindoustanie*، پیرس ۱۸۷۰ء، ۲ : ۱۶۲ (یہ امر مشکوک ہے کہ کیا معجزۂ رشک مسیحا، دہلی ۱۸۶۸ء جس کا ذکر اس میں آیا ہے، زیر بحث کرامت علی ہی کی تصنیف ہے)؛ (۷) سیّد نور الدّین زیدی : تجلّی نور (جونپور کے مشہور لوگوں کے حالات زندگی)، جونپور ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۵ و ۱۳۶ .

کرامت علی کے اعتقادات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ان کی اپنی تصنیفات کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے، جن میں سب سے اہم مندرجۂ ذیل ہیں : (۱) مفتاح الجنّۃ، کلکتہ ۱۲۴۳ھ، (بارہا طبع ہوئی)؛ (۲) کوکبِ دُرّی، کلکتہ ۱۲۵۳ھ (اس میں ان لوگوں کے فائدے کے لیے جو عربی کا محض واجبی علم ہی رکھتے ہیں عبارات قرآنی کا ترجمہ دیا گیا ہے)؛ (۳) بیعت توبہ، کلکتہ ۱۲۵۴ھ (اس میں پیر کے ہاتھ پر بیعت توبہ اور دیگر اشغال مسالک دینیہ کا شرعی جواز پیش کیا گیا ہے)؛ (۴) زینۃ القاری، کلکتہ ۱۲۶۴ھ (قراءت قرآن مجید کے صحیح اصول و قواعد کے بارے میں)؛ (۵) فیض عام، کلکتہ ۱۲۸۲ھ (تفکر دینی پر ایک رسالہ، جس میں شیخ احمد سرہندیؒ کے نظریات کی تشریح پیش کی گئی ہے)؛ (۶) حجّت قاطعہ، کلکتہ ۱۲۸۲ھ (ایک مناظرانہ رسالہ، جو شریعت اللہ اور ان کے بیٹے دُودّو میاں [عام طور پر اس کا تلفظ دودھو میاں کہا جاتا ہے، مگر کرامت علی اسے ہمیشہ اسی طرح لکھتے ہیں] کے خلاف لکھا گیا ہے)؛ (۷) نور الہُدیٰ، کلکتہ ۱۲۸۶ھ (عقائد تصوف اور مجددیہ مذہب کے بارے میں، جس سے بظاہر سید احمدؒ بریلوی کا نیا مذہب مراد ہے) ؛ (۸) مکاشفات رحمت، کلکتہ ۱۲۸۶ھ (اس میں سید احمدؒ بریلوی کی زندگی اور کارناموں کے حالات ملتے ہیں اور وھابیوں کو زیر بحث لا کر ان سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی ہے)؛ (۹) زینۃ المُصَلّی، کلکتہ ۱۲۵۹ھ (وضو اور نماز وغیرہ کے متعلق ھدایات)؛ (۱۰) زاد التّقوٰی، کلکتہ ۱۲۸۷ھ، (اسلامی عقائد و اعمال اور تصوف کے بیان میں - اس میں نقشبندیہ تعلیم کو قبول کیا گیا ہے)؛ کرامت علی کی تصنیفات کی ایک نامکمل فہرست کے لیے دیکھیے (۱۱) رحمٰن علی : تذکرۂ علماے ھند، لکھنئو ۱۸۹۴ء، ص ۱۷۱، جس میں ۴۶ مختلف کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے .

(عبداللہ یوسف علی)

کَرَامَرْس : (J. H. Kramers)، بیسویں صدی ⊗ کا ایک ولندیزی مستشرق، ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۱ء میں وفات پائی - کرامرس نے لائیڈن یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی - فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے استانبول کے ولندیزی سفارت خانے میں ترجمان کے فرائض ادا کیے (۱۹۱۵ تا ۱۹۲۲ء) - بعد ازاں وہ لائیڈن یونیورسٹی میں ترکی اور فارسی زبانوں کا استاد اور ۱۹۳۹ء

میں پروفیسر ونسنک Wensinck کی وفات پر اس کی جگہ عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور تا دم مرگ اسی عہدے پر فائز رہا .

کرامرس نے ترکوں کے فن تاریخ پر ایک کتاب تالیف کی، جو ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی - اس نے ابن حوقل کی کتاب المسالک و الممالک کو بھی از سرنو، مرتب کیا، جو لائیڈن میں ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی۔ اس نے *Encyclopaedia of Islam* میں متعدد مقالے لکھے، جو اس کے علم و فضل پر دلالت کرتے ہیں۔ اس نے پروفیسر ہملٹن گب H. Gibb کے ساتھ مل کر *Encyclopaedia of Islam* کا ایک مختصر اڈیشن مرتب کیا اور اس میں صرف ان مقالوں کو شامل کیا جو مذہبی حیثیت رکھتے تھے اور چند ایک نئے مقالوں کا بھی اضافہ کیا - یہ منتخب اڈیشن ۱۹۵۳ء میں *Shorter Encyclopaedia of Islam* کے نام سے شائع ہوا - اسی طرح کرامرس نے پروفیسر ونسنک کے ساتھ مل کر اسی انسائیکلوپیڈیا کے جرمن اڈیشن کا ایک اختصار بھی مرتب کیا اور اس میں صرف ان مقالوں کو شامل کیا جو براہ راست دین اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے - یہ مختصر جرمن اڈیشن ۱۹۴۱ء میں لائیڈن میں طبع ہوا - اس میں بعض مقالوں میں جزوی ترمیم کی گئی ہے، بعض کو مختصر کر دیا گیا ہے اور بعض نئے مقالے شامل کیے گئے ہیں .

جب ۱۹۳۱ء میں پروفیسر آرنلڈ T. Arnold اور پروفیسر گیوم A. Guillaume نے مل کر *The Legacy of Islam* کو شائع کیا تو کرامرس نے بھی اس کتاب میں ایک باب Geography and Commerce کے موضوع پر لکھا، جو قیمتی معلومات سے بھرپور ہے.

کرامرس کی ایک قابل ذکر علمی خدمت یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کا ولندیزی زبان میں ترجمہ کیا، جو ایمسٹرڈم سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا - اس ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں قرآن مجید کے مضامین کا ایک مفصل اشاریہ بھی شامل ہے .

اس نے ولندیزی میں سامی زبانوں پر ایک مختصر کتاب بھی لکھی تھی، جو لائیڈن میں ۱۹۴۹ء میں طبع ہوئی .

مآخذ : (۱) نجیب العقیقی : المستشرقون ، ۲ : ۶۷۰؛ (۲) مقالہ نگار کی ذاتی معلومات .

(شیخ عنایت اللہ)

کَرْبَلاء : (کربلائے معلّٰی) عراق کا ایک ⊗ مشہور شہر، جو حضرت امام حسینؓ، حضرت عبّاسؓ، حُرّؓ بن یزید الرّیاحی اور حبیبؓ بن مُظاہر کے مزاروں اور واقعۂ عاشورا کی وجہ سے زیارت گاہ و مرکز عقیدت ہے .

تاریخ قدیم میں کربلاء کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے ، مثلاً غاضِریّہ، نینوٰی (غالباً حائر کے جنوب مشرق میں ایک قریہ ، جسے اب ایک محلے کی شکل حاصل ہوگئی ہے؛ تاریخ کربلاء و حائر الحسین، ص ۹۸)، عَمّورا، شاطیء الفرات، شطّ الفرات، طَفّ الفرات، طَفّ ماریہ، نَواوِیس، صَفّورا، حائر .

آثار قدیمہ کے ماہر گزشتہ ہزار برس کی تاریخ اور نام و نشان پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں : (۱) کربلا کُور بابل ہے، یعنی بابل کے قریے؛ (۲) کربلا اشوری نام ہے، جو "کرب" و "ایلا" سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں "حرّم اللہ"؛ (۳) کربلاء مشرق سے جنوب تک پھیلے ہوئے ٹیلوں کا نام ہے اور اسی مناسبت سے اس آبادی کو کربلاء کہا گیا .

لغت نگاروں اور عوامی روایات کے مطابق اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے : (۱) کربلا : پاؤں کی نرم روی کو کہتے ہیں۔ یہ زمین چونکہ نرم و کشادہ تھی اس لیے کربلا نام پایا؛ (۲) کَرْبَلَتِ الحِنطَۃَ :

گیہوں چھانے اور پھٹکے گئے ۔ چونکہ یہ زمین کنکروں سے خالی ہے، لہٰذا کربلاء کہلائی ۔

(۳) کَرْبَل : ایک کڑوی جنگلی گھاس کا نام ہے ، جو اس میدان میں بھی اُگتی تھی ۔

یہ ایک آشوری نام (کرب وایلا سے مرکب) ہے، اس خیال کی تائیداس سے ہوتی ہے کہ عراق اور اس کے مضافات میں مختلف بستیوں کے نام میں "کَر" موجود ہے، جیسے کَرکُوک اور کَرخ ۔ توفیق وہبی کے نزدیک آشوری میں کار کے معنی ہیں قلعہ یا چاردیواری سے گھرا ہوا قریہ (اصل اسم کرکوک، در مجلّۃ العِرفان، بیروت، رجب ۱۳۹۱ھ) ۔

دریاے فرات اپنے کناروں کی زرخیزی کی وجہ سے صدیوں سے آباد چلا آ رہا ہے ۔ عراق کی قدیم تاریخ میں کلدانی، تنوخی، لخمی اور مناذرہ سلطنتیں مشہور تھیں ۔ اس زمانے میں شہر حیرہ حکومت کا صدر مقام اور عین التّمر یہاں کا مشہور تجارتی مرکز تھا ۔ کربلاء ان دونوں شہروں کے درمیان آباد تھا ۔

عرب نسل کی شاخیں بنو فارم، ایاد اور عرب قبائل کے چند ایک خاندان قدیم زمانے سے ان علاقوں میں آباد چلے آتے ہیں ۔ موجودہ شہر کربلاء کے گرد دور تک پھیلے ہوے ٹیلے ہزار دو ہزار صدی قبل مسیح کے برباد شدہ شہروں کے آثار ہیں ۔ ٹیلوں کے نیچے آشوری ، بابلی ، ساسانی، اموی اور غزنوی، عہد کی تہذیبیں دفن ہیں ۔ سیّد محمّد حسن مصطفٰی کلیدار نے مدینۃ الحسین میں چوالیس ٹیلوں کے نام دیے ہیں ، جن میں خیط نینوی الکاظمی، سلسلہ تُلول نینوٰی السّاقیات بھی ہیں ۔ قریب قریب بستیوں کے آثار اور ناموں کی شہرت کے سبب تاریخ واقعۂ کربلاء کے آغاز میں جب امام حسین رضی اللہ عنہ کی آمد سے متعلق روایات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں متعدد نام ملتے ہیں ۔ حقائق سے بے خبر شخص ان ناموں کو سن کر روایات میں تضاد محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس کی مثال یوں سمجھی جا سکتی ہے جیسے کوئی دہلی کو ہستناپور، تغلق آباد، دلّی اور شاھجہان آباد کے ناموں سے یاد کرے ۔

کربلاء کا میدان فرات کی موجودگی پر بھی قحط آب کے لیے مشہور تھا، اس لیے پرانے بادشاہوں نے نہریں کھدوائی تھیں ۔ سابور ذوالاَکتاف (۳۰۹ تا ۳۷۹ء) نے تو ایک بہت بڑا نہری سلسلہ قائم کیا تھا، جس کے مٹے ہوے آثار اب بھی ملتے ہیں ۔ اس کے بعد ایک اور نہری نظام بنا، جس کی ایک نہر ایک شخص علقمہ سے منسوب ہے ۔ یہ نہریں زمین کی نرمی، خاک کی باریکی اور دریائی مٹی کی آمد سے اٹ جاتی تھیں اور حکومتوں کی افراتفری کی وجہ سے بے آب ہو کر لوگوں کی پریشانی کا سبب بنتی تھیں ۔ لوگ کنویں کھودتے تھے، لیکن وہ بھی زیادہ کارآمد نہ تھے ۔ اس سلسلے میں احتیاطی تدبیریں کیا ہوتی تھیں اور نہروں کی صفائی کب سے ختم ہوئی ؟ اس کا پتا تاریخ سے نہیں چلتا ۔ کہتے ہیں کہ غازان خان ایلخانی نے فرات سے حِلّہ و کربلاء کے لیے نہر کھدوائی تھی اور ۷۰۳ھ میں جب وہ زیارت مشہد حسینی کے لیے آیا تو اہل کربلاء کو غلے اور خوراک کی وافر امداد دی ۔ تاریخ قدیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان فرات کا کربلائی علاقہ بے آبی کی وجہ سے مشہور تھا اور تاریخ کے بعض خطرناک واقعات کی بنا پر خاص نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔

کربلاء عہد اسلام میں : امام حسینؓ کی شہادت کا تذکرہ اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاک کربلا ملاحظہ فرمانا اور اسے سونگھنا ، نیز کربلاء کی مٹی کا حضرت ام المؤمنین ام سلمہؓ کو بطور امانت دینا، متعدد

شیعی مآخذ میں مذکور ہے (الصّواعق المحرقہ، قاہرہ ۱۳۱۲ھ، ص ۱۱۵ و ۱۳۸۵ھ، ص ۱۹۲) - ۳۹ھ میں جب حضرت علیؓ جنگ صفین کے زمانے میں اس طرف تشریف لائے تو کربلاء کا نام سن کر زار و قطار رونے لگے - لوگوں نے پوچھا کہ اس قدر رونے کا کیا سبب ہے ؟ فرمایا : "ایک دن میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر تھا - آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے بتایا ہے کہ حسینؓ شاطی الفرات میں کربلاء نامی جگہ شہید ہوں گے - آپؐ نے مٹھی میں خاک کربلاء لے کر مجھے سونگھنے کو دی تھی، اسی لیے مجھے رونا آ گیا" (الذّہبی : سیر اعلام النبلاء، ۳ : ۱۹۴، ۱۹۵) - ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ مقام کربلا سے گزرتے ہوے ایک جگہ رکے، نماز پڑھی اور فرمایا : "ھٰھنا مناخ رکابھم و ھٰھنا موضع رحالھم و ھٰھنا مھراق دمائھم فتیۃ من آل محمّد یقتلون بھذہ العرصۃ تبکی علیھم، السّماء والارض" یعنی یہاں ان کے اونٹ بیٹھیں گے، یہاں ان کے کجاوے رکھے جائیں گے اور یہاں ان کے خون بہائے جائیں گے ، آل محمد کے کچھ جوانمرد یہاں قتل ہوں گے اور ان پر زمین و آسمان روئیں گے (الصّواعق المحرقہ، طبع ۱۳۸۵ھ، ص ۱۹۲؛ کمال الدّین و تمام النعمۃ، تہران ۱۳۹۱ھ، ص ۵۳۳؛ کتاب الصّفّین، ص ۱۴۰، ۱۴۲) .

محرم ۶۱ھ کی دوسری تاریخ کو امام حسینؓ کربلاء میں خیمہ زن ہوے - انھوں نے یہاں زمین خریدی (المقرّم : مقتل الحسین، ص ۲۳۵) اور ۱۰ محرم ۶۱ھ کو انھوں نے اسی زمین پر اپنی دائمی منزل بنائی - ان کی قبر مبارک ایک نشیب میں تھی، جس کے گرد کچھ اونچے ٹیلے تھے - اسی لیے اس مقام کو شروع شروع میں "الحائر" کہا گیا (مراصدُ الاطلاع، ایران ۱۳۱۵ھ، ص ۱۲۶؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر عبد الجواد : تاریخ کربلاء و حائرالحسین، ص ۱۷ ببعد) .

صفر ۶۲ھ/۶۸۲ء میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کربلا آئے تھے اور اہل بیت بھی شام سے رہائی حاصل ہونے کے بعد یہاں آئے (المقرّم : مقتل الحسین، ص ۳۶۷) - اس زیارت کی یاد میں اب تک ۲۰ صفر کو کربلا میں خاص دن منایا جاتا ہے .

شعبان ۶۵ھ/۶۸۵ء تک کربلا کی آبادی کا باعث یا تو زائرین تھے یا غاضریہ اور لینوا کے باشندے - ۶۵ھ میں ابو اسحٰق مختار بن ابی عبید الثقفی نے بنو امیّہ کے خلاف بغاوت کی اور اسی زمانے میں مزار امام حسینؓ پر ایک چھوٹی سی عمارت بنوائی، جس کا ایک دروازہ مشرق کی طرف تھا اور ایک مغرب کی جانب - ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی - اس سے قبل وہاں ایک بیری کا درخت تھا جسے باقی رکھا گیا - اس عمارت اور درخت کو ہارون الرشید نے ختم کر دیا - المأمون نے اپنے دور میں دوبارہ یہ عمارت بنوائی، لیکن المتوکل نے اسے گرا دیا (الطبری، ۱۱ : ۴۴؛ تاریخ الرّوضۃ الحسینیہ، ص ۹؛ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مقالہ کربلا، تاریخ و تعمیر، در رضا کار، لاہور، محرم ۱۳۹۱ھ) - اس کے بعد تاریخ وار تعمیر و تجدید کا خلاصہ یہ ہے :

المنتصر باللہ (۲۴۷ھ/۸۵۹ء ببعد) نے نئے سرے سے روضہ بنوایا اور راستے میں نشان راہ نصب کیے - ۲۷۳ھ/۸۸۵ء میں یہ عمارت عرفے کے دن منہدم ہوگئی (محمّد حسن : تاریخ کربلاء، ص ۸۹) .

۲۸۳ھ/۸۹۶ء میں محمّد بن محمّد بن زید، حاکم طبرستان، نے ایران سے پتھر بھیج کر شاندار عمارت تیار کرائی .

بقول ابن حوقل (طبع ڈخویه، ص ۱۶۶) - ۳۶۱ھ/۹۷۷ء میں یہاں ایک وسیع گنبد دار عمارت موجود تھی اور زائرین کثیر تعداد میں آتے تھے - کچھ عرصے بعد ضبّہ بن محمد الاسدی نے، جو عین التمر کے متعدد قبائل کا سردار تھا، مشہد الحائر اور دیگر عمارات کو منہدم کرا دیا، جس پر ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں اس کے خلاف ایک مہم بھیجی گئی اور وہ صحرا کی طرف بھاگ گیا (ابن مسکویه، در *The Eclipse of the Abbasid Caliphate*، ۲ : ۳۳۸، ۴۱۴) - اسی سال عضد الدّولہ بویہی نے مشہد، نجف اور مشہد کربلاء کی نگرانی اپنے ذمّے لے لی (ابن الأثیر، ۸ : ۵۱۸ ؛ المستوفی، محل مذکور) اور عمران بن شاهین نے روضے کی تجدید کی .

۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں عضد الدّولہ بویہی نے زیارت کے لیے حاضری دی اور دو شاندار کشادہ حرم اور ضریح کے ایوان پر بڑا گنبد تعمیر کرنے کے علاوہ اندرونِ حرم آرائش و زیبائش، روشنی اور آبادی کا انتظام کیا .

۴۰۲ھ میں بہاء الدّولہ کے وزیر نے قیمتی ہدیے نذر کیے - ۴۰۷ یا ۴۰۸ھ میں حسن بن فضل وزیر نے آتش زنی کے بعد از سر نو روضے کی رونق بحال کی .

۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں ملک شاہ سلجوقی زیارت سے مشرف ہوا - اسی نے شہر پناہ کی تعمیر اور تجدید عمارت کا فریضہ انجام دیا - ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں ناصرالدّین اللہ نے تزئین کرائی - ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں سلطان ابوسعید بہادر خاں بن خدا بندہ کے عہد میں ابن بَطُّوطہ زیارت کے لیے آیا - اس کا بیان ہے : "یہ چھوٹا سا شہر کھجور کے باغوں سے گھرا ہوا ہے - فرات کا پانی زمین سیراب کرتا ہے - وسط شہر میں روضہ ہے - اس میں ایک بہت بڑا مدرسہ اور مہمان خانہ [زاویہ] ہے، جہاں مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے - روضے کے دروازے پر حاجب و دربان ہیں، جن کی اجازت کے بغیر اندر جانا ممکن نہیں - آستانۂ مقدس کا دروازہ چاندی کا ہے ؛ [ضریح مبارک پر سونے اور چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں] اور دروازوں پر ریشم کے پردے ہیں" (تُحفَۃ النُّظّار، [قاہرہ ۱۲۸۸ھ، ۱ : ۱۳۲] .

۷۴۰ سے ۸۲۷ھ تک ایلخانی امرا اور آل جلائر کی بغداد پر حکمرانی رہی، جنھوں نے روضے کی نگہداشت کی - حسن [الجلائری] ۷۵۷ھ میں فوت ہوا تو نجف اشرف میں دفن کیا گیا - مرجان نے، جو اس کے فرزند اُویس کی طرف سے بغداد کا نائب مقرر تھا، بغاوت کر کے کربلاء میں پناہ لی اور اپنی تمام املاک روضے کے لیے وقف کر دیں - اس نے صحن کے شمال مشرق میں ایک شاندار عمارت بنوائی، حرم میں مینار بنوائے اور ان پر سونا چڑھوایا (۷۶۷ھ) ؛ مَرْجان کا مینار اور کچھ اور آثار ۱۳۵۲ھ میں منہدم کرا دیے گئے (تاریخ کربلاء، ص ۱۱۴) - اس کے بعد دو تین سو برس میں کربلاء زیارت گاہ عام اور ایک آباد و با رونق شہر ہو گیا - (مدینۃ الحسین، ص ۱۰۵ ببعد) .

دسویں صدی کے آغاز میں صفویوں نے عراق کا رخ کیا - [۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء تک] شاہ اسمٰعیل عراق اور الجزیرہ وغیرہ پر قابض ہو گیا اور روضۂ امام حسینؓ پر حاضری دی - اس نے شاہانہ حوصلے سے روضے کی تجدید کی اور ایک چاندی کی ضریح نذر کی - [سلطان سلیمان قانونی کے عہد میں عراق ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا - ۹۴۲ھ/۱۵۳۴ء میں سلطان زیارت کے لیے آیا اور نہر الحسینیہ کی مرمت کرانے کے علاوہ ویران اراضی پر باغات لگوائے - ۹۸۲ھ/۱۵۸۴ء میں منارۃ العبد (قبل ازیں موسوم بہ انگشت یار) تعمیر ہوا - ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں سلطان مراد ثالث کے حکم سے بغداد کے والی]

علی پاشا نے گنبد اور عمارت کو دوبارہ بنوایا ۔ ۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس اوّل نے قبر کو سادہ دیکھ کر فولادی ضریح نصب کروائی اور ایوان میں کاشی کاری اور فرش کے لیے قالین کا انتظام کیا ۔ ۱۰۴۷ھ میں سلطان مراد رابع نے گنبد کی مرمت اور بورق سفید سے پوری عمارت پر استر کاری کروائی ۔

۱۱۳۵ھ میں نادر شاہ افشار کی ملکہ نے بڑے پیمانے پر تمام عمارتوں کو بنوایا اور بہت بڑا وقف قائم کیا ۔ ۱۱۵۵ھ میں نادر شاہ خود حاضر ہوا اور حرم میں از سر نو کاشی کاری، آئینہ کاری، اور سونے چاندی کا کام کروایا ، بیش بہا ہدیے پیش کیے اور انتہائی آب و تاب بخشی (بیان واقع، مطبوعۂ لاہور، ص ۱۳۱) ۔

۱۲۱۱ھ میں محمّد شاہ قاجار نے گنبد اور میناروں پر سونا چڑھوایا ۔

۱۸ ذوالحجہ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء میں [محمّد بن] عبدالوہّاب نجدی کے متبعین نے کربلاء پر حملہ کیا، قتل و غارت گری کے علاوہ ان لوگوں نے کربلاء کے روضے لوٹ لیے اور تمام اسباب لے گئے (اَعْیَان الشیعہ، ۴/۱ : ۴۰۴) ۔ فتح علی شاہ قاجار نے اس نقصان عظیم کی شاندار تلافی کی ۔ اب کی مرتبہ کربلاء کی تاریخی تعمیر و آرائش ہوئی اور ۱۲۲۷ھ میں روضۂ انور از سرنو مطلاّ کیا گیا ۔ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء میں اسی بادشاہ نے حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضوں کے گنبدوں پر سونا چڑھوایا ۔ ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ء میں ناصر الدّین شاہ قاجار نے دوبارہ زرکثیر خرچ کرکے طلا کاری کرائی ۔ ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں وہ خود زیارت کے لیے حاضر ہوا اور بہت سے مکانات خرید کر حرم کی توسیع کی اور اوقاف قائم کیے ۔

اس کے بعد سے اب تک کم و بیش کربلاء اور اس کے مقدس مزارات مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے محفوظ ہیں ۔ اہل دل حسب حیثیت خدمت کرتے رہتے ہیں، مثلاً ۱۳۴۱ھ میں سیّد محمّد خزینہ نے مشرقی دروازے پر گھڑی نصب کی ؛ ۱۳۵۸ھ میں بوہروں کے داعی اعظم مُلّا طاہر سیف الدین نے کئی لاکھ روپے کے صرف سے گنگا جمنی ضریح نذر کی، جو قبر اقدس پر موجود ہے ؛ ۱۳۸۶ھ میں ایک ایرانی تاجر قنبر رحیمی نے سبز رنگ کا بہترین ایرانی سنگ مرمر بھیجا تاکہ از سر نو ایوان تیار کیا جائے ۔ اسی انداز پر روضۂ حضرت عباس [اور دوسرے بزرگوں کے مقابر] کی تعمیر و تزئین ہوتی رہی ۔

راقم الحروف نے ۱۳۸۹ھ میں زیارت کے موقع پر پورا شہر، سرسبز و شاداب، صاف و شفاف اور حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضوں کو انتہائی شان و شوکت کے عالم میں دیکھا تھا ۔ ۲۰ صفر کو دنیا بھر کے زائر شہر میں جمع ہوتے ہیں اور دن رات شدید ماتم ہوتا ہے ۔ اس دن کو "اربعین" کی مخصوصی کہتے ہیں ۔ دوسرا اہم اجتماع ۹ ذوالحجّہ کو ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ رجب، شعبان اور محرم کے دس دن کربلاء میں دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں ۔

برصغیر پاک و ہند کے سلاطین ، امرا ، تجار ، اور اہل خیر حضرات بھی صدیوں سے ان روضوں کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں ، سلاطین ہند میں سے محمّد بن تغلق (م ۷۵۲ھ) نے بُغْدَن نامی امیر کے ہاتھ ایک کروڑ تنکے (تقریباً ڈھائی لاکھ روپے) عراق کے مقامات مقدسہ کے لیے بھیجے (خلیق احمد : سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی، ص ۳۸۰) ۔ سلاطین دکن نے بھی ہدیے بھیجے ۔ کچھ بعید نہیں کہ عہد تیموریان ہند میں بھی کچھ خدمتیں انجام دی گئی ہوں ۔

سلطان ٹیپو کے ترکی وفد کا ذکر کرتے ہوے احمد جودت پاشا (تاریخ دولت علیہ، استانبول ۱۲۹۸ھ) نے لکھا ہے: "سید غلام علی شاہ، نور اللہ خان، وغیرہ نے ۲۱ ربیع الآخر ۱۲۰۱ھ میں رئیس الکتّاب سلیمان فیضی افندی سے ملاقات کی اور مختلف مسائل کے علاوہ یہ بھی کہا کہ ٹیپو سلطان التماس کرتے ہیں کہ مکّۂ مکرّمہ، مدینۂ منوّرہ، نجف اشرف، کربلاے معلّٰی، مشہد امام علی المرتضٰی (شاید علی نقی، یعنی کاظمین) اور خانقاہ پیر عبدالقادر جیلانی میں چاندی کے دروازے نصب کرنے اور ان سب کے ساتھ ایک ایک مسافر خانہ اور اس کے اوپر ایک ایک نوبت خانہ، جہاں طبل و کوس بجایا جائے گا، تعمیر کرنے کے لیے اجازت شاہانہ دی جائے (شریف الحسن: در مجلۂ اردو، کراچی، جون ۱۹۷۰ء، ص ۵)۔ اسی طرح آصف الدّولہ نواب اودھ (م ۱۲۱۲ھ) نے کربلاء اور نجف میں متعدد عمارتیں بنوائیں؛ نجف کی نہر آصفی آج تک اسی کے نام سے منسوب ہے (نجم الغنی، ۲: ۲۴۵؛ ماضی النجف و حاضرها، ص ۱۳۱)۔ [اودھ کی] نواب بہو بیگم صاحبہ نے اپنے وقف نامے میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کربلا و نجف کے لیے وقف کیا (طوطا رام: طلسم ہند، ص ۳۷۵)۔ محمّد علی شاہ کی اہلیہ نواب ملکۂ جہاں (م ۹ جولائی ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) جب زیارت کو گئیں تو اپنے مرحوم شوہر کا تاج اور شمشیر مرصع روضۂ حضرت علیؓ کی نذر کرکے لاکھوں روپے اہل کربلاء و نجف پر خرچ کرکے آئیں (حکیم محمّد نقی: منہاج الزائرین، لکھنؤ ۱۳۳۱ھ، ص ۵۰) اور بہت بڑی املاک وقف کی۔

نوابان اودھ کے بعد ریاست ہاے رام پور، محمود آباد اور خیرآباد کے فرمانرواؤں اور لاہور کے قزلباش خاندان نے بھی بڑی دریا دلی سے کربلاء کی خدمت کی۔ ان کے اوقاف اور مقابر و عمارات اب تک کربلاے معلّٰی میں باقی ہیں۔

[کربلا جمہوریۂ عراق میں اسی نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی]۔ بغداد سے کربلاء تک بہت اچھی سڑک جاتی ہے، جس پر اعلٰی درجے کی بسیں اور ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ کئی میل دور سے فضا میں چمکتے ہوے چار سنہری مینار اور دو طلائی گنبد نظر آتے ہیں۔ اس خوبصورت اور نو تعمیر شہر میں حضرت عباسؓ اور حضرت امام حسینؓ کے روضے فن تعمیر و تزئین کے اعلٰی نمونے ہیں، جہاں شب و روز ہزاروں زائرین نماز و تلاوت قرآن، زیارت اور دعا کرتے نظر آتے ہیں۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے (۱) ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار: تاریخ کربلاء و حائر الحسین علیہ السلام، بغداد ۱۳۶۸ھ؛ (۲) سیّد محمّد حسن مصطفٰی آل کلیدار: مدینة الحسین اور مختصر تاریخ کربلا، ایران ۱۳۶۸ھ؛ (۳) عبدالحمید الخیّاط: تاریخ الرّوضة الحسینیه، المصور، بغداد ۱۳۷۶ھ؛ (۴) سیّد غلام علی احسن: رهبر زائران، آگره ۱۳۵۳ھ؛ (۵) سیّد طیب آغا الجزائری: تاریخ کربلاء و نجف، لاهور ۱۹۶۲ء؛ (۶) مرتضٰی حسین فاضل: تاریخ کربلا، تاریخ و تعمیر، در هفت روزۂ رضا کار، لاهور محرم ۱۳۹۱ھ؛ (۷) وهی مصنف: تاریخ روضۂ حضرت عبّاس، در هفت روزۂ شیعه، لاهور، محرم ۱۳۹۱ھ۔

(مرتضٰی حسین فاضل [و اداره])

کَرْت: ایک شاہی خاندان، جس نے [۶۴۳ھ/] ۱۲۴۵ء سے [۷۹۱ھ/] ۱۳۸۹ء تک ہرات پر حکومت کی۔ اس کی بنیاد شمس الدّین محمّد اوّل کَرْت نے رکھی تھی جو غور کے شَنْسَبانی گھرانے سے تھا۔ یہ گھرانا وہی ہے جس کے افراد میں غیاث الدّین محمّد اور معزّالدّین محمّد بن سام دونوں بھائی شامل ہیں۔ *

چنگیز خان کی فوجوں کی تاخت و تاراج کے بعد جب ہرات کی حالت کچھ سدھر گئی تو شمس الدّین نے رفتہ رفتہ اقتدار حاصل کر لیا اور ۱۲۴۵ء تک یہاں اس کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس نے بالآخر مَلِک کا خطاب اختیار کیا، جسے اس کے جانشین بھی استعمال کرتے رہے۔ ۱۲۵۱ء میں جب خان اعظم مَنْگو [قاآن] اپنی سلطنت کا نظم و نسق درست کر رہا تھا تو اس نے شمس الدّین کرت کو ہرات، سیستان، بَلخ اور اس علاقے کا والی برقرار رکھا جو ان صوبوں اور ہندوستان کی سرحد کے درمیان تھا۔ شمس الدّین کے عہد کے آخری ایام میں اس کا بیٹا رکن الدین کاروبار حکومت میں اس کا شریک رہا، لیکن ۱۲۸۳ء میں وہ باپ کی زندگی ہی میں وفات پا گیا۔ ۱۲۸۵ء میں شمس الدین کا انتقال ہوا تو رکن الدّین کا بیٹا فخر الدّین اس کا جانشین ہوا۔ جس وقت ایران کے ایلخانی مغول بادشاہوں کی طاقت زوال پذیر تھی، ہرات کے کرت ملوک کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ فخر الدین نے اس زمانے کے طاقتور امیر چوبان سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے، جو چودھویں ایلخانی بادشاہ ابوسعید بہادر خان کی کمسنی کے دوران میں ایران کا نائب السلطنت رہ چکا تھا [دیکھیے ذیل جامع رشیدی، ص ۶۹]۔ جب ابوسعید بہادر نے چوبان کے خاندان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر اس پر حملہ کیا تو امیر چوبان نے غیاث الدّین کے ہاں پناہ لی۔ غیاث الدّین نے اسے پناہ تو دے دی، لیکن ۱۳۲۷ء میں اسے اور اس کے بیٹے جَلَو خان کو غداری سے قتل کر ڈالا [دیکھیے ذیل جامع رشیدی، ص ۱۳۲ ببعد]۔ خود غیاث الدّین ۱۳۲۸ء میں فوت ہو گیا اور اس کے دو بڑے بیٹے شمس الدّین ثانی اور حافظ، جو یکے بعد دیگرے اس کے جانشین قرار پائے تھے، علی الترتیب ۱۳۲۹ء اور ۱۳۳۱ء میں وفات پا گئے۔ حَمْدُاللہ المستوفی مؤرخ کا کہنا ہے کہ اتنے مختصر وقفوں سے ان باپ بیٹوں کا لقمۂ اجل ہو جانا قہر خداوندی کا نتیجہ تھا، جو ان پر امیر چوبان سے غیاث الدین کی غداری کی وجہ سے ٹوٹا۔

حافظ کے بعد اس کا تیسرا بھائی معز الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے کرمان کے ملک قطب الدین کی مدد کے لیے جسے امیر مبارز الدّین نے اس کے دارلسلطنت سے نکال باہر کیا تھا، فوج روانہ کی، لیکن فوج نے ہزیمت اٹھائی۔ پھر قطب الدّین کی اعانت کے لیے ایک اور لشکر بھیجا گیا جو کرمان میں محصور ہو گیا اور بالآخر ۱۳۴۰ء کے اواخر میں اسے ہتیار ڈالنے پڑے۔ معزّ الدّین کا انتقال ۱۳۷۰ء میں ہوا۔ اس نے دو بیٹے چھوڑے: محمّد، جو سَرخْس کا والی تھا، باپ کی وفات کے بعد بدستور وہاں کا والی رہا اور دوسرا بیٹا غیاث الدّین پیر علی ہرات میں معزّ الدّین کا جانشیں قرار پایا۔ ۱۳۸۰ء میں امیر تیمور نے ایک قاصد ہرات بھیجا تاکہ [آغاز بہار میں جب امرا اور بڑے بڑے نواب "قور لتای" کے لیے جمع ہوں تو] وہ بھی ایک دستۂ فوج کے ساتھ حاضر ہو، لیکن غیاث الدّین پیر علی نے قاصد کو لطائف الحیل سے روکے رکھا اور اس دوران میں شہر کے اندر ضروری سامان خوراک جمع کر کے اس کے دفاعی استحکامات مکمل کر لیے۔ قاصد کو ناچار اپنی سفارت کی ناکامی کی اطلاع دینے کے لیے سمرقند لوٹنا پڑا [ظفرنامۂ یزدی، ۱: ۳۰۳]۔ ۱۳۸۱ء کے موسم بہار میں امیر تیمور نے ہرات کی جانب یلغار کی اور چند روز کے محاصرے کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے والی اور اس کے سب سے بڑے بیٹے پیر محمّد کو گرفتار کر لیا، ہرات کے بعض ممتاز شہریوں کو شہر سبز میں جلا وطن کر دیا گیا، تمام استحکامات مسمار کر دے گئے [اور ہرات کے آہنیں دروازے جنھیں نقوش اور

کتبوں سے آراستہ کیا گیا تھا سمرقند منتقل کر دیے گئے] ۔ مَلِک اور اس کے دو بیٹوں کو معاف کر دیا ۔ ان میں سے چھوٹے بیٹے (امیر غوری) کو اشکلچہ کا مستحکم قلعہ حوالے کر دینے پر آمادہ کر لیا گیا تھا ۔ غیاث الدّین پیر علی کو تیمور کے باج گزار کی حیثیت سے ہرات پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی، تاآنکہ ۱۳۸۹ء میں اس خاندان کا چراغ گل ہوگیا ۔

مآخذ : (۱) الجُوَیْنی : تاریخ جہان گشای؛ (۲) حَمْد اللہ المُسْتوفی القزوینی : تاریخ گزیدہ، یہ دونوں کتابیں سلسلۂ یادگار گب میں شامل ہیں؛ (۳) کرت نامہ صدرالدّین خطیب بوشنجی جو اب ناپید ہے، مگر تاریخ نامۂ ہرات کے مختلف مقامات میں بقول مصحح کتاب مذکور اس کے ۲۵۰ بیت نقل ہوے ہیں)؛ (۴) مولانا شرف الدّین علی یزدی : ظفر نامہ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سلسلۂ مطبوعات میں؛ (۵) شہاب الدّین احمد بن عرب شاہ : عجائب المقدور فی اخبار تیمور، طبع کبیر الدّین احمد، کلکتہ ۱۸۸۲ء؛ (۶) سیف بن محمّد الہروی : تاریخ نامۂ ہرات طبع محمّد زبیر صدیقی، کلکتہ ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۱ تا ۷۸۶؛ (۷) حافظ ابرو : تاریخ و نسب ملوک کرت، دیکھیے فہرست مخطوطات تاریخی، در کتاب خانہ ہاے استانبول؛ (۸) حافظ ابرو : ذیل جامع التّواریخ رشیدی، طبع دکترخان بابا بیانی، تہران ۱۳۱۷ھ، ص ۱۸ ببعد و بمواضع دیگر بمدد اشاریہ خصوصًا بذیل فخر الدّین ملک، غیاث الدّین ملک و امیر چوبان؛ (۹) معین الدّین اسفزاری : رَوْضات الجَنّات فی تاریخ ہرات، نسخۂ دانش گاہ پنجاب، ورق ۹۷ تا ۱۶۱]؛ (۱۰) Stanley Lane Pool : *The Mohammadan Dynasties*، لنڈن ۱۸۹۴ء .

(T. W. Haig)

* **الکُرَة** :(ع؛ گلوب، Sphere)؛ عربوں نے کُرے کے خواص کا اقلیدس، آرشمیدس اور تھیوڈوسیس کے تتبع میں مطالعہ کیا تھا ۔ انھوں نے علمِ مثلث کروی کے بعض ایسے اصولوں سے بھی بحث کی تھی جو نظریۂ علم ہیئت کے بنیادی اصول ہیں، یعنی "شکل اَلْقطاع" (Transversal) کا اصول، چار مقادیر کا اصول (شکل المُغْنِی) اور سائے یعنی Tangent کے اصول سے (الشّکل الظِلّی)، مینلاس Menelaus اور بطلمیوس کے تتبع میں (ترجموں کے بارے میں دیکھیے M. Steinschneider، در *ZDMG*، ۱۸۹۶ء، ۱ : ۱۶۱ ببعد؛ ریاضیات کے اصولوں سے H. Bürger و K. Kohl نے بحث کی ہے : *Axel Bjornbo Thabits Werk über den Transversalensatz*، در *Abhandl. zur Gesch. Der Naturwissenschaft und Medizin*، ۱۹۲۴ء، جزو ۷، ص ۱ تا ۹۱، وہاں قدیم ترکتابوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں .

۲۔ الکرة ذات الکرسی (گولا مع محور axe کے) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے :

(الف) آسمانوں یا افلاک کا کرہ (کرہ کے بدلے ہم اسی مفہوم میں لفظ البیضة (=انڈا) بھی پاتے ہیں جیسے مثلًا در مفاتیح العلوم؛ ص ۲۳۵؛ البتانی : *Opus Astronomicun*، طبع C. A. Nallino، ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۳۸؛ E. Wiedemann : *Beitr*، ج ۳، *SBPMS*، *Erlg*، ۱۹۰۵ء، ۳۷ : ۲۳۹ ببعد) ۔ مجموعۂ نجوم (Constellations) کو کرے پر نقش کیا جاتا ہے ۔ اسے ایک چوڑی (ring) میں رکھ دیا جاتا ہے جو تین یا چار پایوں پر نصب ہوتی ہے ۔ ایسے کرے شاید ہپارکس Hipparchus نے بھی اپنے زمانے میں تیار کیے تھے اور ان کا بیان لکھا تھا، اور بہرحال بطلمیوس نے تو یہ کرے بنائے تھے ۔ بطلمیوس کا بیان المجسطی کے عربی ترجموں اور بعض علٰحدہ رسالوں میں دیا گیا ہے ۔ ثانیے کا ایک کرہ، جو غلط طریقے پر بطلمیوس سے منسوب کیا جاتا ہے، ابن السندبدی [= ابن السنبدی] نے ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ -

۴۴۰۱ء میں قاہرہ میں دیکھا تھا (دیکھیے ابن القفطی، ص ۴۴۰ [جہاں چاندی کے ایک بڑے وزنی کرے کا بھی ذکر ہے جو صوفی ابو الحسین نے عضد الدّولہ کے لیے بنایا تھا]) ۔ کچھ کرے لکڑی کے بنائے جاتے تھے اور ان پر کاغذ یا مختلف دھاتوں کا خول چڑھا دیا جاتا تھا ۔ دھات کے کھوکھلے کرے بھی بنائے جاتے تھے اور انھیں پھر لکڑی کے کروں سے باندھ دیا جاتا تھا ۔ عَلَم الدّین قیصر التعاسیف ایک لکڑی کا کرہ استعمال کرتا تھا جس پر سنہری ملمع تھا (ابو الفداء، طبع Reiske، ۴ : ۴۷۹، H. Suter، عدد ۳۵۸)۔ ان کروں کی تیاری اور ان غلطیوں سے جو ان میں واقع ہوتی ہیں، البیرونی نے تفصیلی بحث کی ہے (*Beiträge zur Gesch. der Mathematik.* وغیرہ، در *Abhandl. zur Gesch. der Naturwiss. und Medizin.*، جزو ۴، ۱۹۲۲ء، ص ۹۷ تا ۹۳) ۔

وہ آلۂ ہیئت جو الادریسی نے (صقلیہ کے) شاہ روجر Roger کے لیے تیار کیا تھا، بظاہر ایک چوڑی دار کرہ تھا ۔

(ب) "الکرۃ ذات الکرسی" ایک ایسا آلہ بھی ہے جس سے افلاک کی حرکتوں کا پتا چلتا ہے ۔ افقی چوڑی کا رخ افق کی جانب رکھا جاتا ہے ۔ اس میں دو متقابل نقطوں پر زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے دو کھانچے بنائے جاتے ہیں ۔ ان کھانچوں میں دائرۂ نصف النہار (meridian) کی چوڑی رکھی جاتی ہے اور اسے ایک نالی (groove) میں اپنی سب سے نیچے کی جگہ پر جانے دیا جاتا ہے ۔ خود کرہ ایک محور کے گرد گھومتا ہے جسے نصف النہار کی چوڑی میں دو متقابل نقطوں پر گول سوراخوں میں رکھ دیا جاتا ہے ۔ افقی اور نصف النہار کی چوڑیوں پر تقسیم کے نشانات بنا دیے جاتے ہیں ۔ نصف النہار کی چوڑی کو اس کے کھانچوں میں گھمانے سے کرے کے محور کو حسب مرضی افق کی جانب جھکایا جا سکتا ہے اور اس طرح یہ آلہ سب اعراض البلد (latitudes) کے لیے استعمال ہوسکتا ہے ۔ ایک ربع دائرۂ زاویہ پیما (quadrant) کے ذریعے جس پر تقسیم کے نشانات ہوتے ہیں اور جسے کرے پر ٹکا سکتے ہیں کئی اقسام کی پیمائشیں کی جا سکتی ہیں ۔ اس کرے سے ہیئت کی اہم مقادیر، الطالع، المطالع، زمین کے سہاروں (.props) وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں ۔

اس موضوع پر قدیم ترین عربی تصنیف قُسطا بن لوقا [رک بآں] کی ہے، مثلاً طبع المرّاکشی ۔ ممکن ہے کہ اس کا تعلق اصل کلاسیکی تصانیف سے ہو، جو ان تعلقات کی بنا پر جو مصنف کے یونانیوں سے تھے، اغلب معلوم ہوتا ہے ۔ اس کا لاطینی میں ترجمہ بھی ہوا تھا اور اسپانوی زبان میں قشتالہ کے الفانسو Alfonso نے بھی کیا تھا (*Libros del Saber*، ج ۱) ۔

اگر کرے کو خارج کر دیا جائے اور افقی اور نصف النہار کی چوڑیوں میں کئی ایسی چوڑیوں کا اضافہ کر دیا جائے، جو دوائر افلاک کے مطابق ہوں تو یہ چوڑی دار (armillary) کرہ بن جاتا ہے (آلۃ ذات الحَلَق)، یعنی وہ چوڑی دار آلہ جس پر قدیم لوگوں، عربوں اور بالخصوص قشتالہ کے الفانسو نے بہت محنت اور توجہ سے کام کیا ہے ۔

مآخذ : (۱) B. Dorn : *Drei astrononische Instrumente*، در *Mém. de l' Acad. impériale des Sciences de St. Petersbourg.*، سلسلہ ۷، ج ۹، عدد ۱، ص ۳۱؛ (۲) L. Am. Sedillot : *Mém. sur les instruments astronomiques des Arabes*، در *Memoires présentes par divers savants 'a l' Acad. R. des inscriptions*، پیرس ۱۸۴۴ء، سلسلہ ۱، ۱ : ۱ تا ۲۲۹؛ (۳) F. Nolte : *Über die Armillarsphäre*

abhandl. zur gesch. Natuwissensch، وغیرہ ۲ : ۱ تا ۵۰، Nolte نے قدیم تر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

۳۔ الکرۃ المحرّقہ : جلانے والا کرہ، قدیم لوگوں کو بھی بلور اور شیشے کے بنے ہوئے کروں کی یہ خاصیت معلوم تھی کہ وہ سورج کی اس روشنی کو جو ان پر پڑتی ہے ایک نقطے پر مرتکز کر دیتے ہیں اور وہاں جو جلنے کے قابل چیز ہو اسے جلا دیتے ہیں، لیکن ہمیں ایسی کچھ علامات نظر نہیں آتیں کہ کسی قدیم عالم نے اس مظہر کے نظریے سے بحث کی ہو۔ ابن الہیثم اور کمال الدّین الفارسی نے اس نظریے کا بہت قابلیت سے مطالعہ کیا۔ ابن الہیثم اپنی بحث کی ابتدا اور روشنی کی کسی ایسی شعاع کے، جو شیشے کی صاف اور چکنی سطح پر پڑتی ہے، زاویۂ وقوع، زاویۂ انحراف اور زاویۂ انتشار کی اقدار سے کرتا ہے، جنھیں بطلمیوس کی ایک جدول میں بیان کیا گیا ہے اور جنھیں اس نے خود بھی جمع کیا تھا۔ وہ اس راستے کی تحقیق کرتا ہے جو شعاعیں اس وقت اختیار کرتی ہیں جب وہ محور سے، جسے سورج اور کرے کے درمیان کھینچا گیا ہو، کرے کی سطح پر مختلف فاصلوں سے آ کر گرتی ہیں۔ ان تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انتشار کے بعد یہ سب شعاعیں کرے کی بالمقابل سطح پر ایک چھوٹی سی جگہ (Section) میں باہم مل جاتی ہیں اور وہاں سے وہ پھر اس طرح باہر نکلتی ہیں کہ ان کی سمت بدل جاتی ہے اور وہ محور کو کرے سے مختلف فاصلوں پر قطع کرتی ہیں؛ تاہم ان میں سے پیشتر ایک نقطے پر مل جاتی ہیں جو کرے کے نصف قطر سے کم فاصلے پر ہوتا ہے اور یہی جلانے کا نقطہ ہوتا ہے۔ اگر شعاعوں کی اس مخروط (cone) میں جو اس نقطے سے نکلتی ہوئی شعاعوں سے بنتی ہے، کچھ اشکال یا تصاویر (drawings.) رکھ دی جاتی ہیں، مثلاً ایک مدور سرخ سطح جس پر ایک سیاہ چوڑی ہو اور انھیں کرے کے سامنے سے دیکھا جائے تو عجیب و غریب شکلیں نظر آئیں گی۔ ابن الہیثم اور کمال الدّین نے ان سے بھی بہت مفصل بحث کی تھی اور وہ اسی زمانے میں ان نتائج تک پہنچ گئے تھے جن تک ان کے بعد کے زمانے میں Sehellbach پہنچا۔

مآخذ (۱) J. Wurschmidt : *Die Brennkugal*، در *Monatschefte für den naturwissenschaftl unterricht*، ۱۹۱۱ء، ۴ : ۹۸ تا ۱۱۳؛ (۲) E. Wiedemann : *Beitr.*، ج ۹، *Über die Brechung des Lichtes in kugeln nach Ibn al-Haitam una Kamal al Din al-Farisi*، در *Erlg. SBPMS*، ۱۹۱۰ء، ۴۲ : ۱۵ تا ۲۸، نیز دیکھیے حوالے، در مقالات قوس، قزح، کمال الدّین الفارسی۔

(E. WIEDEMANN)

کرْج : (گرجستان) (روسی = گرزجہ Gruzija؛ * فارسی اور ترکی = گُرْدُسْتان اور گُرْجِسْتان اور گرجستانی = Sakharthvello) وسیع تر مفہوم میں مغربی اور وسطی ماورائے قفقاز (Transcaucasia) کا وہ علاقہ جس میں خسر تویلی (Khartwelian) زبان بولنے والے لوگ بستے ہیں اور جو بحیرۂ اسود سے لے کر تفلس کے شمال مشرق میں ۶۰ میل سے زیادہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے محدود تر معنوں میں مراد عملی طور پر تفلس کا ضلع یا صوبہ (gouverne-ment) ہے۔ جغرافیے کے نقطۂ نظر سے جو اب بھی کسی حد تک درست سمجھا جاتا ہے، گرجستان کختھیا Kakhethia کے صوبوں اور ضلعوں نیز تھشتھیا Thushethia، پشویا Pshawia و خوسریا Khewsuria، کرتھلیا Karthlia، امرتھیا Imerethia، گُریا Guria، مِنگرلیا Mingrelia اور مشْخیا Meskhia

کے کوهستانی اضلاع پر مشتمل هے ۔ خرتویلی (Kharthwelion) زبانوں میں گرجستانی، منگرل، لیسی (Lasian) (آخرالذکر زبان صرف ترکی سرحد کے انتہائی جنوب مشرقی گوشوں میں بولی جاتی هے بحالیکہ لَیْسیْ Lases جنھیں Ts' ans تشْنَن بھی کہا جاتا هے ترکی میں رهتے هیں) اور سَوانی (Swanian) زبانیں شامل هیں ۔ مؤخرالذکر زبان سَوَنتھیا Swanethia میں اور منگرل زبان منگرلیا میں بولی جاتی هے ۔ بیشتر خرتویلی (Kharthwel) لوگ عیسائی هیں اور قدیم یونانی کلیسا سے تعلق رکھتے هیں ۔ صرف بعض مقامات پر انھوں نے اسلام قبول کر لیا هے، جیسے انتہائی مشرقی علاقے میں، سَکَتھَل Sakathal کے ضلع میں اِنگلوس Engiloes نے (گرجستانی زبان) نیز سارے جنوب مشرقی علاقے اور باطوم کے ضلع میں Adjars اجر نے (لَیْسیْ Lases بھی مسلمان هیں) ۔ گرجستان میں ضلع چُروچ Čoroch میں اور کُوْرَہ نْدی کے بالائی مجرٰی، یعنی ضلع اردگن Ardagan اور اضلاع اَخْلَچِخْ Akhalcikh [رک بآں] اور اَخَلْخَلْخی Akhalkhalakhi میں بہت سے لوگ گرجستانی زبان ترک کر چکے هیں حالانکہ ان علاقوں میں آج سے دو سو سال پہلے تک گرجستانی زبان بولی جاتی تھی، لیکن اب اس کی جگہ ترکی زبان نے لے لی هے ۔ یہ لوگ اپنی زبان اور اصل کو فراموش کر چکے هیں اور اپنے آپ کو ترک کہتے هیں ۔

گرجستان کی تاریخ کے ابتدائی ادوار تاریکی کے پردے میں پوشیدہ هیں ۔ کرتھلیا Karthlia اور کخیتھیا Kakhethia کے علاقے ایک نئی ریاست کا مرکز تھے ۔ شروع زمانے هی میں خرتھول Kharthwel کا مغربی حصہ بوزنطی حکومت کے ماتحت هوگیا تھا اور یہیں سے عیسائی مذهب، جو مشرقی رومی کلیسا کی شکل میں تھا، سارے مغربی ماورائے قفقاز میں پھیلا ۔ خیال کیا جاتا هے کہ سینٹ نینو Nino نے یہاں کے لوگوں کو عیسائیت سے روشناس کیا ۔ روایت هے کہ چوتھی صدی عیسوی میں (تاریخوں میں اختلاف هے) اس خاتون کی دعوت پر شاہ مریاں Mirian نے عیسائی مذهب قبول کیا ۔ ۶۸۰ء میں قسطنطنیہ میں عیسائیوں کے چھٹے اجتماع میں گرجستانی کلیسا کو آزادی عطا کی گئی ۔

چونکہ گرجستان ایک ایسے حلقے کے مرکز میں واقع هے، جس کے اطراف میں بہت سی طاقتور حکومتیں قائم هوتی رهی هیں، اس لیے ۱۸۰۱ء تک، یعنی جب تک اسے سلطنت روس میں شامل نہیں کر لیا گیا، یہ ملک خوفناک انقلابات سے دوچار رها ۔ ساتویں صدی عیسوی تک بوزنطی اور ایرانی اس پر قبضہ کرنے کے لیے باهم لڑتے رهے ۔ ۶۲۷ء (ساسانیوں پر هرقل (Heracleus) کی فتح) کے بعد تھوڑا هی عرصہ گزرا تھا کہ عربوں نے گرجستان پر چڑھائی کر دی ۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر سے (بوزنطیوں کی اعانت سے) جنوبی گرجستان میں بگرتیوں (Bagratids) کی طاقت بڑھنے لگی ۔ گیارهویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ آل سلجوق نے فتح کر لیا ۔ جب صلیبی جنگجو بیت المقدس میں داخل هوگئے تو "داؤد المجدد" (David the Renovator) ۱۱۰۰ء میں ترکوں کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب هوگیا ۔ اس بادشاہ کے عہد میں (۱۰۸۹ تا ۱۱۲۵ء) گرجستان میں خوش حالی کا دور شروع هوا، جو تھمر Thamar (۱۱۸۴ تا ۱۲۱۲ء) کی موت کے بعد تک جاری رها ۔ تیرهویں سے سولهویں صدی عیسوی تک اس نے بہت سے انقلاب دیکھے ۔ تاتاری حملوں نے ملک پر نہایت تباہ کن اثرات چھوڑے (صرف تیمور هی نے ۱۲۰۳ء کے درمیان اس ملک پر چھے بار حملے کیے) ۔ بگرتیوں کی قیادت میں ملک ابھی مشکل سے متحد هونے پایا تھا کہ پندرهویں

صدی عیسوی میں یہ تین بادشاہتوں، یعنی کرتھلیا Karthlia، کخیتھیا Kakhethia اور اِمرتھیا Imerethia کی تین مملکتوں اور دیگر پانچ ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔ اس کے بعد سے اس کی تاریخ صرف ایک ملک کی تاریخ نہیں رہی۔ بوزنطی سلطنت کے زوال کے بعد گرجستان کا کوئی محافظ باقی نہ رہا اور اب تاتاریوں، ترکوں، ایرانیوں اور لسغیون Lesghia کے حملے جلد جلد ہونے لگے۔ ایرانی اثر خاص طور پر بہت بڑھ گیا، حتّٰی کہ سترھویں صدی عیسوی میں کرتھلیا اور کخیتھیا کے بادشاہ کی حیثیت صرف شاہ ایران کے ایک والی کی سی رہ گئی۔

گرجستان کی امیدوں کا واحد مرکز روس تھا اور قدیم زمانے میں گرجستان نے امداد کے لیے اس کی طرف رجوع کیا تھا۔ ۱۵۵۸ء میں کخیتھیا کے بادشاہ لیون دوم (Lewan II) نے ایرانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زار ایوان چہارم (Iwan IV) کی اعانت طلب کی۔ اسی طرح شاہ عباس اعظم کے زمانے میں الیگزنڈر نے بورس فیوڈ وروویچ گوڈونوف Boris Feodorowitch Godunow سے مدد مانگی۔ ۱۶۱۹ء میں تیموراز Teimuraz نے خاندان رومانوف (Romanow) کے پہلے زار مائیکل فیو ڈوروویچ Micahil Feodorowitch کے پاس ایک سفیر بھیجا، لیکن تا حال روس کو گرجستان میں اپنا کوئی مفاد نظر نہیں آتا تھا، اس لیے وہاں صورت حال جوں کی توں قائم رہی۔ کہیں اٹھارھویں صدی عیسوی میں جا کر گرجستان نے شاہ وختنگ Wakhtang ششم کے دور حکومت میں ایک بار پھر قوت حاصل کی۔ ہرقل (Heraclur) دوم (۱۷۶۲ تا ۱۷۹۸ء) نے ایک بار پھر ترکوں، ایرانیوں اور لسغیوں کے حملوں کا میلاب کامیابی سے روکا، لیکن جب وہ فوت ہو گیا تو ملک اندرونی مصائب (۱۷۷۰ء میں طاعون کی وبا، ۱۷۹۵ء میں آغا محمّد خان ایرانی کے ہاتھوں تِفلس کی تباہی) اور دیگر اسباب سے اس قدر کمزور ہو چکا تھا، کہ ہرقل کے جانشین جارج George دوازدھم نے اپنا ملک روس کی حفاظت میں دے دینے کا ارادہ کر لیا۔ چند سال بعد (۱۸۰۴ء میں) اِمرتھیا بھی روسی صوبہ بن گیا۔ اس سے ایک سال پہلے منگریلیا بھی روسی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا اور ترکوں اور ایرانیوں کی آخری جنگ کے بعد کرتھولز Kharthwels، کا غزمان Kaghizman، اردگان Ardgan، اولٹی Olty، ارْتوِن Artwin، باطوم (اور کرس [قارص]) کے جنوب مغربی اسلامی اضلاع پر بھی روس کا قبضہ ہو گیا [رک بہ آرمینیا]۔

مآخذ : (۱) دیکھیے Brosset کی تصانیف خصوصاً *Histoire de la Géorgie*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۸ء؛ (۲) *Skizzen oüs der Geschichte* : W. E. Romanowskij (Russisch) *Georgiens*، تفلس ۱۹۰۲ء؛ (۳) Arth. Leist : *Das Georgische Volk*، *Dresden* ۱۹۰۳ء؛ (۴) J. Marquart : *Osteurop. und ostasiat. Streifzüge*، ص ۱۷۷ تا ۱۸۸ و ۳۹۱ تا ۴۳۶ [۱۹۳۹ء سے گرجستان Georgian Soviet Socialist Republic کے نام سے USSR کی ایک جمہوری ریاست ہے؛ جس کا رقبہ ۶۹۷۰۰ مربع میل ہے اور آبادی جنوری ۱۹۷۱ء میں پچاس لاکھ دس ہزار تھی، دارلحکومت تفلس (Thilesi) ہے]۔

(A. DIRR)

کِرچ : Kertch جزیرۂ قریم (کریمیا) کا ایک * قصبہ اور قلعہ؛ [۱۹۶۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی پچاس ہزار تھی]۔ قدیم زمانے میں یہاں Pantikapaion کی یونانی نو آبادی تھی جو آگے چل کر بوس پروس Bosporos کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی نام کی سلطنت کا دارالحکومت بنی۔ سترھویں صدی عیسوی کے آخری ایام سے یہاں قریم کے مشرقی حصے کے خزروں کے امیر

(جس کا لقب تُدُن تھا) کا صدر مقام رہا (مغربی حصہ جس کا دارالحکومت خرسونوس Khersonesos تھا ان دنوں بوزنطی سلطنت ہی میں شامل تھا) ۔ کرچ کا نام سب سے پہلے اسلامی مآخذ میں آیا ہے، جہاں اسے مختلف شکلوں میں لکھا گیا ہے (کرز اور الکرش کے بارے میں) جو حوالے J. Marquart : *Osteuropaische und ostasiatische Streifzüge*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، ص ۵۰۶ میں ہیں، ان میں رکن الدّین بیبرس، در W.Tiesenhausen : *Sbornik Materialov, otnosyashchikhsya k istori Zolotio Ordi*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۴ء ص ۸۹، ۵ (جہاں کرچ لکھا ہے) کا اضافہ کر لیجیے ۔ Marquart کتاب مذکور میں بعض روسی محققین (Wassilyewski، Bruun، Harkavy Kunik) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نام یونانی لفظ Κόριξος یا Κυριξος سے نکلا ہے، جو کرچ کے قریب ایک خانقاہ کا نام ہے (قدیم روسی مآخذ میں اس قصبے کا نام کورچو Korčew لکھا ہے، مثلاً اس مشہور کتبے میں جو ۶۵۷۶ (۱۰۶۸ء میں لکھا گیا ہے اور جسے Karamzin نے *Istoriya gosudarstva Rossiyskago* ج ۲، حاشیہ ۱۲۰ میں نقل کیا ہے) ۔

روسیوں اور بوزنطیوں کی متحدہ فوجوں کے ہاتھوں سلطنت خزر کی آخری تباہی کے بعد ۱۰۱۶ء کے قریب قریم کا مشرقی حصہ جس میں کرچ بھی شامل تھا، ایک روسی ریاست T'mutarakan کے قبضے میں آ گیا ۔ اس ریاست کا اسی نام کا صدر مقام جزیرہ نمائے تَمَن Taman میں کرچ کے بالمقابل واقع تھا ۔ تقریباً ایک صدی بعد اس ریاست کے چٹیل میدانوں پر قپچاق یا کومن Koman قابض ہو گئے اور بندرگاہیں بوزنطی سلطنت کے قبضے میں آ گئیں جیسا کہ Yu. Kulakowski (*Proshloye Tavridi*، بار دوم، کیف ۱۹۱۲ء، ص ۹۳، میں Miklosich و Müller = *Acta et dipl. gr. medi aevi*، ۳ : ۲۵ کی سند پر) خیال ظاہر کیا ہے ۔ Ρωσία کے شہر کو جس کا شہنشاہ مینول گومننوس Manuel Komnenos اور جمہوریۂ جینوآ کے درمیان ۱۱۶۹ء ایک معاہدے کے سلسلے میں ذکر آیا ہے، روسی کورچو Korcew ہی سمجھنا چاہیے ۔ تیرھویں صدی عیسوی کے بعد جزیرہ نمائے قدیم التون اردو کی تاتاری حکومت میں شامل کر لیا گیا ۔ ۶۹۸ھ/ اکتوبر ۱۲۹۸ء تا ستمبر ۱۲۹۹ء میں نوغای نے اپنے پوتے کا انتقام لینے کے لیے جو کَفَہ میں مارا گیا تھا، کرچ اور اس کے ساتھ کریمیا کے چند دوسرے شہروں کو تباہ و برباد کر دیا (Tiesenhausen : کتاب مذکور) ۔ پندرھویں صدی عیسوی میں کرچ پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہوگیا ۔ ازوف Azov کی فتح کے بعد ۱۶۹۸ء میں پیٹر اعظم نے وی انا میں اپنے قیام کے دوران میں جب کہ ترکوں سے صلح کی گفت وشنید ہونے والی تھی، یہ مطالبہ کیا کہ کرچ کا الحاق روس کے ساتھ ہو جائے، لیکن یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا ۔ اسی سال صلح نامہ قارلووچ Carlowicz طے پایا تو کرچ بدستور ترکوں کے قبضے میں رہا (J. Von Hammer : *Geschichte des Osmān-ischen Reiches*، بار دوم، ۳ : ۹۰۹؛ S. Solowyew : *Istoriya rosii, izd. tovar. Obshčestv. Pol'za*، ۳ : ۱۱۷۱) ۔ روسی حملے کا خطرہ محسوس کر کے سلطان مصطفٰی ثانی نے ۱۷۰۲ء میں کرچ کے قریب ہی ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا (جسے اب یِنی قلعہ کہتے ہیں، V. Hammer : کتاب مذکورہ، ۴ : ۴۷) ۔ ۱۷۷۱ء میں کرچ اور یِنی قلعہ پر روسی بغیر مزاحمت قابض ہو گئے ۔ ابازہ پاشا کو جسے یِنی قلعہ کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا، اپنی فوجیں مقابلے پر لانے کی ایک بار بھی جرأت نہ ہوئی اور وہ سینوب Sinope واپس چلا گیا (کتاب مذکور، ۴ : ۶۲۲؛

Solovjew، کتاب مذکور، ۶ : ۷۳۸) - بخارسٹ میں صلح کی گفت و شنید کے دوران میں (۱۷۷۳ ع) کرچ کے الحاق کے روسی مطالبے کو ترک برابر نامنظور کرتے رہے (v. Hammer، کتاب مذکور، ۴ : ۶۳۸)، لیکن بالآخر عہد نامۂ کوچوک قینارجہ (۱۷۷۴ع) میں انھیں یہ مطالبہ ماننا ہی پڑا - اس کے بعد کرچ کو ایک دوسرے درجے کے روسی قلعے کی حیثیت حاصل رہی - جنگ قریم (کریمیا) کے دوران میں اس پر مئی ۱۸۵۵ع میں اتحادی فوجوں کا قبضہ ہوگیا تھا .

اس بستی میں یونانی، رومی اور ابتدائی مسیحی ادوار کی یادگار عمارتیں موجود ہیں اور ان کی بنا پر یہ دنیا میں مشہور ہے، لیکن چونکہ اسلامی دور حکومت میں اسے یہ اہمیت حاصل نہ رہی، لہٰذا یہاں کوئی لائق ذکر اسلامی عمارت نظر نہیں آتی .

(W. BARTHOLD)

* **الکَرْخ** : قدیم بغداد کے ایک مشہور محلے کا نام - کرخ آرامی لفظ کرکا Karkā سے نکلا ہے - یونانی اور رومی مصنفین اسے کرچہ (Carcha)، چرچہ (Charcha) اور چرسہ (Charase) لکھتے ہیں (دیکھیے Pauly Wissowa : *Realenzykl. d. klass. Altertumswiss*، تکملہ، ۱ : ۲۷۵، ۲۸۳) اور اس کے معنی ہیں قصبہ (دیکھیے یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۵۲ س ۱۸ ؛ Streck، ص ۹۲، ۱۸۶ ؛ G. Le. Strange : *Baghdad*، ص ۶۳) - مسلمانوں کے زمانے میں بھی آرامی تمدن سے متأثر علاقوں، یعنی عراق، خوزستان اور الجزیرہ میں متعدد قصبے یا قصبوں کے محلے اس نام سے موسوم تھے - انھیں ایک دوسرے سے یوں متمیز کیا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ کسی جغرافیائی نام (مثلاً میسان، سامرا) کا اضافہ کر دیا جاتا تھا - یاقوت (۴ : ۲۵۲ تا ۲۵۷) کے ہاں ایسے مقامات کا ذکر ملتا ہے؛ نیز دیکھیے الطبری (طبع ڈخویہ، بمدد اشاریہ، ص ۷۶۲) - زیربحث کرخ کو صحیح لفظوں میں عموماً کرخ بغداد کہا جاتا ہے .

جیسا کہ اس کے آرامی نام سے ظاہر ہوتا ہے، الکرخ کا محلہ اس سے پیشتر موجود تھا جب المنصور نے بغداد شہر کی بنیاد رکھی (۱۴۵ھ/۷۶۲ع)- ان دنوں یہ ایک چھوٹا سا خود مختار قصبہ تھا، جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اسے ساسانی بادشاہ شاپور ثانی (۳۰۹ تا ۳۷۹ع) نے بسایا تھا- دوسری قدیم بستیوں کی طرح، جو اس مقام پر واقع تھیں جہاں خلفا کا آئندہ دارالحکومت آباد ہونا تھا، یہاں کی آبادی بھی زیادہ تر آرامی عیسائیوں پر مشتمل تھی (دیکھیے سطور بالا، ۱ : ۵۴۲) - اسلام سے پہلے کے قصبۂ کرخ کو خلیفہ المنصور نے تجارتی مرکز بنانے کے لیے منتخب کیا اور تھوڑی ہی مدت میں یہ اپنی تجارتی حیثیت کے باعث شہر کا سب سے پررونق محلہ بن گیا - شروع شروع میں الکرخ ایک بالکل علٰحدہ آبادی تھی، جو المنصور کے مدوّر شہر سے خاصے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع تھی، لیکن شہر کے اردگرد بسرعت نئی سڑکیں اور چوک تعمیر ہوگئے اور یہ بھی اس عظیم الشان دارالخلافہ کی عمارتوں میں مدغم ہوگیا .

الکرخ میں پانی کی بہم رسانی نہر عیسٰی اور اس کی شاخوں نہر صراۃ اور نہر کرخایا سے ہوتی تھی - نہر عیسٰی عراق کے انتہائی شمالی علاقوں میں فرات کی بڑی نہر ہے - نہر کرخایا (دیکھیے Frankel : *Die aram. Fremdw. im Arab.*، لائیڈن ۱۸۸۶ع، ص ۲) جو قصبہ المحوّل سے نیچے موضع البرائا (دیکھیے ۱ : ۶۵۵) کے قریب نہر عیسی سے نکلتی ہے، بغداد کے مغربی نصف علاقے کے جنوبی حصے، یعنی تجارتی مرکز اور اس کے گرد و

نواح کو پانی بہم پہنچاتی ہے ۔ اس کی معاون شاخیں بعض مقامات پر زمین کے نیچے نیچے بہتی تھیں ۔ اس کے اوپر متعدد پل تھے، جن پر بڑی آمد و رفت رہا کرتی تھی ۔ نہر کرخایا اور اس کے نہری نظام کے بارے میں دیکھیے ابن سیرپین Ibn Serapion، طبع G.Le Strange، در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۲۴ س ۱۷ تا ۲۶ و ص ۲۸۶ تا ۲۸۸، ۲۹۲ تا ۲۹۳؛ الخطیب البغدادی، طبع Salmon، ص ۶۶ تا ۶۸، ۱۵۴، ۱۵۵؛ یاقوت، ۴ : ۲۵۲؛ Streck، ص ۸۵ تا ۹۰؛ G. Le Strange : *Baghdad*، ص ۵۲ تا ۵۶، ۶۳ تا ۸۰؛ Herzfeld، در Sarre-Herzfeld، ۲ : ۱۱۰ ۔

الکرخ کا، جسے شیعیوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا، بغداد کی شہری تاریخ، خصوصاً بویہی دور کی تاریخ (دسویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک) میں بار بار ذکر آتا ہے (رک بہ بغداد) ۔ عہد آل بویہ میں، جن کی ہمدردیاں علویوں کے ساتھ تھیں، دارالحکومت کے شیعہ سنی تنازعات اور مناقشات، جو پہلے بھی اکثر ہوتے رہتے تھے، بہت زور پکڑ گئے ۔ ان متخالف فرقوں کے درمیان گلی کوچوں میں خونریز جھڑپیں گویا روز مرہ کا معمول ہو گیا تھا، جن میں اکثر لوٹ مار اور آتش زنی بھی ہوتی تھی ۔ ان خانہ جنگیوں اور باہمی فساد میں عموماً کرخ ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی ۔ یہاں کے باشندے آس پاس کے محلوں (باب البصرہ وغیرہ) میں رہنے والے سنیوں کے خلاف ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے ۔ سلطان جلال الدّولہ (۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۴ء) کے عہد میں صورت حال حد سے زیادہ بگڑ گئی تھی؛ چنانچہ ایک بار (۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء) خود اس کی ایسی گت بنی کہ اسے بھاگ کر اپنے ہم مذہب شیعیوں کے پاس کرخ میں پناہ لینی پڑی ۔ ان فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۴۵ھ / ۱۰۵۳ء میں الکرخ کا بڑا حصہ جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا ۔ اس سے قبل خلیفہ الواثق کے عہد (۲۲۷ھ/۸۴۲ء تا ۲۳۲ھ / ۸۴۷ء) میں بھی کرخ ایک زبردست آگ لگنے سے تباہ ہو گیا تھا، لیکن بہت جلد اس تباہی کی تلافی کر دی گئی ۔

الکرخ زیادہ وسیع معنوں میں دریاے دجلہ کے مغرب میں بغداد کے سارے جنوبی علاقے کا نام تھا ۔ مرور زمانہ سے یہاں متعدد مسجدیں اور مقبرے تعمیر ہوے ۔ سب سے زیادہ مشہور مقبرہ، جس کے ساتھ مسجد بھی ہے، یہاں کے ایک مقامی ولی معروف بن الفیزران الکرخی (م ۲۰۰ھ / ۸۱۶ء) کا ہے ۔ اس سے کوئی ۳۰۰ گز جنوب میں وہ مقبرہ ہے جو ہارون الرّشید کی بیوی زبیدہ کا بتایا جاتا ہے ۔ یہ دونوں مقبرے (نیز رک بہ بغداد) آج بھی موجود ہیں اور قدیم بغداد کے مکانوں اور عمارات کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ اہم عمارتیں نقطۂ آغاز کا کام دے سکتی ہیں ۔ موجودہ شکل میں ان کی تجدید و ترمیم خلیفہ الناصر (۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء تا ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء) نے کی تھی، لیکن اس وقت سے اب تک بارہا ان کی اصلاح اور درستی ہوتی رہی ہے ۔ الکرخی کی قبر نویں صدی ہجری ہی میں بغداد کی مشہور ترین زیارت گاہ بن چکی تھی اور آج بھی اسی طرح ایک عظیم الشان قبرستان میں موجود ہے جس طرح کہ عہد عباسیہ میں تھی ۔ اس سے متعلق دیکھیے Streck، ص ۱۵۹؛ G. Le Strange : کتاب مذکور، ص ۱۰، ۸۹، ۳۵۰؛ Massignon، ص ۱۰۸ ببعد؛ Herzfeld، ص ۱۷۳ ۔ بغداد کے مغربی جانب جو دیگر مساجد اور مقبرے واقع ہیں ان کے حالات کے لیے دیکھیے Herzfled، ص ۶۴ ببعد یا ۹۴ ببعد ۔

الکرخ بغداد کے مغربی نصف حصے کا نہ فقط

سب سے بڑا محلہ تھا بلکہ یہ ایک طویل عرصے تک آباد بھی رہا، بحالیکہ آس پاس کے محلے کھنڈر بن گئے؛ مثلاً یاقوت کے وقت (تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل) میں یہ ایک علٰحدہ قصبے کی صورت میں بدستور موجود تھا، بالکل اسی طرح جیسے بغداد کی بنیاد پڑنے کے بعد قدیم ترین زمانے میں تھا۔ ان دنوں یہ باب البصرہ کے محلے (المنصور کے قدیم مدور شہر کے جنوب مشرق میں) سے، جو اس وقت تک آباد تھا، کوئی ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ازمنۂ وسطٰی کے آخری ایام میں (دیکھیے مثال کے طور پر ابن بطوطہ، چودھویں صدی عیسوی میں) محلہ باب البصرہ کا نام مغربی بغداد کے ان تمام محلوں کے لیے اکثر استعمال ہونے لگا تھا جو ابھی تک آباد تھے؛ چنانچہ الکرخ بھی انھیں میں شامل تھا دیکھیے G. Le Strange : کتاب مذکور، ص ۳۳۶؛ Herzfeld، ۲ : ۱۱۴ ببعد۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلا دینی چاہیے کہ الکرخ اور اس کے مضافات کے جو جغرافیائی حالات یاقوت نے پیش کیے ہیں وہ دوسرے مآخذ سے پوری طرح نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معجم البلدان لکھتے وقت مصنف کی اس مقام کے بارے میں معلومات زیادہ معتبر نہیں رہی تھیں (دیکھیے G. Le Strange، ص ۸۴، ۱۵۹)۔

الکرخ ایک ایسے دارالضرب کی حیثیت سے بھی مشہور ہے جہاں کبھی کبھار سکّے ڈھالے جاتے تھے۔ عباسی خلفا المقتدر، القاہر اور الراضی کے عہد کے سکّے ملتے ہیں، جو ۳۰۸، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۲۱ اور ۳۲۵ھ کے ہیں (دیکھیے *Numismatische Zeitschrift*، وی انا ۱۸۹۳ء، ۳۴ : ۳۲۱؛ Lavoix : *Cat. des Monn. Mus. de la Bib. Nat.*، ۱ : ۲۸۵؛ *Numismatic Chronicle*، ۱۹۰۲ء، ص ۲۷۲ و ۱۹۰۹ء، ص ۱۹۷)۔ الکرخ کی شراب کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ عہد عباسیہ کے پہلے دور کے قصائد (مثلاً ابو نواس، ابن معتز) میں اس کا اکثر ذکر ملتا ہے (دیکھیے G. Jacob : *Oriental Studien, Th. Noldeke .... Gewidmet*، در Giessen، ۱۹۰۶ء، ص ۱۰۶۵)۔

آج کل بغداد کا وہ حصہ جو دریاے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور شہر کے مجموعی رقبے کا بمشکل تیسرا حصہ ہے قرشیا کہ کہلاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ (ترکی) قرشی یقا (= دوسری جانب) ہے (کیونکہ (یہ اصل شہر کے، جو مشرقی کنارے ہے، بالکل مقابل واقع ہے) اور ایک عامی عربی لفظ "حاذک الجانب" کی دوسری صورت ہے؛ لہٰذا اس نام کا کرخ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیسٹرینج : کتاب مذکور، ص ۶۶، میں اس کے خلاف نظریہ اختیار کیا گیا ہے۔ مدت تک قرشیا نواح شہر کا ایک حقیر سا حصہ رہا، لیکن حال میں اس کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے اور یقیناً اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا کیونکہ بغداد کا ریلوے سٹیشن یہیں بنا ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے بنو عقیل (عوگیل، عگیل) کے عرب یہاں آباد ہیں اور آج کل اس مغربی شہر کی خاصی آبادی ان عربوں اور دوسرے تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے (اس سلسلے میں Cernik کی تفتیشی مہم کے لیے دیکھیے *Petermans Geograph. Mitteil.*، تکملہ، حصہ ۴۴، Gotha، ۱۸۷۵ء، ص ۲۸، ۳۰؛ v. Oppenheim : *Vom Mittelmeer zum Persischen Golf*، برلن ۱۹۰۰ء، ۲ : ۷۴، ۲۳۸؛ Gl. Huart : *His. de Bagdad dans les temps modernes*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۱۱ ببعد، ۱۸۸ ببعد؛ Massignon، ص ۹۹۔

مآخذ : (۱) *Bibliotheca Geographorum Arabicorum*، بمدد اشاریہ؛ (۲) الطبری، طبع ڈخویہ، بمدد اشاریہ، ص ۲۶۷؛ (۳) الخطیب البغدادی، طبع Selmon

(دیکھیے Selmon : *Introduct. topograph. à l'hist. de Bagdad*، پیرس ۱۹۰۴ء، ص ۲۰ تا ۲۳، ۹۸ تا ۱۰۲؛ (۴) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۵۴ ببعد؛ (۵) ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg، ۱۲ : ۹۳، بمدد اشاریہ؛ (۶) القزوینی : آثار البلاد، طبع Wüstenfeld، ص ۲۹۸؛ (۷) Streck : *Babylonien nach den arab. Geographen*، لائیڈن ۱۹۰۰ء، ۱ : ۹۲ تا ۹۷؛ (۸) G. Le Strange : *Baghdad during the Abbasid Caliphate*، آکسفرڈ ۱۹۲۴ء، ص ۶۳ تا ۸۰ و بمواضع کثیرہ (بمدد اشاریہ)؛ (۹) وہی مصنف : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۳۱؛ (۱۰) L. Masignon (1907-8) : *Mission en Mésopotamie*، ج ۳۱، پیرس ۱۹۱۲ء، ۲ : ۴۹، ۹۹، ۱۰۸؛ (۱۱) E. Herzfeld، در Serre Herzfeld : *Archäol Reise im Euphrat und Tigrisgebeit*، برلن ۱۹۲۰ء، ۲ : ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۴ ببعد؛ بغداد کے نقشوں کے لیے دیکھیے G. Le Strange : *Baghdad*، نقشہ ۳ و ۷؛ نیز Herzfeld، جو الکرخ کے ٹھیک ٹھیک محل وقوع کے متعلق G. Le Strange کی رائے سے کسی قدر اظہار اختلاف کرتا ہے اور غالباً وہ حق بجانب ہے۔

(M. Streck)

* **کرخا** : Kerkha، خوزستان کا ایک دریا، جس کا منبع عراق میں نہاوند کے مشرق و جنوب میں واقع ہے۔ چشمہ کاظم کو اس کا اصل سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور یہ کوہ چہل نبلغان سے نکلتا ہے۔ نقشے میں یہاں ایک چھوٹی سی ندی سرہ کنچ نظر آتی ہے، جس میں مشرق سے کرسرہ ندی آ کر مل جاتی ہے۔ پھر نہاوند کے قریب مشرق ہی کی جانب سے آب کلن آ ملتا ہے، جو کوہ فروزان سے نکلتا ہے۔ اس کے بعد دولت آباد سے سیروان رود اس میں آ گرتی ہے۔ اس علاقے میں یہ دریا گمساب کے نام سے مشہور ہے جس کا صحیح تلفظ گمسیاب (اور بگڑی ہوئی شکل گرسیاب) ہے۔

دریا کا رخ شروع شروع میں شمال مغرب کی سمت ہے، لیکن پھر بتدریج مغرب کی جانب مڑ جاتا ہے۔ بیستون تک پہنچنے سے پہلے اس میں شاجو رود مل گئی ہے، جو کنگر شاہ کے مل جانے سے اور بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کرخا جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے اور اس میں کرمان شاہان کا دریا قرہ سو آ ملتا ہے۔ آگے چل کر آب کرند بھی شامل ہو جاتا ہے، جس کے اپنے کئی اہم معاون ہیں۔ اب تک جتنے معاونوں کا ذکر ہوا ہے، وہ سب کے سب اس میں دائیں طرف سے آ کر ملتے ہیں۔ ان کے برعکس کشگن رود بائیں جانب سے آتی ہے، جس کے معاون یہ ہیں : مدین رود دائیں طرف سے اور رود خرم آباد مع رود کول کو بائیں طرف سے۔ اس کے بعد دائیں جانب ہی سے لیلم رود اور آب زال آتے ہیں۔ اب دریاے کرخا کا رخ کچھ دور تک جنوب سے مغرب اور پھر جنوب کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے میں دریا کو کرخہ (کرخہ) کہتے ہیں۔ لیلم رود اور آب زال کے درمیان کچھ فاصلے کے لیے اس کا نام آب صیمرہ ہو جاتا ہے۔ یہ قصبۂ صیمرہ [رک بآں] کے نام پر ہے، جو دریا کے مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ آب زال کے ساتھ مل جانے کے بعد دریا ایک بار پھر جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے۔ پای پل کے علاقے میں پہنچتے ہی اس میں سے کئی نہریں نکلتی ہیں۔ ان نہروں سے اس کا اتصال آب دز اور اس کے معاونین نہر تبل خن اور نہر دغ دری سے ہو جاتا ہے۔ سوس کے کھنڈر اس کی ایک مشرقی گزرگاہ آب کے کنارے واقع ہیں، جسے آگے چل کر دریاے شور کے نام سے یاد کیا۔

جاتا ہے۔ کرخا کا بہاؤ نہر ہاشم کے جنوبی علاقے میں آ کر ختم ہو جاتا ہے، جہاں اس میں شطّ الجَمز کا پانی آ ملتا ہے۔ ایک مدت پہلے دریا یہاں سے شمال مغرب کو حَوِیزَہ (حُوَیْزہ) تک بہتا تھا۔

اس دریا کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں جو سڑکیں جاتی تھیں، ان میں وہ شاہراہ قابل ذکر ہے جو علاقہ بیستون میں ہمذان اور عراق کو ملاتی ہے، نیز وہ سڑک جو حُلوان سے صَیْمَرہ کو جاتی ہے۔

قدیم جغرافیہ نویس اس دریا کو Choaspes کہتے تھے۔ کرخا کا نام عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں نہیں ملتا۔ بقول Rawlinson یہ پہلی بار چودھویں صدی عیسوی کے ایک فارسی نسخے میں آیا ہے۔ بہرکیف یہ لفظ کچھ پرانا ہی ہوگا۔ ابن الأثیر نے ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء کے ذیل میں ایک کَرْخَانا کا ذکر کیا ہے۔ اگر اس سے یہ دریا ہی مراد ہو تو اس کا نام ضرور بارھویں صدی عیسوی میں موجود تھا۔ ابن الأثیر عموماً جغرافیائی تفصیلات دینے سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہے؛ اس نے ضرور یہ نام کسی قدیم مآخذ سے لیا ہوگا۔ کرخانا لازمی طور پر آرامی لفظ ہوگا جس کا مطلب ہے "کرخا کا (دریا)" یعنی کرخا دہ لیدن Karkha de Lēdan.

عرب جغرافیہ نویسوں نے اس دریا کا ذکر دو بار یقیناً کیا ہے، اگرچہ اس کا نام نہیں لیا۔ ابن الفقیہ کے بیان کی رو سے نہاوند کے قریب اس کے کنارے سے ایک اعلیٰ قسم کی سیاہ رنگ کی مہر لگانے کی چکنی مٹی نکلتی ہے۔ ابن رُسْتہ نے بیستون کے قریب جس "بڑے دریا" کا ذکر ہے، وہ بھی لازماً گَمَسی آب ہوگا۔ صَیْمَرہ اور طَرْحان کے درمیان اس پل کو بھی جسے فن تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا تھا، پل خسرو ہی سمجھ سکتے ہیں، جو کرخا پر بنا ہوا ہے۔ کرخا کو عام طور پر "دریاے سُوس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مثلاً بہت پہلے ابن خرّاذابہ کے وقت میں یہ نام آیا ہے۔ اس کے منبعوں کے بارے میں جغرافیہ نویسوں کو قابل اعتماد معلومات حاصل نہیں تھیں۔ ابن خرّداذبہ کہتا ہے کہ یہ دِیْنَوَر سے نکلتا ہے اور ابن واضح کا کہنا ہے کہ ہَمذان سے۔ کم از کم گَمَسی آب کے معاونین کے بارے میں یہ رائے ہے، بشرطیکہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہاں دِیْنَوَر اور ہَمَذان کے شہر نہیں بلکہ صوبے مراد ہیں۔ عرب جغرافیہ نویسوں کے قول کے مطابق یہ دریا اہواز کے دُجَیل میں جا گرتا ہے۔ یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ پانی چڑھنے کے وقت، سوس کے مقام پر اس دریا کا پاٹ دو میل کے قریب ہو جاتا ہے۔ ابن واضح کے بیان کی رو سے یہ دریا ہِندُوان کے نام سے مشہور تھا۔ غالباً بَصنّا کی ندی یا "دجلۂ بَصنّا" جس کے پانی سے سات پن چکّیاں چلتی تھیں اور جو شہر بَصنّا سے ایک پرتاب تیر کے فاصلے پر بہتا تھا اور جس کا ذکر المقدسی اور یاقوت کے ہاں ملتا ہے، وہ اور کرخا ایک ہی دریا ہیں۔

مآخذ: (۱) Rawlinson در *JRGS*، ۹: ۸۹؛ (۲) Ritter: *Erdkunde*، ج ۹؛ (۳) Reclus: *Nouvelle Goegraph. Univ.*، ۹: ۲۹۰، ۳۰۶؛ (۴) Graadt von Ruggen (در Morgan: *Délégation en Perse*، ج ۷)، ص ۱۶۸، ۱۹۰؛ (۵) Herzfeld: *Petermanns Mittei-lungen*، ۵۳: ۴۹، ۶۰، ۶۳؛ (۶) G. le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۲۳۳، ۲۴۰؛ (۷) Schawrz: *Iran in M. A.*، ۳: ۳۰۴ ببعد، ۳۶۴ ببعد، ۳۹۳، ۵: ۳۵۳، ۴۷۲، ۴۸۸، ۵۰۱.

(P. SCHWARZ)

الکرخی: ابوبکر بن الحسن (یا الحسین) *

ریاضی دان وہ اپنے آپ کو الحاسب (حساب دان) بھی کہتا تھا ۔ اس کا قیام بغداد میں رہا ۔ سلطان بہاء الدولہ [رک بآں] کے وزیر ابو غالب محمد بن خلف فخرالملک اور اس کے بیٹے سلطان الدولہ ابو شجاع کے زمانے میں ۔ تاریخ وفات معلوم نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ اور ۴۲۰ھ/ ۱۰۲۹ کے درمیان ہوگی ۔ ریاضی میں کرخی کی صرف دو تصنیفیں باقی رہ گئی ہیں : الکافی فی الحساب (حساب کے لیے کافی) اور الفخری (معنون بہ وزیر فخر الملک) ۔ پہلی تصنیف کا ایک مخطوطہ جو اپنی جگہ پر لاجواب ہے، گوتھا میں موجود ہے، دوسری کا پیرس، آکسفرڈ اور قاہرہ میں ۔ عربی متن ابھی تک کسی کا بھی شائع نہیں ہوا البتہ اوّل الذّکر کا تین حصوں میں ایک جرمن ترجمہ موجود ہے : A. Hochheim : *Kāfī fil Hisāb des Abu Bèkr Muh. b. Alhussain Al Karkhi* Halle ۱۸۷۸-۱۸۷۰ء ؛ اور دوسری کی ایک تلخیص فرانسیسی میں، F. Woepcke : *Extrait du Fakhrī*، پیرس ۱۸۵۳ء ۔ الخیّامی کے جبر اور مقابلے کے بعد ریاضی کی اس شاخ میں الفخری اہم ترین کتاب ہے، جس میں الکرخی نے اسکندریہ کے یونانی ریاضی دان ڈیوفانٹوس Diophantus کا تتبع کیا ہے؛ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا جب عربوں نے اس کتاب میں غیر معین مساوات سے بحث کی اور ان کا حل یونانی طریق میں پیش کیا البتہ اس امر کا تصفیہ مشکل ہے کہ الکرخی نے قصداً ہندی طریقوں کو نظر انداز کر دیا یا وہ ان سے بے خبر تھا ۔ اپنے رسالہ حساب میں مشرق کے تقریباً سب عرب ریاضی دانوں کی طرح (مگر علی بن احمد النسوی (۹۸۰ تا ۱۰۴۰ء کے سوا) وہ ہندی اعداد استعمال نہیں کرتا بلکہ سب رقمیں الفاظ میں لکھتا ہے ۔

مآخذ : اب تک کی مطبوعہ عرب سوانحی تصانیف میں کسی میں بھی الکرخی پر کوئی علٰحدہ مقالہ نہیں ۔ اس کا ذکر (۱) ابن خلکان، قاہرہ، ۱۳۱۰ھ، ۲ : ۶۵ میں کہیں کہیں ہے؛ مترجمہ de Slane، ۳ : ۲۷۹؛ نیز دیکھیے (۲) M. Cantor : *Vorlesungen uber Gesch. d. Mathem*، بار دوم، ۱ : ۷۱۸ تا ۷۲۹؛ (۳) H.Suter، *Abhandl z. Gesch. d. mathem. Wissensch*، ۱ : ۸۳ ۔

(H. SUTER)

کِرد : رک بہ اقریطش (Crete) . *

کُرد : مشرق قریب کی ایک ایرانی قوم جو * ایران، ماوراے قفقاز ترکی اور العراق [رک بہ کردستان] میں آباد ہے ۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے ان کردوں کی تعداد کا، جو مجتمع یا الگ الگ بستیوں میں آباد تھے (خراسان، ایشیاے کوچک، کیلیکیا (سلیشیا) جنوبی شام) اندازہ بیس تیس لاکھ کے قریب کیا گیا تھا .

اگرچہ بہت سے سیاح کردستان سے ہو کر گزرے ہیں اور کردوں کے بارے میں لسانی، تاریخی، نسلیاتی اور سیاسی اعتبار سے کثیر تعداد میں تصنیفات بھی ملتی ہیں، لیکن ابھی تک ہم کسی عام تحقیقی مقالے سے محروم ہیں جو خاص اسی قوم سے متعلق ہو ۔ ایسی تصنیف کی تیاری میں مشکلات کا سامنا اس لیے ہے کہ ہماری معلومات جزوی ہیں اور منتشر، اور پھر یہ کہ جن مصنفوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ان کے طریق کار میں اختلاف پایا جاتا ہے .

(الف) اصل و نسل

کردوں کی ایرانیوں میں شمولیت زیادہ تر لسانی اور تاریخی مواد کی بنیاد پر کی جاتی ہے، لیکن اس سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ ان میں مختلف النّسل عناصر جمع ہو گئے ہیں ۔ ان مؤخر الذّکر عناصر کی نوعیت عیاناً جابجا مختلف ہے ۔ ممکن ہے کہ کرد عناصر کی افزائش کا رخ مشرق (مغربی ایران) سے مغرب (وسطی کردستان)

کی جانب ہوا ہو، لیکن ایسی کسی قوم کا وجود تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں جو کردوں کی آمد سے قبل وسطی کردستان میں رہتی تھی، یعنی نسلاً ان سے مختلف اور اسماً مشابہ (قَرْدو) اور جو آگے چل کر ایرانی کردوں میں مدغم ہوگئی۔

تقریباً ۲۰۰۰ ق م - دو سمیری کتبوں میں Theureau Dangin (*Revue d'Assiyriologie*، ۵ : ۹۹؛ ۶ : ۶۷) نے کردوں کے ایک علاقے "کَرْدَہ کہ" نامی کا ذکر دیکھا تھا (مرتب نے مجھے نجی طور پر بتایا ہے کہ اس میں پہلا حرف ک ہے، ق نہیں اور جزو کہ کا مفہوم غیر یقینی ہے) - یہ ملک "اہل سُو" (دیکھیے *ZA*، ۳۵ : ۲۳۰، حاشیہ ۳) کے علاقے سے متصل تھا جس کا محل وقوع ڈرائیور Driver نے بحیرۂ وان کے جنوب میں بتایا ہے - علاقۂ بِدْلِیس میں ایک قدیم قلعہ سُوی موجود ہے (شرف نامہ، ۱ : ۳۶۱)- ایک ہزار سال بعد تگلتہ پلیسر Tiglath Pilesar نے آزو کے پہاڑوں میں بسنے والی قوم قرطی (Kur-ṭi-e) کے خلاف جنگ کی تھی - Driver (کتاب مذکور، ص ۴۰۰) نے اسے وہی پہاڑ قرار دیا ہے جو آج کل حَزو (سَسُن Sasun) کہلاتا ہے - قرطی کی قراءت غیر یقینی ہے۔

پانچویں صدی میں Herodotos نے ایسے کسی نام کا ذکر نہیں کیا، لیکن بقول اس کے (۳ : ۹۳) ہخامنشی سلطنت کے تیرھویں نوم (Nome صوبہ) میں جو آرمینیوں کے بعد آتا تھا ایک علاقہ Παρτικήν نامی شامل تھا جس کے نام کا رشتہ Nöldeke (*Gramm. d. neusyrischen Spr.*، لائپزگ ۱۸۶۸، ص ۱۸) اور Kiepert (*Alt. Geogr.*، پیرا ۸۱) نے بُخْتان (= بُہْتان) سے جوڑا ہے۔

دس ہزار [کے عسکر] کی پسپائی نے جس کا حال Xenophon (۴۰۱ - ۴۰۰ ق-م) نے بیان کیا ہے کَرْدُکون (Καρδούχοι) کے نام کو شہرت بخشی، جن کا ملک کنتر تیس Kentritēs (بہتان) کے مشرق میں واقع تھا - اس زمانے سے یہ نام ہمیں تسلسل کے ساتھ دریاے دجلہ کے بائیں کنارے پر کوہ‌جودی [رک بآں] کے قریب ملتا ہے اور کلاسیکی مصنفوں کے ہاں اس ملک کا نام کردوئن Corduene ہوگیا - (اس نام کی متعدد شکلوں کے بارے میں جو سامی حرف ق کو ادا کرنے میں مشکل کے باعث وجود میں آئیں، دیکھیے Driver، کتاب مذکور)- آرامی میں یہ ضلع بث قَرْدُو (Beth-Kardū) کہلاتا تھا اور موجودہ شہر جزیرۃ ابن عمر قردُو کا گزرتا کہلاتا تھا - آرمینی اسے کوردذ کہتے تھے اور عرب (البَلاذُری، ص ۲۰۷؛ الطّبری، ۳ : ۶۱۰) بَقَرْدَا (قَرْدَی)- یاقوت (۴ : ۵۶) نے ابن الأثیر کی سند پر اعتماد کرکے بیان کیا ہے کہ ضلع بَاقَرْدا، جزیرۃ ابن عمر کا ایک حصہ تھا - اس میں دو سو گاؤں (الثّمانین، جودی، فیروز شابور) شامل تھے اور یہ دجلے کے بائیں کنارے پر بازندا کے بالمقابل آباد تھا، جو دجلے کے دائیں کنارے پر واقع تھا (متون کے مفصل تجزیہ کے لیے دیکھیے M. Hartmann : *Bohtan*، ص ۳۳ تا ۳۵) - یہ نام جس کا اطلاق صرف ضلع پر ہوتا تھا، آگے چل کر مسلمانوں کی کتابوں سے ناپید ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ جزیرۃ ابن عمر، بہتان وغیرہ لے لیتے ہیں - ارمینیوں اور عربوں کے نزدیک علاقہ قَرْدُو کا اطلاق صحیح معنوں میں ایک بہت محدود سے علاقے پر ہوتا تھا - ہمیں Corduene کی صحیح صحیح سرحدوں کا علم نہیں - اس کے تین قصبے سریسہ Sareisa سَتَلکا Satalka اور پِنَکا Pinaka (فِنیق) دریاے دجلہ کے کنارے واقع تھے، لیکن اس سلسلے میں Strabo کا بیان (۹ : ۱۲، س ۴) قابل توجہ ہے، جس کی رو سے Γορδυαῖα ὄρη کی اصطلاح کا اطلاق بعض اوقات ان پہاڑوں پر ہوتا تھا جو موجودہ دیار بکر اور مُوش کے درمیان واقع ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ Καρδοῦχοι کون تھے جن کا نام بلاشبہہ اسماے مابعد میں بھی قائم رہا (آخری جزو -χοι کو لازماً ارمینی صیغۂ جمع کی خ کا مترادف سمجھنا چاہیے ۔ غالباً اس کی توجیہ یہ ہو سکے گی کہ یہ نام یونانیوں نے کسی ارمنی سے سیکھا ہوگا) ؟ بقول زینوفون (۴ : ۳، س ۱) Karduchoi نہ تو شاہ Artaxerxes کی حکومت تسلیم کرتے تھے نہ آرمینیا کی ۔ جب پہلی صدی قبل مسیح میں Tigranes ثانی نے Corduene کو فتح کیا تو اس نے وہاں کے بادشاہ Zarbienus کو مار واڈالا ۔ Corduene کے بادشاہ کو ۱۱۵ء میں Manisarus کہتے تھے ۔ بقول Hübschmann (*Die altarm. Ortsnamen*، ص ۲۳۹ و *Arm. Gramm.*، ۱۸۹۷ء، ۱/۲ : ۵۱۸ تا ۵۲۰) صوبۂ کردوئن نے آرمینیا کا بڑا سطحی سا اثر قبول کیا تھا ۔

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ Xenophon کے زمانے میں دریاے دجلہ کے شمال میں ایک ایرانی قبیلہ آباد تھا ، لیکن ہمارے پاس کرد چوی Karduchoi کی نسل کے بارے میں اس کے نام کے سوا کوئی دوسری شہادت موجود نہیں ۔ سامی زبانوں میں اس نام کے مماثل اور بھی نام ہیں (عکّادی، آشوری: قَرْدُو، مضبوط، سورما، قَرادُو، "مضبوط ہونا")۔ دوسری طرف اس کی صوتی مماثلت ایک قوم خَلْدِی کے نام سے بھی پائی جاتی ہے جس کا آشوری تلفظ اُرَرْطُو ارشطو زیادہ مشہور ہے اور جسے عبرانی میں اَرَرَطْ (آراراط ، ارارات ، جبل الحارث) اور یونانیوں کے ہاں Αλαρόδιοι, Χάλδοι کہتے ہیں اور بعض اوقات Χαλδαῖοι ، یہ قوم آرمینیا میں نویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں نمودار ہوئی تھی اور بعد ازاں اس نے بحیرۂ وان کے علاقے میں ایک طاقت ور سلطنت قائم کر لی تھی ۔ یہ سلطنت چھٹی صدی کے اوائل تک باقی رہی ۔ Lehmann-Haupt : *Mater. z. älter Gesch. Armeniens*، گوٹنگن ۱۹۰۷ء، ص ۱۲۳، کی نظر میں خلدی تارکین وطن ہیں جو مغرب سے آئے تھے ۔ E. Mayer : *Gesch. des Altertums* ۱/۲ (۱۹۱۳ء)، فصل ۴۷۴ کا خیال ہے کہ ان کا اصلی وطن وسطی Araxes کے کنارے تھا ۔ ساتویں صدی کے قریب ارمنیوں کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلدی منتشر ہو گئے اور پہاڑوں کی جانب دھکیل دیے گئے (*Cyropaedia*، ۳ : ۱ تا ۳)، لیکن ان کا نام ان مقامات کے ناموں کی شکل میں زندہ رہا جو بحیرۂ وان کے شمالی علاقے میں ہیں (بوزنطی صوبۂ Χαλδία میں طربزون کے قریب قصبۂ خِلاط، اَخْلاط وغیرہ، دیکھیے Belck و Lehmann : *ZA*، ۱۸۹۴ء، ۹ : ۸۴ ؛ de Goeje : کتاب مذکور، ۱۰ : ۱۰۰ ؛ Streck : کتاب مذکور، ۱۴ : ۱۱۲) ۔ خَلْدی سے مشابہ نام قفقاز کے دوسری طرف بھی پائے گئے ہیں ۔ گرجیوں کو خرتھوالی، خرتھولی Kharth-veli-Kharth-ul-i کہا گیا ہے (سوانی میں خیَرد ؛ منگرلی میں خورتُو) دیکھیے Adontz : *Armenia v epokhu Iustiniana* ، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۸ء، ص ۳۹۸ ۔

ہم قَرْدُو کو خواہ سامی سمجھیں یا مقامی لوگ کم از کم ایک بات یقینی ہے کہ قدیم کرد چوی Karduchoi کی سر زمین آج کل کردوں کے اہم مراکز میں سے ہے، لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ کردچوی ہی کرد تھے اور یہی نظریہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک بھی بدیہی سمجھا جاتا تھا، دیکھیے Grundriss : *d. Iran. Phil*، ۲ : ۴۶۴ ۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کردوں کا تعلق براہ راست Χάλδοι سے ملا دیا جاتا تھا ۔

Reiske نے *De Ceremoniis*، کتاب ۱۳، ص ۷۱۳، س ۱۱، میں Constantine Porphyro-

gene'os کی شرح میں لکھا ہے : "Chaldi et Kordi vel. Curti, Gordyai iidem" [= خلدی اور کوردی یا کرتی اور گوردیائی ایک ہی ہیں] - اسی قسم کی رائے Lerch کی تصنیف (۱۸۵۶ء) کے عنوان *Récherches sur les Kurdes Iraniens et sur leurs Ancêtres, les Chaldéens Septentrionaux* میں بھی ظاہر کی گئی ہے .

اس مسئلے کا ایک نیا پہلو Nöldeke M. Hartmann اور Weissbach کی تحقیقات سے سامنے آیا، جنھوں نے کُرد اور قَرْدو کی اصل کا لسانی اعتبار سے فرق پیش نظر رکھنے کی ضرورت ظاہر کی - علاوہ ازیں ان علما نے یہ تجویز پیش کی کہ کرد کو Κύρτιοι تسلیم کیا جائے، یعنی سیرتی Cyrtii، جن کا ذکر کلاسیکی مصنفوں نے میڈیا اور ایران میں کیا ہے (Strabo، ۱۱ : ۱۳، س ۳ و ۱۵ : ۳، س ۱) - اس مفروضے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ ساسانیوں کے عہد میں کردوں کے متعدد قبیلے فارس میں موجود تھے (دیکھیے کارنامۂ اردشیرِ بابکان، مترجمۂ Nöldeke، گوٹنجن ۱۸۷۹ء، ص ۳۷، ۴۸؛ نیز عرب مصنفین کی شہادتیں) .

کُرد اور قَرْدو کے ناموں میں قابل قبول امتیاز کے باوجود یہ اہم مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا کہ سیرتیوں (Cyrtii = ایرانی کردوں) نے اپنی نو آبادیاں ان علاقوں میں کیسے بنائیں جو زغروس Zagros کے مغرب میں واقع ہیں، یعنی قدیم قَرْدو کا ملک اور مقابل تاوروس (Anti-Taurus) کے پہاڑ، جو شمالی شام تک پھیلے ہوے ہیں - اس مسئلے پر ابھی بڑی احتیاط سے تحقیق کی ضرورت ہے - پہلی بات تو یہ ہے کہ میڈیا اور ایران کی فتوحات کے دوران میں ایرانی اقوام بہت حد تک جگہ سے بے جگہ ہوئی ہوں گی - اس کی ایک مثال ہمیں سگرتیوں (Asagartiya) کے ایک گروہ کے ترک وطن میں ملتی ہے، جن کا اصل وطن سیستان تھا - آشوری عہد میں ان سگرتیوں Sagartians کو ہم میڈیا (ذِکِرتو Zikirtu یا ذَکُرتی Zakruti؛ دیکھیے Streck، *ZA*، ۱۴ : ۱۴۶) میں پاتے ہیں - دارا Darius کے زمانے میں (بیستون، کتبہ ۲ س ۹۰) ان کا دارالحکومت دشت آشوری میں اربلہ Arbela کے مقام پر قائم ہو چکا تھا، جہاں دارا نے ان کے سردار چِتْرَنْتَخْمَہ Citrantakhma کو قتل کیا، جس کی اس تصویر سے جو بیستون کی چٹان پر کھدی ہوئی ہے، کردی وضع قطع ظاہر ہوتی ہے (L.W. King : *The Sculptures of Behistan*، لنڈن ۱۹۰۷ء) - یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سیرتیوں کی اجیر فوج نے ۲۲۰ ق - م اور ۱۷۱ ق - م کے مابین روم، سلوقیوں (Seleucids) اور شاہان پرگمہ (Pergamon) کے درمیان لڑائیوں میں حصہ لیا تھا (Livy، ۴۲ : ۵۸ س ۱۳ و ۳۷ : ۴۰ س ۹؛ Polybius، ۵ : ۵۲ س ۵؛ نیز دیکھیے Weissbach، در Pauly-Wissowa، بار دوم، بذیل مادّۂ Cyrtii؛ A. J. Reinach : *Les Mercenaires de Pergame*، *Revue Archéologique*، ۱۹۰۹ء، ص ۱۱۵ تا ۱۱۹) - ساتویں صدی عیسوی میں ارمینیہ کے جغرافیے میں صوبۂ کورچیخ Korcēkh کے سلسلے میں بڑے دلچسپ تغیر و تبدل کا حال معلوم ہوتا ہے (بقول Adontz : *Armenia*، ص ۴۱۸، کورچیخ دراصل کورتچ ایخ Kortič-aikh سے بنا ہے جس میں کورتچ Kortič سے مراد کرد ہے، جیسے Atrpatic سے مراد Atropatene کا باشندہ ہے) - فوسطوس بوزنطینوس Faustus Byzantinus کے زمانے (چوتھی صدی) میں کورچیخ سَلْماس [رک بآں] کے قریب محض ایک ضلع تھا: کورچیخ بحیثیت ایک صوبے کے جُولا مرگ سے جزیرۃ ابن عمر تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں حسب ذیل اضلاع شامل تھے: کوردخ، تین کوردرخ (کوردِخ)، اَیْتُونخ، اَیْگرخ، موتھو لاؤخ (اوتھولنخ)

اورسروخ (اورسنخ)، کرتھنخ (سرپونخ)، چھک اور کوچک البک (Hartmann : *Bohtan*، ص ۹۳؛ Hübschmann : *Die altarm. Ortsnamen*، ص ۲۵۵ تا ۲۵۹).

ہمیں ان تغیرات کا بھی پتا چلتا ہے جو یہاں بتدریج رونما ہوتے رہے۔ کوردخ، کوردخ اور تمورخ (جس کا ذکر فوسطوس Faustus نے قدیم Corduene کی جگہ کیا ہے) کے تین اضلاع میں سے کوردخ کورچیخ کا محض ایک ضلع بن گیا تھا، اور تمورخ بالکل محو ہوگیا تھا۔ اس سے کوردرخ (کوردخ) کو پورا فائدہ پہنچا، جسے صرف بالائی وسطی اور زیریں اضلاع میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

Hübschmann (موضوع مذکور، ص ۳۸۵) نے صرف کوردرخ اور کوردخ کے درمیان فرق واضح کرنے پر اکتفا کیا ہے، لیکن عموماً M. Hartmann اور Nöldeke نے جو لسانی فرق قائم کیا تھا اس سے مخلوط یا مسخ شدہ شکلوں کا وجود خارج از امکان نہیں ہوتا (M. Hartmann، موضع مذکور، ص ۹۲: "es gingen wohl schon früh die Namen durcheinander" [= بہت ممکن ہے کہ ان ناموں میں خاصی مدت پہلے التباس واقع ہو چکا تھا])۔ Nöldeke نے تو اسما کا ایک تیسرا گروہ بھی علٰحدہ قائم کیا ہے، یعنی آرامی قَرْتِوَایہ Kartewāyē (عربی قَرْتَاوِیة ؟) جس کا مطلب ہے اصل کرد؛ دیکھیے Hoffmann : *Auszüge* وغیرہ، ص ۲۰۷، حاشیہ ۱۶۳۹.

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عرب فتوحات کے زمانے کے قریب ایرانی یا ایرانی نما قبائل پر مشتمل ایک ملی جلی قوم کے لیے صرف ایک نسلی اصطلاح کرد (جمع: اَکْراد) استعمال ہونے لگی تھی۔ مؤخرالذکر قبائل میں سے بعض تو یہاں کے اصلی قدیمی باشندے تھے (قَرْدو، تمورخ Tmorikh یا طمورایہ Tamurāyē اس ضلع میں جس کا صدر مقام الٹی (Elk) تھا)۔ الخُوَیْثِیَہ (Χοθαῖται) ساسون کے ضلع خوئت Khoit میں، اورطایہ Orṭāyē (= الارطان) فرات کے موڑ پر؛ بعض سامی تھے (دیکھیے کرد قبائل کے معروف شجرہ ہائے نسب) اور بعض غالباً ارمن تھے (کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ مَمْکان مَمْکونی النسل ہے).

بیسویں صدی میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ایک غیر کرد ایرانی عنصر کردوں میں شامل ہو چکا تھا (یعنی گوران زا زا گروہ)۔ متعدد اضلاع میں ایک طرح کی معاشرتی طبقہ بندی ہوگئی تھی، جس کی بنیاد نوواردوں کے سیاسی غلبے پر قائم تھی، یعنی سلیمانیہ [رَک بَاں] میں، ساوَج بُلاق [رَک بَاں] میں اور کوتور میں، جہاں شَقاق کے زیر تسلط بچے کھچے کورہ سِنلی (؟) ملتے ہیں۔ اگر باقاعدہ تحقیق کی جائے تو ممکن ہے کہ ایسی قدیم اقوام کے آثار کا پتا چل سکے جن پر کرد عنصر کے چھا جانے سے ایک واحد قوم کی شکل بن گئی.

شجرہ ہائے نسب اور معروف اشتقاقات: کُردوں کی ابتدا کے مسئلے کے بارے میں اسلامی مآخذ اور کردی روایات سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملتی۔ المسعودی نے بتایا ہے کہ وہ ان ایرانیوں کی نسل سے ہیں جو ظالم بادشاہ ضحّاک [تازی] کے پنجے سے نکل کر یہاں چلے آئے تھے۔ (مروج، طبع Barbier de Meynard، ۳: ۲۵۱)۔ اس روایت کی بہترین تفصیل شاھنامہ (طبع Macan، ۱: ۲۷ تا ۲۸؛ طبع Mahl، ۱: ۷۱؛ طبع Vullers، ۱: ۳۶ اشعار ۲۹ تا ۳۸) میں ملتی ہے۔ ۱۸۱۲ء میں Morier (*Second Journey*، ص ۳۵۷) نے دماوند میں (۲۱ اگست کو) ایک تہوار کا ذکر کیا ہے، جو ضحّاک کے استبداد سے ایران کے نجات پانے کی یاد میں منایا جاتا تھا اور اسے عید کُردی کہتے تھے۔ دوسری طرف کردوں نے اپنا سلسلۂ نسب عربوں سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ بعض (مروج، ۳: ۲۵۳) کا دعوٰی تھا کہ رَبیعة بن نزار بن مَعَد ان

کا جد امجد ہے اور بعض مُضر بن نزار کی نسل سے ہونے کے مدعی تھے؛ چنانچہ ان دونوں کے نام پر دیار ربیعۃ (موصل) اور دیار مضر (رَقّۃ) کے اضلاع کے نام رکھے گئے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ غسّانیوں کے خلاف لڑائیوں کے باعث اپنے عرب خاندان سے علٰحدہ ہو گئے اور پہاڑوں میں پناہ لینے اور اجنبیوں کے ساتھ خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے اپنی مادری زبان بھول گئے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اسلاف کے ناموں کا وہ سلسلہ ہے جس میں ہمیں کُرد بن مَرْد (دیکھیے Μαρδοί، کردوں کے ہمسائے) بن صَعْصَعَۃ بن حَرْب بن ہوازن (المسعودی: کتاب مذکور؛ نیز التنبیہ، ص ۸۸ تا ۹۱: کرد بن اَسْفندیاذ بن منو شہر؛ ابن حَوقل، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷: کُرد بن مَرْد بن عَمرو) کے نام ملتے ہیں۔ ان تمام شجرہ ہائے نسب میں تاریخی حقیقت کا بھی کچھ شائبہ ہوسکتا ہے (مثلاً سامیوں کا ایرانی رنگ قبول کرلینا اور زغروس Zagros اور فارس کے قبائل کا باہمی امتزاج)۔

عوام پسند اشتقاقات کی بھی کوئی کمی نہیں۔ کوشش کی گئی ہے (مُروج، ۳: ۲۴۹) کہ اس نام کا سلسلہ عربی مادّۂ کَرَّ سے ملایا جائے؛ اس اعتبار سے کُرد نوجوان کنیزوں اور جَسَد نامی دیو (جسے حضرت سلیمان[۴] نے نکال باہر کیا تھا) کی اولاد ٹھیرتے ہیں۔ بسا اوقات (دیکھیے Driver، در *JRAS*، ۱۹۲۳ء، ص ۳۰۴) اسم کرد کا رشتہ فارسی لفظ گُرد (= قہرمان: بطل) سے جوڑا جاتا ہے، اگرچہ پہلوی زبان میں اس مادّے میں دراصل "گ" تھا اور اس کا تعلق مادّۂ "ور" (بمعنی حفاظت کرنا) سے ہے (Horn: *Neuper. Etymol.*، ص ۲۰۰)۔

زمانۂ مابعد میں قبائل کے ناموں کی توضیح اکثر ان ناموں سے کی جاتی تھی جن کی طرف وہ منسوب ہوتے تھے؛ شرف نامہ (۱: ۱۵۸) کی رو سے تمام کرد (بَجْنَوی اور بُخْتی قبائل) بَجَن اور بُخْت سے آئے تھے۔ ان میں سے اوّل الذکر کا سلسلہ بسناو Basn-āw سے قائم کیا جاسکتا ہے، جو دریائے دجلہ کا ایک معاون ہے (Andreas، در Hartmann، ص ۱۳۱) اور آخر الذّکر سے ہیروڈوٹس Herodotos کے Παχτυικὴ یا شاہ اژدر (کُرد؟) ہفتان بُخت کی یاد تازہ ہوتی ہے، جسے اردشیر بابکان نے ہلاک کیا تھا (دیکھیے Nöldeke: *Tabari*، ص ۱۱)۔ ایک اور داستان کے مطابق، جو شمال اور مغرب میں بالخصوص مقبول ہے، ایک زمانے میں کرد دو شاخوں میں منقسم تھے: ہِلان اور زِلان؛ پہلی شاخ عرب سے آئی تھی اور دوسری مشرق سے۔ زلان کو کمتر درجے کی نسل شمار کیا جاتا تھا (دیکھیے M. Sykes، در *Jour. R. Anthrop. Inst.*، ۱۹۰۸ء، ۳۸: ۴۷۰)۔

مآخذ: (۱) F. Justi: *Kurdische Grammatik*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۰ء، ص ۲۲؛ (۲) W. Tomaschek: *Sasun und d. Quellengebiet d. Tigris*، در *S. Ak. Wien*، ۱۸۹۵ء، ج ۱۳۳/۴؛ (۳) M. Hartmann: *Bohtan*، در *Mitt. d. Vorderasiat. Gesell.*، ۱۸۹۶ء/۲، ۱۸۹۷ء/۱، ص ۹۰ تا ۱۰۳؛ (۴) Nöldeke: *Kardu und Kurden*، در *Festschrift f. H. Kiepert*، برلن ۱۸۹۸ء، ص ۷۳ تا ۸۱؛ (۵) Hübschmann: *Die altarmen. Orts- u. namen*، در *Indogerm. Forsch.*، ۱۹۰۳ء، ۱۶: ۲۵۵ تا ۲۵۹؛ (۶) Weissbach، در Pauly-Wissowa: *Real-Encyclopädie*، بذیل مادّۂ Καρδοῦχοι و Κύρτιοι؛ (۷) Driver: *The name Kurd and its philological connexions*، در *JRAS*، ۱۹۲۳ء، ص ۳۹۲ تا ۴۰۳۔

ب۔ تاریخ

عربوں کی فتح کے بعد کے زمانے سے ہمیں کردوں کی بابت بڑے مفصل حالات ملتے ہیں۔ سن ہجری کی پہلی پانچ صدیوں میں پیش آنے والے واقعات میں کردوں کا خاصا حصہ تھا، بلکہ

اکثر واقعات کے سلسلے میں کرد ہی پیش پیش نظر آتے ہیں ۔ اس زمانے میں کردوں کے بہت سے شاہی خاندان منظر عام پر آئے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی سے دسویں صدی ہجری تک ترک اور مغل حملہ آوروں کی یورشوں سے کرد دبے دبے رہے، لیکن سلاطین عثمانیہ اور شاہان صفوی کے درمیان جنگوں کے زمانے میں کردستان میں ایسے حالات پیدا ہوگئے جو وہاں جاگیردارانہ نظام کی نشوونما کے لیے ساز گار تھے ۔ اس کی ایک صحیح تصویر ہمیں شرف نامہ (۱۰۰۳ھ/۱۵۹۶ء) میں ملتی ہے ۔ ترکیہ اور ایران کی سرحد آہستہ آہستہ مستحکم ہوگئی اور ایرانی کوہ زغروس اور اس کی شمالی شاخوں کے پیچھے ہٹ آئے ۔ اب ترکیہ نے اپنے مشرقی صوبوں میں مرکزی حکومت کے اقتدار کو مضبوط کرنے کا کام شروع کر دیا ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں بچی کھچی کرد ریاستیں بھی مملکت ترکیہ (هَکّاری، بِدْلیس، سلیمانیہ) اور ایران (اَرْدَلان) میں مدغم ہو کر نیست و نابود ہوگئیں، لیکن بڑے بڑے کُرد قبائل کا وجود اب تک باقی ہے اور ان کی اندرونی تشکیل کُرد قوم اور اس کی معاشری و نسلی خصوصیات کی بقا کی ضامن ہے ۔ ایران تو شاید ہی کبھی کرد قبائل کے داخلی مسائل میں دخل اندازی کرتا مگر ترکیہ کی کوشش ہوتی کہ کردوں کو اپنے مرکزی اقتدار کا سہارا قرار دے اور اسی حیثیت سے ان سے کام لے ۔ بعض اوقات تو یہ کُرد انعام و اکرام کے بوجھ تلے دبے رہتے اور کبھی انھیں اپنی قدیم خود مختاری کے بچے کچھے آثار کو دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے مزاحمت کرنا پڑتی ۔ انیسویں صدی میں کردوں نے متعدد بار علم بغاوت بلند کیا ۔ بیسویں صدی میں ایک کردی تحریک کا آغاز ہوا، جس نے اس شورش پسندی میں اضافہ ہو گیا جو ترکی سلطنت کے اندر موجود تھی ۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے کردوں کو سیاست کے میدان میں کھینچ لیا ۔ کردوں کے اخباروں، رسالوں اور جماعتوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا ۔ عالمی جنگ (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) میں پہلی بار بڑی طاقتوں نے ایک خود مختار کردستان کا تصور پیدا کیا، لیکن اس تجویز کو ابھی تک صرف جزوی طور پر عملی جامہ پہنایا جا سکا ہے اور اس کا محل وقوع محض موصل کی قدیم ولایت کے ایک حصے تک، جو عراق کی نئی مملکت میں شامل ہے، محدود ہے ۔

کُرد عرب فتوحات کے بعد: بہتر ہوگا کہ ہم اپنے بیان کا آغاز ان معلومات سے کریں جو عرب مصنفین نے کرد قبائل کی تعیین و تعداد کے بارے میں جمع کی ہیں ۔

چونکہ عہد سلاجقہ سے قبل کردستان کے نام سے کوئی آشنا نہ تھا، لہٰذا عرب مصنفین کردوں کا ذکر عموماً زَوْزَان، خِلاط، اَرْمینیہ، آذربیجان، جبال، فارس وغیرہ کے عنوانات کی ذیل میں کرتے ہیں (دیکھیے Driver: *Dispersion of the Kurds in Ancient Times*، در *JRAS*، اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص ۵۶۳ تا ۵۷۲) ۔

المَسْعودی (تقریباً ۳۳۲ھ/۹۴۳ء) اور الاِصْطَخْری (۳۴۰ھ/۹۵۱ء) پہلے مصنف ہیں جنھوں نے کردوں کے بارے میں باقاعدہ معلومات مہیا کی ہیں ۔ مُروج الذَّہَب (۳ : ۲۵۳) میں المَسْعودی نے حسب ذیل قبائل شمار کیے ہیں: دِیْنَوَر اور ہَمذَان میں شُہْجَان: کَنْگَوَر میں ماجِردان؛ آذربیجان (متن میں تصحیح فرما لیجیے) میں ہَذْبانی اور سَرَاۃ (غالباً شُرَاۃ = خوارج [رک بآں]؛ دیکھیے (داستان دَیْسَم نیچے)؛ جبال میں شَادَنْجان، لَزْبَۃ (لُرّی ؟)، مَادَنْجان، مَزْدانکان، بارسَان، خَالی (جلالی)، جابارق، جَاوانی، مُسْتَکان؛ شام میں دَبَابِلَۃ، وغیرہ؛ موصل اور جودی میں عیسائی کرد، یعنی الیَعْقُوبِیّۃ

(Jacobite) اور جُرْقان (جُرْغان) ۔ اس فہرست میں اسی مصنف کی دوسری کتاب التّنبیہ (ص ۸۸ تا ۹۱) سے صرف بازنجان (دیکھیے الاصطخری، ص ۱۱۵)، نَشْوَرہ، بوذیکان اور کیکان (جو آج کل مَرْغَش کے قریب ملتے ہیں) کا اضافہ ہوتا ہے، لیکن اس نے ان مقامات، یعنی رُمُوم (زُموم؟) کی ایک فہرست دی ہے، جہاں کرد مقیم تھے: فارس، کرمان، سجستان، خراسان (الاصطخری، ص ۲۸۲: ضلع اسد آباد میں ایک کرد گاؤں)، اصفہان (قبیلۂ بَازَنْجان کا ایک حصہ اور ایک بارونق قصبہ جسے کرد بیان کیا گیا ہے؛ دیکھیے الیعقوبی، ص ۲۷۵؛ الاصطخری، ص ۱۲۵)، جبال، بالخصوص ماہ کوفہ، ماہ بصرہ، ماہ سَبَذان (ماَ سَبَذان) اور دو اِیْغار (یعنی کَرَج ابن دُلَف اور بُرْج)، ہَمذان، شہر زُور، جس میں اس کی دونوں ماتحت ریاستیں دَرآباد اور صَمْغان (زَمْکان) شامل ہیں، آذربیجان، ارمینیہ (دریاے جیحوں کے کنارے کُرد دَوِین کے مقام پر گارے اور پتھر کے بنے ہوے مکانوں میں رہتے تھے، المقدسی، ص ۳۷۷)، اَرّان (بَرْدَعة کا ایک دروازہ "باب الاکراد" کہلاتا تھا۔ ابن مُسکَوَیہ کا بیان ہے کہ ۳۳۲/۳۳۲ء میں روس کے حملے کے وقت یہاں کے مقامی حاکم کے ماتحت کرد سپاہی تھے)، بَیْلَقان، باب الاَبْواب (دَربَند)، الجزیرہ، شام اور الثُّغور، (یعنی کیلیکیا (Cilicia) کی سرحد پر قلعوں کی قطار)۔

الاِصْطَخری نے ص ۹۸ پر بالخصوص فارس میں پانچ رُمُوم کا ذکر کیا ہے جو ان اضلاع کو کہا جاتا تھا جن میں کرد پھیلے ہوے تھے۔ ڈخویہ (*BGA*، ۴: ۲۵۰) کے بیان کے باوجود ہم اس لفظ کا املا بصورت 'رَمْ رُمُوم' (فارسی لفظ رَم [رمہ] سے مشتق بمعنی ریوڑ، بھیڑ) کو ترجیح دیں گے، کیونکہ زُومہ سے صیغۂ جمع زُموم بنانا قرین قیاس نہیں۔ ہر رَمّ کا اپنا قصبہ اور ایک اپنا کرد سردار ہوتا تھا، جس پر خراج اور عوام کی حفاظت کی ذمّےداری عائد ہوتی تھی۔ یہ رُموم حسب ذیل تھے: (۱) جِلُویہ، یا رَامِجان، جس کی سرحدوں پر اصفہان اور خوزستان واقع تھے؛ (۲) لَوَالِجان، شیراز اور خلیج فارس کے درمیان؛ (۳) دیوان، کورۂ سابُور میں؛ (۴) کارِیان، کرمان کی سمت میں؛ (۵) شاہریار، اصفہان کے نزدیک، جسے وہاں کے بڑے قبیلے کے نام پر بَازَنْجان بھی کہتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک حصہ صوبۂ اصفہان میں نقل مکانی کر گیا تھا۔ رموم کی فہرست کے ضمیمے کے طور پر الاصْطَخری نے فارس کے ۳۳ خانہ بدوش قبائل (حیّ؛ جمع: اَحْیا) کی فہرست بھی دی ہے، جو دیوان الصّدقات کے بیانات پر مبنی ہے اور جسے ابن حَوْقَل (ص ۱۸۵ تا ۱۸۷) اور المُقَدّسی (ص ۴۳۶) نے بھی نقل کیا ہے: کرمانی، رامانی، مُدَثّر، محمّد بن بَشَر، بُقَیلی (المُقَدّسی: الثَّعلبی)، بُنداد مَہْری، محمّد بن اسحٰق، سباحی، اسحٰقی، اَذْرَکانی، شَہْرَکی، طُہَمادہنی، زِبادی، شَہْرَوی، بُنَدادکی، خُسْرَوی، زَنْجی، صَفَری، شَہْیاری، مُہرکی، مُبارکی، اُشْتام ہَری، شاہونی، فُراتی، سَلْمونی، سیری، آزاد دوختی، بَراز دوختی، مُطَّلبی، مَمالی، شاہکانی، کَجْتی، جَلِیلی؛ یہ کل پانچ لاکھ گھرانے تھے، جو خیموں میں رہتے تھے۔

فارس نامہ (تقریباً ۵۰۰ھ/۱۱۰۷ء) میں لکھا ہے (ص ۱۶۸) کہ فارس کی قدیم فوج کا بہترین حصہ جِلُویہ، ذِیْوان، لَوالِجان، کارِیان اور بَازَنْجان کے پرانے اور وسیع رموم کے کردوں پر مشتمل تھا۔ یہ سب ان جنگوں میں ہلاک ہو گئے جو اسلام کی آمد پر لڑی گئیں؛ صرف ایک عَلَک باقی بچا، جو مسلمان ہو گیا اور اس کی نسل جاری رہی۔ باقی کردوں کو عضد الدّولہ نے اصفہان سے فارس میں منتقل کر دیا۔ یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ کردوں کے پانچ لاکھ (؟) گھرانے بالکل نیست و نابود

ہو گئے؛ البتہ یہ امکان قابل قبول ہے کہ فارس کے کرد قبیلے آپس میں مل جل گئے ہوں اور ان کے از سر نو نئے قبیلے بن گئے ہوں اور انھوں نے اپنی پرانی قومیت کو ترک کردیا ہو۔ آج کل جلُویہ کے قدیم رَمّ (کوہ گَلُو) میں اب لُر آباد ہیں۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ وہ کب سے وہاں آباد ہیں، تاہم الاِصْطَخری کی فہرست میں فارس کے کردوں میں ایک قبیلے لُرّیہ (یا لَزْبَہ ؟) کا ذکر آیا ہے۔ دوسری جانب فارس نامہ میں کردوں اور شَبان کارہ [رَکّ بان] قبائل کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ آل بُوَیہ کے آخری بادشاہوں کے عہد میں یہ شَبان کارہ قبائل فارس میں بے حد قوت حاصل کر چکے تھے۔ العُمَری : مَسالِکُ الاَبْصار میں شَبان کارہ کا ذکر ایک جداگانہ عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ شرف نامہ میں ان کا ذکر کرد خانوادوں کی ذیل میں نہیں ملتا؛ ہاں ان کا ایک قبیلہ (رامانی) ایسا ہے جس کا نام الاِصْطَخری کی کرد قبائل کی فہرست میں موجود ہے۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارس کے کرد کردستان کے قبائل سے بہت کچھ مختلف تھے [رَکّ بہ شُول اور لُر] .

اصطلاح الزَّوزَان کا جو ایک حد تک وسطی کردستان کے مرادف ہے (کردی زبان میں اس کا مفہوم موسم گرما کی چراگاہیں ہے) مفہوم واضح نہیں۔ بقول ابن حَوْقل (ص ۲۵۰) زَوْزان کا بادشاہ الدَّیْرانی کہلاتا تھا (= دِرَنِک، وَسپُرکان کا ارمنی بادشاہ)۔ المُقَدّسی (ص ۱۳۷) زوزان کو جزیرۃ ابن عمر کا ایک ناحیۃ قرار دیتا ہے۔ اس علاقے میں کردوں اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی تھی اور آگے چل کر اس کی حدود وسیع ہو گئیں۔ ابن الأثیر (در یاقوت : ۲ : ۲۵۷) کے بیان کے مطابق الزّوزان کا علاقہ موصل سے دو روزہ مسافت کے بعد شروع ہوتا تھا اور وہ خِلاط کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا؛ آذربیجان کی طرف یہ علاقہ سَلْماس تک پہنچتا تھا۔ بہت سے مستحکم مقامات بَشْنَوی اور بوختی کردوں کے قبضے میں تھے۔ اوّل الذّکر کے پاس بَرْقا، بَشِیر [اور فَنَک] تھے؛ آخر الذّکر کے پاس جرذَقیل (گُرگیل)، یعنی ان کے مَلِک اتَل (شرف نامہ، ۱ : ۱۱۷ : نَشْ آتِل ؟) کے صدر مقام کے علاوہ عَلُّوس اور باز اَلْحمرا تھے؛ فرمانروایان موصل (زَنگی) کے قبضے میں حسب ذیل مقامات تھے : اَلْتَقِی (= الک)، اَرْوَخ، بَخوخَۃ (= بکوکی، در بَرْواری)، برخو، کَنْگَور(؟)، نِیرَوَۃ (عَکْر؟ کے مشرق میں؟) اور خَوْ شَب۔ یاقوت کا متن زیادہ قابل وثوق نہیں ہے۔ بہرحال یہ ان کرد قلعوں کے نام ہو سکتے ہیں جو آہستہ آہستہ حَمدانی اور زنگی فرمانرواؤں نے اپنی قلمروؤں میں شامل کر لیے .

کرد خلفاے بنو عباس اور آل بویہ کے عہد میں : المسعودی (مروج، ۳ : ۲۴۹) نے عہد جاہلیت کی وہ روایات محفوظ کر دی ہیں جن میں غسّانی عرب [رَکّ بہ غسّان] حکمرانوں اور کردوں کے مابین جنگوں کا ذکر ہے۔ عرب مسلمانوں کے ۱۶ھ/۶۳۷ء میں تَکْریت اور حُلْوان پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا کردوں سے واسطہ پڑا۔ سَعْد بن ابی وقّاص نے موصل پر چڑھائی کی، جس سے وہ اضلاع قبضے میں آ گئے جہاں کرد آباد تھے (اَلمَرْج با نُہَذرا، با عَذْرا، جِبْتُون، داسن، وغیرہ) دیکھیے ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg، ۲ : ۴۰۸۔ اس علاقے کی فتح عِیاض بن غَنَم اور العُتْبۃ کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی (البَلاذُری: فتوح البلدان، طبع de Goeje، ص ۳۳۱)۔ ۱۹ھ/۶۴۰ء میں الزَّوزان کے بطریق نے خراج ادا کرنا منظور کرکے اپنے اقتدار کی توثیق کر لی (فُتوح، ص ۱۷۶) - ۱۸ھ/۶۳۹ء میں عربوں کی کردوں سے سوسہ (Susiana) میں لڑائی ہوئی کیونکہ کردوں نے اہواز کے ایرانی حاکم الہُرْمُزان کی

حمایت کا اعلان کر دیا تھا (الکامل، ۲ : ۴۲۵) - اسی طرح فارس میں کردوں نے ۲۳ھ/۶۴۲ء میں فَسا اور دَاراب جُرد کے دفاع کے سلسلے میں ایرانیوں کا ساتھ دیا (کتاب مذکور، ۳ : ۳۲)- حضرت عمرؓ نے اھواز کے کردوں کے مقابلے کے لیے کئی بار فوج بھیجی (فتوح، ص۳۸۲، ۳۸۹؛ الکامل ۳: ۳۷)- دوسری طرف حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کردوں نے وسطی کَرْخا کے علاقے (صَیْمَرہ، ماسَبَذان) پر حملہ کیا جہاں الیعقوبی کے زمانے تک فارسی زبان ہی بولی جاتی تھی (BGA، ۷ : ۲۳۶) - قبل از اسلام یوں تو عرب شہرزُور تک پہنچ چکے تھے (ابن الفقیہ، ص ۱۳۰)، لیکن شہرزور، دَار باذ اور صَمْغان پر فیصلہ کن قبضہ ۲۲ھ/۶۴۳ء میں ایک خونریز جنگ کے بعد ہی ہو سکا (فتوح، ص ۳۳۴؛ الکامل، ۳ : ۲۹) - جنوب میں ۲۵ھ/۶۴۵ء میں بصرے کے عامل ابو موسیٰ کو بِیْروذ اور بَلْسجان میں کردوں کی بغاوتوں کو فرو کرنا پڑا- لیکن کُرد جنھوں نے اسلام قبول تو کر لیا تھا، لیکن بعد میں بڑی تعداد میں مرتد ہوگئے (الکامل، ۲ : ۶۶، ۷۶)- حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں کردوں نے ایرانیوں اور عیسائیوں کے دوش بدوش اھواز کے قریب الخِرِّیت اور فارس کی بغاوتوں میں شرکت کی، لیکن ان کے سردار کو رام ہرمز کے مقام پر شکست ہوئی (کتاب مذکور، ۳ : ۳۰۹) .

اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں المختار نے ارمینیہ اور آذربیجان پر قبضہ کر لیا - اس نے ۶۶ھ/۶۸۵ء میں حلوان میں ایک عامل مقرر کیا جس کے ذمّے یہ کام تھا کہ کردوں کے خلاف جنگ کرے (الکامل، ۴: ۱۸۷)، لیکن المختار کی وفات کے باعث یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی - اسی خلیفہ کے عہد میں باغی عبدالرحمٰن نے فارس میں سابور کے کردوں سے ۸۳ھ/۷۰۲ء میں ساز باز کر لی (کتاب مذکور، ۴ : ۳۵۲) - ۹۰ھ/۷۰۸ء میں کردوں نے فارس کو تاراج کیا اور الحجّاج نے انھیں سزا دی - ۱۲۹ھ/۷۴۶ء میں سابور کے کردوں نے خارجیوں کے حلیف سلیمان کا مقابلہ کیا جس نے خلیفہ مَروان ثانی سے باغی ہوکر سابور کا محاصرہ کر لیا تھا (کتاب مذکور، ۴ : ۳۸۷، ۳۴۱؛ ۵ : ۲۸۳) - خلیفہ مروان خود ایک کرد کنیز کے بطن سے تھا (الطبری، ج ۳، ۱ : ۵۱) اور نیلی آنکھیں اور گورا رنگ اسی سے ورثے میں پایا تھا (The Caliphate : Sir W. Muir، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۴۲۹) .

عباسی خلیفہ المنصور کے عہد میں جب خزاروں نے ۱۴۷ھ/۷۶۴ء میں ارمینیہ پر حملہ کیا تو متعدد بغاوتیں برپا ہوئیں - اس سے چند سال بعد کردوں کا ذکر (انتشار الاکراد) پھر اس شورش کے سلسلے میں ملتا ہے جو موصل میں ہوئی اور جس کی صدائے بازگشت ہمدان میں بھی سنائی دی (الکامل، ۵ : ۴۴۸ و ۶ : ۹) - المنصور کے بیٹے جعفر کی ماں بھی ایک کرد کنیز تھی (الطبری، ۳ : ۴۴۲) .

المستعصم کے زمانے میں ۲۲۵ھ/۸۳۹ء کے حالات کے تحت ایک کرد بغاوت کا ذکر آتا ہے جو موصل کے ضلع میں ہوئی - اس بغاوت کا ذمّے دار ایک اعلیٰ کرد خاندان کا نو عمر رکن جعفر بن فَہر تھا - بادغیس میں شکست کھانے کے بعد جعفر نے داسِن کے پہاڑوں میں پناہ لی اور یہاں اس نے خلیفہ کے لشکر کو شکست دی - ترک سردار آیتاخ کے ماتحت ایک نئی فوج ترتیب دی گئی جس نے اس بغاوت کو فرو کیا (الکامل، ۶ : ۳۶۰، ۳۶۱) - ۲۳۱ھ/۸۴۵ء میں کردوں کی ایک اور بغاوت اصفہان، جبال اور فارس کے علاقوں میں رونما ہوئی، لیکن اسے ترک سپہسالار وَصِیف نے جلد ہی فرو کر دیا .

۲۵۲ھ/۸۶۶ء میں موصل کے کرد مساور خارجی کے ساتھ مل گئے جس نے موصل پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۲۶۲ھ/۸۷۵ء میں انھوں نے زنجی غلاموں کی شورش میں خاصا حصہ لیا (دیکھیے Nöldeke : *Sketches from Eastern History* لنڈن، ص ۱۴۶ تا ۱۷۵ : *A Servile war in the East*)، جن کی قیادت ایک علوی خارجی (؟) علی محمّد المعروف بہ الخَبیث کے ہاتھ میں تھی، نیز خاندان صفّاریہ [رک بآں] کے بانی یعقوب الصفّار کی بغاوت میں بھی انھوں نے اچھا خاصا حصہ لیا۔ یعقوب نے اھواز میں اپنا ایک کرد نائب محمّد عبیداللہ بن ہزار مَرْد مقرر کیا۔ اس کے ارادے بہت بلند تھے، چنانچہ وہ الخبیث سے خفیہ نامہ و پیام کرنے لگا۔ الخَبیث کی مرسلہ کمک لے کر محمّد نے سوس پر چڑھائی کی، لیکن احمد لَیْثویہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔ احمد بن لَیْثویہ خود ایک کرد تھا اور اس کرد امدادی فوج کا سپہ سالار تھا جو خلیفہ نے یعقوب کی بغاوت کچلنے کے لیے بھیجی تھی (ابن خلکان : وَفیات، طبع de Slane، ۴ : ۳۰۴ تا ۳۰۸)۔ جب احمد وہاں سے رخصت ہوگیا تو محمّد نے الخبیث سے مزید کمک حاصل کرکے، جس کا کچھ حصہ کردوں پر مشتمل تھا، شوستر پر قبضہ کرلیا۔ یہاں اگرچہ یہ طے پا چکا تھا کہ الخبیث کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا، پھر بھی اس کی جگہ اس نے خلیفہ المعتمد اور اس کے حریف یعقوب الصفّار کے نام کا خطبہ پڑھ دیا۔ اس پر محمّد کے زنجی حلیفوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا اور شوستر پر دوبارہ ابن لَیْثویہ کا قبضہ ہوگیا۔ محمّد نے رام ہرمز میں پناہ لی، لیکن الخبیث کے سپہ سالاروں نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ محمّد کو جب 'دارنان کردوں' کی جانب سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے الخبیث سے پھر مدد چاہی۔ الخبیث نے اسے کچھ فوج بھیجی جسے اس نے فوراً میدان جنگ میں بھیج دیا اور جب اس فوج کے سپاہی گھر گئے تو اس نے دفعۃً ان پر حملہ کر دیا، لیکن محمّد، الخبیث سے ترک تعلق نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ اسے خلیفہ تسلیم کر لینے پر رضامند ہوگیا۔ یعقوب کی وفات (۲۶۵ھ/۸۷۹ء) اور الخبیث کی وفات (۲۷۰ھ/۸۸۳ء) سے ان مہمات کا خاتمہ ہوگیا (الکامل، ۷ : ۲۶۴)۔

جب تقریباً ۲۸۱ھ/۸۹۴ء میں ایک عرب حَمْدان بن حَمْدُون نے موصل میں اپنی حکومت قائم کی تو کرد اس کے حامیوں میں شامل تھے۔ ۲۸۴ھ/۸۹۷ء میں ابولیلی نے کُردوں کی ایک بغاوت برپا کی جو زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی (کتاب مذکور، ۷ : ۳۲۵، ۳۳۷)۔ ۲۹۳ھ/۹۰۶ء میں ہَذبانی کردوں نے اپنے شیخ محمّد بن بلال کی قیادت میں نینوا کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا۔ موصل کے نئے عامل عبداللہ بن حمدان نے ان کا تعاقب کیا، لیکن اسے مَعْطوبۃ کے مقام پر ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اگلے سال اس نے خلیفہ کی ارسال کردہ کمک ساتھ لے کر پانچ ہزار ہذبانی گھرانوں کا تعاقب پھر شروع کیا۔ کردوں نے مہلت حاصل کرنے کے لیے نامہ و پیام شروع کیا اور آذربیجان میں ہٹ آئے۔ عبداللہ نے موصل واپس آکر نئی فوج ساتھ لی اور ایک بار پھر ہذبانیوں پر چڑھائی کر دی جو جبل السِّلّق (غالباً لاھِجان، دیکھیے ساوج بولاک) میں خندقیں کھود کر محصور ہو بیٹھے تھے۔ ہذبانی ہتیار ڈالنے پر مجبور کر دیے گئے اور ان کے بعد حُمَیدی قبیلے اور جبل داسن کے باشندوں کی شورشیں فرو ہوگئیں (کتاب مذکور ۷ : ۳۷۱)۔ خلیفہ المقتدر کے عہد میں کردوں نے موصل کے مضافات میں لوٹ مار کی، لیکن حمدانی حکومت کے ہاتھوں سزا پائی۔ قبیلۂ جلالی نے بالخصوص شدید مقاومت کی۔ ۳۳۷ھ/۹۴۳ء کے احوال میں ابن

مہ کویہ (: تجارب الامم، ۶: ۱۰۵) ایک فوج کشی کا ذکر کرتا ہے جو حسین حمدانی نے آذربیجان پر کی تھی۔ اس موقع پر اس کا ایک حلیف ہذبانی قبیلے کا شیخ جعفر بن شکویہ تھا جو سلماس میں سکونت پذیر تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں دیسم بن ابراہیم تاریخ کے صفحات پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے دلیرانہ کارناموں کا کردوں سے بڑا قریبی تعلق رہا۔ وہ خود ایک عرب باپ اور کرد ماں کا بیٹا تھا اور دیلمیوں کے ایک مختصر گروہ کے سوا اس کے تمام پیرو کرد تھے۔ دیسم خارجی تھا۔ اس نے یوسف بن ابی الساج کے بعد آذربیجان پر قبضہ کر لیا اور ۳۲۷ھ/۹۳۸ء میں لشکاری بن مرزی کو ملک سے نکال دینے کے لیے اپنے کردوں سے کام لیا جو وشمگیر زیاری کے عاملوں میں سے تھا۔ ایک مشہور شیعی مسافری مرزبان دیسم سے آذربیجان چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔ دیسم نے اپنے دوست حاجیک بن الدیرانی (وسپرکن کا ارمنی بادشاہ خچک گجک بن درنک) کے ہاں پناہ لی۔ اب اہل تبریز نے دیسم سے مدد کی التجا کی، لیکن یہاں پھر اس نے ہزیمت اٹھائی اور پسپا ہو کر مسافریون کی رضامندی سے طرم چلا گیا۔ ۳۳۷ھ میں رکن الدولہ بویہی نے مرزبان کو قید کر لیا اور آذربیجان میں اپنا ایک نائب بھیج دیا۔ اس وقت مرزبان کے بھائی وہسودان کو دیسم کا خیال آیا جس کے کرد سپاہی ابھی تک اس کے وفادار تھے۔ اس نے دیسم کو رکن الدولہ کے نائب کے مقابلے میں روانہ کیا۔ دیسم کو شکست ہوئی، لیکن وہ اردبیل اور برذعہ میں ڈٹا رہا۔ جب مرزبان قید سے رہا ہو کر لوٹا تو دیسم کو پہلے ارمینیہ میں اور پھر بغداد میں پناہ لینی پڑی جہاں معزالدولہ بویہی نے اس سے بہت فیاضانہ سلوک کیا۔ اس کے دوست اسے آذربیجان واپس جانے پر اکسا رہے تھے، اس لیے وہ موصل اور شام کے حمدانی فرمانرواؤں کے پاس اعانت حاصل کرنے کے لیے گیا۔ ۳۴۴ھ میں دیسم مرزبان کی عدم موجودگی میں سلماس واپس آیا اور وہاں سیف الدولہ فرمانروائے شام کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ لیکن مرزبان نے دیسم کو پھر وہاں سے نکال دیا اور اس نے اپنے ارمنی دوستوں سے پناہ دینے کی درخواست کی۔ ابن الدیرانی (درنک بن خچک) کو اسے بجبر و اکراہ مرزبان کے حوالے کرنا پڑا۔ دیسم کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ بالآخر اس نے ۳۴۵ھ میں قید خانے میں وفات پائی (تجارب، طبع Amedroz، ۱: ۳۴۵؛ ۲: ۱۴۸ تا ۱۵۱؛ الکامل، ۸: ۲۸۹، ۳۶۱، ۳۷۵ تا ۳۷۷)۔

جن دنوں مرزبان رے میں اسیر تھا، ایران کے شمال مغرب میں کئی صوبیدار خود مختار ہو گئے۔ ان میں سے ایک (تقریباً ۳۴۰ھ/۹۵۱ء) محمد شداد بن قرطو تھا جو قبیلۂ روادی سے تھا اور جس کی نسل سے آگے چل کر آل ایوب کا عظیم خاندان وجود میں آیا۔ آل شداد کی بڑی جاگیریں دبیل اور گنجہ تھیں اور وہ بوزنطیوں اور سلاجقہ کے حلیف تھے۔ ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء میں ابوسوار نے اپنے نو عمر بیٹے منوچہ کے لیے شہر انی خرید لیا۔ اس وقت سے یہ خاندان دو شاخوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک شاخ گنجہ کی تھی، دوسری انی کی۔ ۱۱۲۴ء میں انی پر گرجستانی قابض ہو گئے، لیکن ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ اور ۵۵۷ھ/۱۱۶۱ء کے مابین اور پھر ۱۱۶۵ سے ۱۱۷۴ء تک اس پر آل شداد کا قبضہ رہا۔ آل شداد بڑے روشن خیال فرما نروا تھے، انھوں نے بہت سی قابل توجہ عمارتیں بطور یادگار چھوڑیں [رک بہ دوین، گنجہ، شداد]؛ ارمنی مآخذ در Lynch: *Armenia*، ۱: ۳۶۳ تا ۳۶۷؛ دیکھیے نیز Barthold، اس کے Lane-Poole کی

Muham. Dynasties کے روسی ترجمے کے ضمیمے میں، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۹ء، ص ۲۹۴؛ Barthold : Aniyskaya 'Pers. nadpis na.....meceti Manuce Esce o slove "celebi" :N. Marr ۵؛ Seriya، شمارہ Zapiski، ۱۹۱۱ء، ۲۰ : ۱۲۰؛ E. D. Ross : Asia Major. on Three Muhammadan Dynasties، ۲/۲(۱۹۲۵ء) : ۲۱۵ .

۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں آذربیجان میں ایک مدّعی حکومت پیدا ہوا جو اسحٰق بن عیسٰی کے نام سے مشہور تھا اور جسے قحطانی (؟) کردوں کے سردار فضل کی تائید و حمایت حاصل تھی ۔ اس کے مقابلے میں اس کے حریف جُستان بن مَرْزُبان مسافری کو هَذْبانیوں کی امداد پر بھروسا تھا ۔ اسحٰق کو بہت جلد ٹھکانے لگا دیا گیا (تجارب، ۲: ۱۷۹)۔ کردوں اور دیلمیوں نے ان لڑائیوں میں بھی خاصا حصہ لیا جو جُستان اور اس کے بھائی ناصر الدّولہ اور ابراهیم بن مَرْزُبان اور اس کے چچا زاد بھائی اسمٰعیل بن وَهْسودان کے درمیان ہوئیں (تجارب، ۲ : ۲۱۹، ۲۲۹؛ الکامل، ۸ : ۴۲۰ تا ۴۲۳) .

۳۴۸ھ/۹۵۹ء کے قریب الجبال میں کردوں کا دوسرا شاهی خاندان ظہور میں آیا (Lane. Poole : Mohamm. Dynasties ، شمارہ ۵۷)، جس کی بنیاد قبیلۂ بَرْزِیکانی (بَرْزِینی) کے شیخ حَسْنُوَیه (حَسنُویه) بن حسن [رک بآں] نے رکھی تھی (دیکھیے نیز شرف نامه، ۱ : ۲۰ تا ۲۳) اور جس نے خراسان پر لشکرکشی کے موقع پر رکن الدّولہ بویہی کی مدد کی تھی ۔ رکن الدّولہ نے کردوں سے بڑی روا داری کا سلوک کیا اور جب کبھی کوئی اس سے ان کی زیادتیوں کی شکایت کرتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ آخر کردوں کو بھی زندہ رهنا ہے (تجارب، ۲ : ۲۸۱) ۔ ابن الأثیر (۸ : ۵۱۹) نے حَسنُویه کے اعلٰی کردار، اس کی دانشمندانہ حکمت عملی اور پاکیزہ اخلاق کی تعریف کی ہے۔ جب ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں حَسنویه نے اپنے دارالحکومت سرماج (بیستون کے جنوب) میں وفات پائی تو عَضُد الدّولہ نے اس کے مقبوضات (هَمَدان، دِیْنَور، نِہاوند) پر قبضہ کر لیا تاکہ انہیں اپنی مملکت میں شامل کر لے، لیکن انجام کار اس نے بَدْر بن حسنَوَیه (۳۶۹ھ/۹۷۹ء تا ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء) [رک بآں] کے نام فرمان مسند نشینی جاری کر دیا ۔ بدر نہ صرف ہمیشہ عَضُد الدّولہ کا وفادار رہا، بلکہ اپنے بھائیوں کے خلاف معرکہ آرا بھی ہوا، کیونکہ وہ باغی فَخرالدّولہ سے جا ملے تھے ۔ خلیفہ نے بدر کو ناصر الدّین والدّولة کا خطاب عطا کیا ۔ مؤرخین نے بدر کی انتہائی تعریف و توصیف کی ہے اس نے اپنے قبیلے میں تعلیم پھیلائی، محصول مقرر کرنے میں عدل و انصاف سے کام لیا اور کسانوں کے حقوق کی حفاظت کی [ابوشجاع] : تجارب، ص ۲۸۷ تا ۲۹۹ ۳۲۷؛ (ابن مُحَسّن) ص ۴۲۹، ۴۴۹ تا ۴۵۴؛ العتبی : کتاب یمینی، مترجمۂ Reynolds، ص ۴۲۴)۔ بدر کا جانشین ظاہر (طاہر ؟) صرف ایک سال تک حکومت کر سکا اور ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء میں شمس الدّولہ بویہی نے اسے نکال باہر کیا ۔ حَسنویه کا چچا وَنْدَاد جو اسی قبیلے کی ایک شاخ عَیْشیة کا رئیس تھا، ۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں فوت ہوا، اس کا بھائی ابو الغَنائم ۳۵۰ھ/۹۶۱ء میں چل بسا ۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے بیٹے ابو سالم دَیْسم کو جو اس هم جَد شاخ کا آخری حکمران تھا، اس کے قلعوں (قَسَان یا قَسْنان [قَسْلان ؟ نزد بابا یادگار، ذُهاب کے کنارے]، غانم آباد وغیرہ) سے محروم کر دیا گیا .

عَضُد الدّولہ کو کئی موقعوں پر کردوں سے سابقہ پڑا، لیکن وہ ان کے ساتھ اپنے باپ رکن الدّولہ کی نسبت کہیں زیادہ متشدّد تھا ۔ ۳۶۸ھ/۹۷۸ء میں ایک کرد ابن بادُوَیه نے ابو تَغْلب الحمدانی کی

مدد سے اَرْدَمُشت (کَواشِی، نزد جبلِ جُودی، یاقوت ۱ : ۹۹) میں خود مختار حکومت قائم کر لی، لیکن کچھ ھی دن بعد وہ عَضُدُ الدّولہ کے بہکانے میں آ گیا ۔ ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں عَضُدُ الدّولہ نے شہرِ زُور کے کردوں کے خلاف ایک فوجی مہم روانہ کی ۔ وہ چاھتا تھا کہ انھیں بنو شَیْبان کے بدویوں سے علٰحدہ کر دے جن سے ان کے تجارتی اور ازدواجی روابط تھے ۔ شہرِ زُور کا قصبہ فتح ھو گیا اور عرب صحرا کو واپس چلے گئے (تجارب، ۲ : ۳۹۸، الکامل، ۸ : ۵۱۶) ۔

ایک اور مہم ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں ھَکّاری کردوں کے خلاف بھیجی گئی اور انھیں محصور کر لیا گیا، انھوں نے اس وعدے پر بھروسا کرتے ھوے ھتیار ڈال دیے کہ ان کی جانوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، لیکن اس مہم کے قائد نے انھیں مَعَلْسایا اور موصل کے درمیان سڑک کے کنارے کنارے پانچ فرسخ تک سولیوں پر چڑھا دیا (الکامل، ۸ : ۵۲۱) ۔

عَضُد الدّولہ کی زندگی ھی میں حُمَیْدی سردار ابو عبداللہ حسین بن دُشَنج (یا ابو شجاع باذ بن دُسْتاک) المعروف بہ باذ بہت کچھ بد نام ھو چکا تھا ۔ ابتدا میں وہ ایک گڈریا تھا، لیکن آھستہ آھستہ اَرْجیش، آمِد اور میّافارِقین کا والی بن بیٹھا ۔ نَصیبین کی ایک شورش کے دوران میں اس کا اور صمصام الدّولہ کا مقابلہ ھوگیا ۔ باذ نے صمصام الدّولہ کی فوجوں کو باجُلائیا (خابُور الحسینیہ کے کنارے ضلع کَواشی = اردَمُشت میں) کے مقام پر شکست دی اور موصل پر قبضہ کر لیا ۔ وہ ابھی یہ منصوبہ بنا ھی رھا تھا کہ بغداد پر چڑھائی کرکے بویہی سلطنت کو ختم کر دے، کہ اتنے میں صمصام الدّولہ کے ھاتھوں اسے شکست ھوئی ۔ وہ میّافارِقین میں ھٹ آیا اور اس کے مقابلے میں بھیجی ھوئی فوج کے سالار سے بات چیت کر کے دیار بکر اور تُرعابِدین کے مغربی حصے کا قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ھوگیا ۔ باذ موصل پر قبضہ کرنے کے خیال سے ابھی دستبردار نہیں ھوا تھا ۔ چنانچہ ۳۷۹ھ/۹۹۰ء میں بَشْنَوی کردوں کی ایک کثیر جماعت جمع کرکے اس نے اس شہر کی فصیلوں کے ساتھ ھی چھاؤنی ڈال دی اور وھاں کے باشندوں سے گفت و شنید میں مصروف ھوگیا، لیکن حَمدانی فرمانرواؤں نے جنھیں حال ھی میں اپنی موروثی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل ھوئی تھی، بنو عُقَیل کے عربوں سے اعانت طلب کی اور حملہ آوروں پر دھاوا بول دیا ۔ باذ ایک ناگھانی حادثے کی وجہ سے سخت مجروح ھوگیا اور بالآخر قتل کر دیا گیا ۔ اس کی لاش سولی پر لٹکائی گئی، لیکن اھل موصل نے اسے حاصل کرکے تمام رسوم کے ساتھ اس کی تجہیز و تکفین کی، کیونکہ وہ کفّار کے خلاف لڑ چکا تھا (الکامل، ۹ : ۲۵، ۲۷، ۳۸، ۴۹؛ [ابو شجاع] : تجارب، ص ۸۳، ۸۴، ۱۷۶ تا ۱۷۸؛ ابوالفرج : مختصر الدول، طبع Pococke، ص ۳۲۱ تا ۳۲۳) ۔

۳۸۰ سے ۳۹۰ء تک صمصام الدّولہ نے اپنی حالت کو زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اس نے فُولاد بن مُنْذِر سے اتحاد کر لیا جسے شیراز میں بھرتی کیے ھوے کرد رسالے کی اعانت حاصل تھی ۔ اس اقدام میں بھی اسے ناکامی ھوئی تو اس نے کردوں سے پناہ کی درخواست کی، لیکن انھوں نے اسے دھوکا دیا اور وہ فخرالدّولہ کے ھاں پناہ گزین ھوگیا جو کردوں سے نفرت کرنے میں نام پیدا کر چکا تھا، ([ابو شجاع] : تجارب، ص ۱۸۴؛ ابن فُولاد کے لیے دیکھیے العُتبی، محل مذکور، ص ۴۲۴، ۴۲۵) ۔

بنو مروان کے کرد خاندان (Lane-Poole، شمارہ ۴۷) کا باذ سے قریبی تعلق تھا ۔ موصل میں

شکست کھانے کے بعد اس کا بھانجا اور حلیف ابوعلی بن مروان بن دُستاک، حِصْن کَیفا [رک بآں] چلا آیا، جہاں باذ کی دَیلمی بیوی رہتی تھی ۔ اس نے اس سے شادی کر لی اور باذ کے مقبوضہ قلعوں میں سے ایک پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے دو بار ابو عبداللہ الحمدانی کو، جس نے باذ کو شکست دی تھی، گرفتار کرلیا، لیکن اس سے فیاضانہ سلوک کیا ۔ ابن مروان نے دیار بکر میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اس کے صلح جویانہ رویے کے باعث وہاں کے باشندے اس کے حامی ہوگئے ۔ بنو مروان نے ۳۸۰ھ/۹۹۰ء سے ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء تک حکومت کی ۔ ان کی قلمرو میں صرف دیاربکر (آمد، اَرْزَن، مَیّافارقین، حِصْن کَیْفا) ہی نہیں بلکہ خِلاط، ملاز گِرد، اَرْجیش اور جھیل وان کے شمال مشرق کا علاقہ بھی شامل تھا ۔ مغرب میں کچھ عرصے تک اُرْفہ بھی ان کے قبضے میں رہا ۔ ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں ابو علی حسن نے شام پر حملہ کیا اور اسے بوزنطی بادشاہ باسل Basil دوم سے چھین لیا ۔ وہ ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں دیار بکر کے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا جنھوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی ۔ اس کا بھائی ابو منصور مُمَہّد الدّولہ جس نے باذ کی وفات پر مَیّافارقین پر قبضہ کر لیا تھا، وہاں ۴۰۲ھ/۱۰۱۱ء تک حکومت کرتا رہا (ابو الفداء: *Annales Moslemici*، طبع *Reiske*، ۲ : ۵۶۹) ۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ابونصراحمد (ابن خَلِّکان، ۱ : ۱۵۷، ۱۵۸) ہوا جس نے ۴۰۲ھ سے ۴۵۳ھ تک حکومت کی ۔ ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں اس نے اُرْفہ فتح کرلیا، لیکن ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں بوزنطیوں نے وہاں پھر اپنی حکومت قائم کر لی (ابو الفرج، ص ۳۴۲) ۔ اگرچہ اس کا میلان طبع عیاشی کی طرف تھا، لیکن اسے ایک عادل، روشن خیال اور قابل حکمران کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی ۔ ۴۴۲ھ/۱۰۵۰ء میں ابو نَصْر کو سلجوق بادشاہ طُغْرِل کے سامنے سر اطاعت خم کرنا پڑا ۔ اس کے بیٹے اور جانشین ابو القاسم نَصْر المعروف بہ نظام الدّولہ (۴۵۳ تا ۴۷۲ھ) کی حکومت میں اس کا بھائی سعید (م ۴۵۷ھ) شریک تھا ۔ اس نے اپنی مملکت میں حرّان، سُوَیْدَا وغیرہ کا اضافہ کیا ۔ اس کا جانشین منصور ابن سعید ہوا جو ۴۷۲ھ سے ۴۸۹ھ تک برائے نام حکومت کرتا رہا، لیکن ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء تک سلجوق سپہ سالار فخرالدّولہ بن جَہِیر اس کے تقریباً تمام علاقوں پر قابض ہو چکا تھا، جنھیں اتابک موصل (ابو الفِداء، ۳ : ۷۷ تا ۷۹، ۸۷، ۱۲۱، ۱۲۵، ۲۴۹) کے ماتحت کر دیا گیا ۔ آل مروان کے بارے میں دیکھیے خصوصی مطالعہ از Amedroz، *JRAS*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۳ تا ۱۵۴ ۔

ترکوں کے حملے سے کچھ دن پہلے ہمیں کردوں کی متعدد مہمات اور کارناموں کا ذکر ملتا ہے ۔ القادر کے عہد (۳۸۱ تا ۴۲۲ھ) میں مؤرخین نے ایک کرد احمد بن الضّحّاک کا یہ کارنامہ بیان کیا ہے کہ اس نے باسل Basil دوم کے سپہ سالار کو ہلاک کر دیا اور اس طرح بوزنطیوں کی پیش قدمی روک دی ۔ ([ابو شجاع]: تجارب، ص ۲۴۷) ۔ ۳۶۶ اور ۳۸۸ھ کے مابین کردوں نے آل بویہ اور آل زِیَار کی باہمی کشمکش میں حصہ لیا جو جُرجان پر قبضہ کرنے کے لیے جاری تھی (العتبی، ص ۲۹۸ تا ۳۰۲؛ ابن اسفندیار، *GMS*، ص ۲۲۶ تا ۲۲۸) ۔ اس کے چند سال بعد ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ محمود غزنوی نے قرہ خانیوں کے خلاف کردوں کو استعمال کیا (العتبی، ص ۳۳۶) ۔

کردوں نے آل بویہ کی خانہ جنگیوں میں اور موصل پر قابض ہونے کے لیے بنو عُقَیل کی جِدّو جہد میں حصہ لیا ۔ ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء میں وہ ان ترک دستوں سے نبرد آزما ہوئے جنھوں نے حمدان

[کذا، همدان؟] میں بغاوت کر دی تھی۔ ۴۱۵ھ سے ۴۲۰ھ تک وہ آل بویہ کے آخری فرمانروا ابو کالیجار کے خلاف فارس اور خوزستان میں لڑتے رہے (الکامل، ۹ : ۱۰۰، ۱۳۴، ۲۲۶، ۲۳۲، ۲۳۹، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۵۴، ۲۶۵؛ [ابن محسن :] تجارب، ص ۳۴۸، ۳۷۶، ۳۸۱)۔ اس طرح جنگوں میں مسلسل حصہ لیتے ہوئے کرد قوم رفتہ رفتہ کمزور ہوتی رہی، یہاں تک کہ ترک عساکر یہاں آ پہنچے، جن کے مقدر میں نسلی اعتبار سے مشرق قریب میں ایک انقلابی تغیر پیدا کرنا تھا۔

ترکوں کی فتوحات : ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں سلاجقہ کے پیشرو غز رے میں پہنچے تو غزنویوں کا ترک سپہ سالار تاش فراش تین ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے نکلا، جن میں کردوں کی بھی ایک جماعت شامل تھی۔ کردوں کے سردار کو غزوں نے گرفتار کر لیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو پیغام بھیجا کہ لڑائی بند کردو۔ اس سے شور و شغب پھیل گیا اور تاش مارا گیا (الکامل، ۹ : ۲۶۸)۔ اسی سال غز ہَرَا پہنچ گئے اور متعدد هذبانی کردوں کو تہ تیغ کردیا۔ کردوں نے آذربیجان کے فرمانروا (وَہْسودان دوم) سے معاهدہ کرلیا اور غز پسپا ہونے پر مجبور ہوگئے۔ غزوں کی ایک دوسری جماعت ارمینیہ پر یورش کرنے کے بعد اُرمیہ اور ابو الہَیْجاء هَذْبانی کے علاقے میں پھر آ دھمکی۔ کردوں نے اس پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی۔ ۴۳۲ھ/۱۰۴۱ء میں آل مسافر کے فرمانروا وَہْسودان دوم بن مَمْلان نے تبریز میں غزوں کی ایک بڑی جماعت کو قتل کردیا۔ اُرمیہ کے غز هکّاری چلے گئے، جو موصل کے ماتحت ایک ریاست تھی اور ملک میں تاخت و تاراج کا بازار گرم کر دیا، لیکن جن دنوں وہ پہاڑوں میں پھنسے ہوئے تھے، کردوں نے ان پر حملہ کر دیا ور ان کے ڈیرہ ہزار آدمی مار ڈالے اور بہت سے قیدی اور بیش بہا مال غنیمت اپنے ساتھ لے گئے (الکامل، ص ۲۷۰ تا ۲۷۲)۔

طُغْرِل بیگ کے دستوں کی آمد پر غز دهشت زدہ ہو کر آگے بڑھتے چلے گئے اور ان کے قائدین انھیں الزَّوزان کے راستے الجزیرہ میں لے گئے۔ غزوں کی ایک جماعت تو منصور بن غز اوغلی کی ماتحتی میں الجزیرہ کے مشرق کی جانب ٹھیر گئی اور دوسری بُوقا کے ماتحت دیار بکر کی طرف بڑھتی گئی۔ اس نے راستے میں قَرْدُو، بازَبْدا، حسینیہ (یاقوت، ۲ : ۲۷۰، موصل اور الجزیرہ کے درمیان ایک قصبہ) اور نیشابور کے اضلاع میں خوب لوٹ مار کی۔ الجزیرہ کے فرمانروا سلیمان بن نصرالدّولہ مروانی نے غزوں کو ترغیب دی کہ وہ شام میں بسے ہوئے غزوں سے جا ملنے کے لیے بہار کے موسم تک انتظار کریں اور اس سے پہلے اس غرض کے لیے اس کی مملکت سے نہ گزریں۔ اس کے بعد اس نے مکر و فریب سے منصور کو گرفتار کر لیا اور فُنَیک کے بَشْنَوی کردوں کی مدد سے غزوں کا پیچھا کیا، لیکن وہ اپنی غارتگری سے باز نہ آئے۔ انھوں نے ضلع دیار بکر کو لوٹا کھسوٹا اور موصل پر قبضہ کر لیا (الکامل، ۹ : ۲۷۲ تا ۲۷۳)۔

اس دوران میں آلِ حَسنویہ پر زوال آ چکا تھا اور جبال کی حکومت ایک نئے خاندان بنو عَنّاز (دیکھیے Sachau : *Ein Verezeichnis Muham. Dynastien*، ص ۱۹؛ شرف نامہ، ۱ : ۲۲ : عَیْیار) کے ہاتھ میں جا چکی تھی، جسے اکثر ابو الشَّوق بھی کہتے ہیں۔ قبل ازیں ۳۴۰ھ/۹۵۱ء میں ہَمَدان میں ترکوں کی ایک بغاوت کے دوران میں معزّ الدّولہ بُویہی کو حُلوان کے شبل ابن ابی الشوق کی خدمات سے فائدہ اٹھانا پڑا تھا (تجارب، ۲ : ۲)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا اصل مؤسّس ابو الفتح محمّد بن عَنّاز (الکامل، ۹ : ۱۵۸) تھا، جس نے ۳۸۰ سے

۱۰۴۰ھ تک حکومت کی ۔ اس کے بیٹے ابو الشّوق نے ۴۰۶ھ میں آل حَسَنویہ کے آخری فرمانروا ظاہر (طاہر) کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ بنو عَنّاز کے مقبوضات میں شَہرزُور، کرمان شاہ (۴۳۱ھ میں قبضہ ہوا، الکامل، ۹ : ۳۰۰، ۳۱۶)، بِیلَوار، صَمْغان دَقُوقَہ، خُفْتِذَکان شامل تھے ۔ ۴۳۷ھ میں طُغرِل نے اپنے بھائی ابراہیم یِنَال [کذا، اینال ؟] کو جبال میں امن و امان قائم کرنے کے لیے بھیجا، جس نے گُرشاسپ بُوَیہی کو ہَمَدان سے نکال باہر کیا اور اس نے جوزْقان کردوں کے ہاں پناہ لی۔ کرمان شاہ میں ابوالشّوق کا ایک حفاظتی دستہ مقیم تھا، جو دیلمیوں اور شاجَنجانی کردوں پر مشتمل تھا ۔ کرمان شاہ فتح ہوگیا اور ابو الشّوق نے ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء میں سیرْوان میں وفات پائی ۔ ابراہیم نے صَمیرْان (شَمران ؟ صَیْمَرہ ؟) پر قبضہ کرکے جوزقان کو زیر کر لیا ۔ سعدی بن ابو الشّوق نے سلاجقہ کی اطاعت قبول کر لی ۔ اس خاندان کی حکومت ۵۲۰ھ/ ۱۱۱۶ء تک قائم رہی (منجّم باشی، حوالہ در Sachau، محل مذکور) ۔

مَلازْگرد میں شنہشاہ رومانوس Romanus چہارم کو شکست ہوئی (۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) اور سارے ارمینیہ پر آلپ آرْسلان کا قبضہ ہوگیا ۔ سلاجقہ کے عظیم خاندان کے دوران حکومت میں شَبانکارہ [رَک بآں] کا شورش پسند خاندان فارس میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس خاندان کی کیفیت احوال کا پتا ۴۲۱ سے ۷۵۶ھ تک چلایا جا سکتا ہے، لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ یہ خاندان واقعی کرد تھا یا نہیں (دیکھیے اوپر) ۔ دوسری جانب کردوں کے چھوٹے چھوٹے خاندان بڑی بیدردی سے مٹا دیے گئے اور ان کی جگہ ترکوں کو آباد کر دیا گیا ۔ ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء میں آخری مروانی فرمانروا خلاط کے علاقے میں سے نکل گیا اور وہاں ایک ترک سُقمان قُطبی نے خاندانِ شاہ ارمن کی بنیاد رکھی ۔ یہ خاندان ایک صدی تک، یعنی آل ایّوب کی آمد تک حکومت کرتا رہا ۔ ۴۹۵ھ/۱۱۰۱ء کے ذیل میں ابن الأثیر (۱۰ : ۲۳۸) نے سَلْغُور قَرَہ بُولی کے ترکمانوں کے ہاتھوں بنو عَنّاز کی ایک شاخ سَرخاب بن بدر کے دو ہزار کردوں کے مارے جانے کا ذکر کیا ہے ۔ آگے چل کر دوسرے ترکمانوں نے شَہْرزُور، دَقُوقہ اور خُفْتِذکان کے سوا سَرخاب کا سارا علاقہ لے لیا ۔ ان کچل دینے والی ضربوں کے باوجود گیارھویں اور بارھویں صدی میں کردوں کا ذکر اکثر آتا ہے ۔ ملک شاہ نے قاورد، حاکم کرمان، کے خلاف لڑائی کے دوران میں کرد اور عرب فوجوں سے کام لیا اور اس کے صلے میں انھیں بعد ازاں کرمان میں جاگیریں عطا کیں (الکامل، ۱۰ : ۵۳)، جہاں کردوں کی آبادیاں پہلے سے موجود تھیں (دیکھیے المسعودی : التنبیہ، ص ۸۸؛ ابن خَلّکان، ۱ : ۵۱۶) ۔ ۴۹۶، ۴۹۸ اور ۵۰۳ھ میں کردوں نے دُجَیل، ماردین، وغیرہ پر یلغاریں کیں ۔ ۵۰۴ھ/۱۱۱۰ء میں محمّد بن ملک شاہ کی شام پر لشکر کشی میں احْمدایل بن وَھْسودان، حاکم مَراغہ، جو قبیلۂ رَوّادی کا کرد تھا (دیکھیے الکامل، ۱۰ : ۳۹۱) اور سُقْمان، شاہ ارمینیہ، نے حصہ لیا ۔ اس لشکر کشی کا نتیجہ ناکامی رہا اور کردوں کو ترکوں [کے قلعے] سُقْمان کا محاصرہ کرنے کا موقع مل گیا (*Recueil des Hist. des Croisades Docum Orientaux*، ۳ : ۵۴۲، ۵۹۹) ۔

اس زمانے میں ہمیں شام میں کردوں کا ذکر اکثر ملتا ہے؛ یہیں ان کا فرنگیوں سے سابقہ پڑا تھا (دیکھیے Derenbourg : اُسامہ بن مُنْقِذ) ۔ سنجر کے عہد میں جبال کے مغربی حصے کو صوبۂ کردستان بنا دیا گیا اور سنجر کا بھتیجا سلیمان یہاں کا والی مقرر ہوا ۔ اس نے بَہار (ہَمَدان کے شمال مشرق میں) کو اپنا صدر مقام بنایا ۔ صوبے میں